واقعۂ کربلا

اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

الفرقان بکڈپو ۳۱ - نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ - انڈیا

مروت
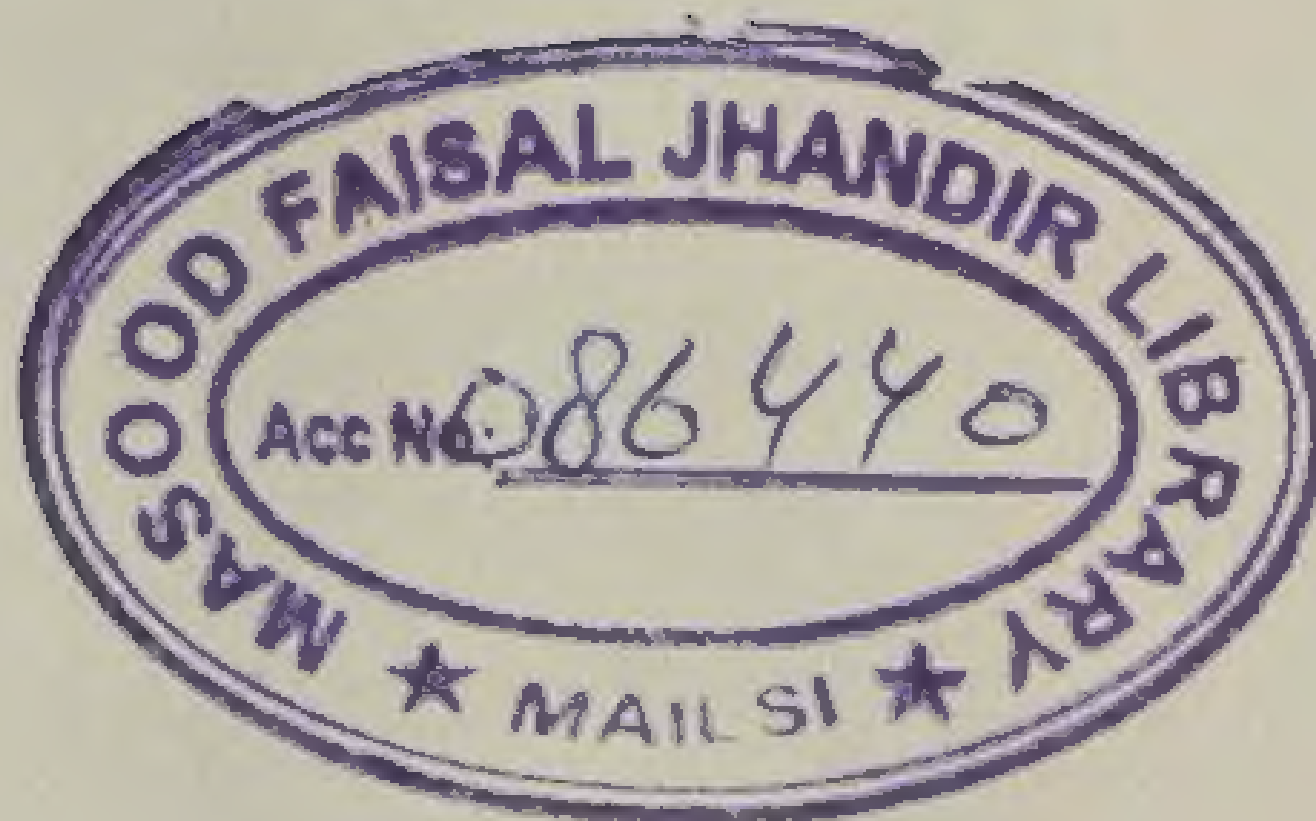
انتساب

والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے نام۔ جن کے فیضِ قلب ونظر کے لئے میری ساری زندگی ممنون ہے۔ اور اسی فیض کا اثر میری نظر میں یہ کتاب بھی ہے۔ ورنہ یہ طویل محنت طلب کام اب میرے خواب وخیال کا بھی نہ تھا۔ مدّ اللہ علینا ظلّہٗ۔

کتابیات

وہ کتابیں جن کا کوئی حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے

(الف)

۱- القرآن

۲- الاصابہ فی تمییز الصحابہ (عربی) از ابن حجر عسقلانی

۳- اسپرٹ آف اسلام (انگریزی) از جسٹس امیر علی

(ب)

۴- البدایہ والنہایہ (عربی) از حافظ ابن کثیر دمشقی

(ت)

۵- تاریخ طبری (〃) از ابو جعفر ابن جریر طبری

۶- تاریخ کامل (〃) از ابن اثیر

۷- تقریب التہذیب (〃) از ابن حجر عسقلانی

(ج)

۸- جامع ترمذی (〃) از امام ترمذی

(ح)

۹- حیاۃ الامام الحسینؑ (〃) از باقر شریف قرشی

۱۰- حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق (اردو) مولانا محمد تقی عثمانی

(خ)

۱۱- خلافت و ملوکیت (اردو) سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱۲- خلافت معاویہ و یزید (〃) محمود احمد عباسی

(د)

۱۳- روح اسلام (اردو ترجمہ اسپرٹ آف اسلام) از محمد ہادی حسن

(س)

۱۴- سنن ابو داؤد (عربی) از امام ابو داؤد سجستانی

۱۵- سیر اعلام النبلاء (〃) علامہ ذہبی

۱۶- سیر الصحابہ (اردو) شاہ معین الدین ندوی

(ش)

۱۷- شرح نہج البلاغہ (عربی) از ابن حدید

۱۸- شہید انسانیت (اردو) سید العلماء علی نقی صاحب قبلہ

(ص)

۱۹- صحیح بخاری (عربی) از امام بخاری

(ع)

۲۰- العواصم والقواصم (عربی) از ابو بکر بن عربی

(ف)

۲۱- فتح الباری (شرح بخاری) (عربی) از ابن حجر عسقلانی

(ل)

۲۲- لسان المیزان (〃) 〃 〃

(م)

۲۳- المعارف (〃) از ابن قتیبہ

۲۴- مقدمہ ابن خلدون (〃) از ابن خلدون

۲۵- مصنف عبدالرزاق (〃) از ابوبکر بن عبدالرزاق

۲۶- مروج الذہب (〃) از المسعودی

۲۷- منہاج السنہ (〃) از ابن تیمیہ

۲۸- میزان الاعتدال (〃) از علامہ ذہبی

۲۹- مشکوٰۃ المصابیح (〃) از خطیب تبریزی

۳۰- مقتل الحسین (〃) عبدالرزاق الموسوی المقرم

۳۱- معجم البلدان (〃) از احمد بن یعقوب

۳۲- نہج البلاغہ (〃) شریف الرضی

فہرست

"واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر"

باب یازدہم [11]
شہادت کے بعد کی کہانیاں — ۲۲۷

باب دوازدہم [12]
وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا — ۲۴۱

ابتدائیہ

از والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ

[یہ کتاب، جیسا کہ آئندہ صفحات میں مقدمہ سے معلوم ہوگا، راقم مصنف کے والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی کی خواہش کا نتیجہ ہے، کتاب مکمل ہو جانے پر راقم نے گزارش کی کہ اگر مناسب خیال فرمایا جائے تو چند دعائیہ کلمات املاء فرما دیئے جائیں جن سے کتاب کا آغاز ہو، ذیل کی املائی تحریر میری اسی خواہش کا نتیجہ ہے ــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی]

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ۔ حمداً وسلاماً

اس عاجز (محمد منظور نعمانی) کا وطن سنبھل (مراد آباد، یوپی) ہے۔ ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) سنہ پیدائش ہے۔ سنبھل مسلمانوں کی غالب اکثریت کی بستی ہے۔ اور یہ سب سنی حنفی ہیں۔ صرف ایک محلے میں جو شہر کے کسی کنارے پر ہے اور جسے میں نے آج تک دیکھا بھی نہیں ہے شیعہ صاحبان کی بھی کچھ آبادی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں کم و بیش سبھی جگہ سُنّیوں کے اندر بھی تعزیہ داری کا رواج سرایت کئے ہوئے ہے لیکن میرا خیال ہے۔ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے ــ کہ سنبھل کے سُنّیوں میں جس شان سے عزاداری منائی جاتی ہے اس شان کی عزاء داری شاید ہی کہیں اور ہوتی ہو۔

بچپن کی باتیں

مجھے ۶-۷ سال کی عمر سے پورا شعور ہو گیا تھا۔ اور اُن چند برسوں کو چھوڑ کر جو

تعلیم کے سلسلے میں باہر گزرے قریباً تیس سال کی عمر تک زیادہ تر قیام وطن ہی میں رہا۔ ہمارا محلہ خالص سُنی مسلمانوں کا محلہ ہے۔ اس کے اندر ۲۰-۲۵ گھروں میں تعزیے رکھے جاتے تھے، جن پر محرم کی پہلی سے دسویں تک برابر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ جن گھروں میں بچے کم زندہ رہتے تھے اُن گھروں میں بچوں کو امام حسینؓ کا فقیر بنا دیا جاتا تھا اور ہرے کپڑے پہنائے جاتے تھے، ہمارا ننہال اس معاملے میں بہت آگے تھا۔ ایک قریبی رشتے کے ماموں فقرو کے نام سے مشہور تھے۔ میں بڑا ہو کر بھی ایک مدت تک یہ سمجھتا رہا کہ ان کا نام اصل میں فخر الدین یا فخر الحسن ہو گا اور فقرو کہا جانے لگا، بعد میں معلوم ہوا کہ اصل نام تو انوار حسین ہے لیکن بچپن میں امام حسینؓ کے فقیر بنا دیئے گئے تھے اسی سے فقرو کہے جاتے ہیں۔

سنبھل کے ڈھول

سنبھل کی تعزیہ داری کی دو خصوصیتیں شاید اپنا جواب نہ رکھتی ہوں گی، ایک تعزیوں کی اونچائی (بعض تو قریباً چالیس فٹ اونچے ہوتے تھے) اور دوسرے ڈھولوں کا سائز۔ بعض ڈھول تو اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ان کے لیئے گائے یا بھینس کی بہت بڑی کھال تلاش کرنا پڑتی تھی، اُن میں سے بعض کے اندر سے آدمی کھڑا نکل آتا تھا اور بچے تو تقریباً سبھی ڈھولوں کے اندر سے اسی طرح نکل جاتے تھے۔ ہمارے خاص محلہ میں ایسے کئی ڈھول تھے مگر ایک ڈھول جو چوک کا ڈھول کہلاتا تھا وہ ان میں سب سے بڑا تھا اور چونکہ ہمارے نانا کا مکان چوک میں واقع تھا اس لیے اس کو ہم اپنا ڈھول سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

عشرۂ محرم کے معمولات

محرم کا مہینہ آیا اور ہر ذی استطاعت گھر میں لازم ہو گیا کہ پہلی سے دسویں تک روزانہ کوئی میٹھی چیز پکے۔ عموماً میٹھے چاول یا حلوہ یا مالیدہ۔ اور مغرب کی نماز سے کچھ پہلے یا بعد میں گھر کا کوئی

آدمی گھر کے دروازے پر وہ میٹھا پکوان لے کر کھڑا ہوتا اور بچوں میں تقسیم کرتا۔ روزمرہ کے اس دس روزہ عمل سے چند ہی گھر محلے میں مستثنیٰ ہوں گے، انھیں میں سے ایک ہمارا گھر بھی تھا۔ ہمارے گھر جو کچھ ہوتا تھا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

محلے کا ایک گھرانہ رافضیوں کا گھرانہ ہی کہلاتا تھا۔ اگرچہ تھے وہ "سُنّی"۔ ان کے یہاں ایک امام باڑہ تھا، جس میں ایک کاٹھ کا تعزیہ رہتا تھا، ان کے یہاں اِن دس دنوں میں رات کو مجلس ہوتی تھی، اختتام مجلس پر حاضرین کو قیمہ رکھی ہوئی ایک (یا دو) تندوری روٹی بطور تبرک ملتی تھی۔ دسوں دن برابر یہ سلسلہ چلتا تھا — اس دس روزہ مجلس کے علاوہ کم از کم ایک دن تو اس طرح کی مجلس اکثر گھروں میں ہی ہوا کرتی تھی، خود ہمارے گھر میں بھی یہ مجلس ۹ اور ۱۰ کی درمیانی شب (یعنی شبِ شہادت) میں ہوتی تھی۔

ہمارے گھر کی مجلس

والد ماجد مرحوم تعزیہ داری کے سلسلے کی چیزوں میں تو شرکت نہیں کرتے تھے بلکہ ایک حد تک اسے صحیح بھی نہیں سمجھتے تھے، مگر ۹ محرم کو شب کی مجلس بڑے اہتمام سے کراتے تھے جیسے کہ ۱۱ یا ۱۲ ربیع الاول کو مجلسِ میلاد شریف اہتمام سے ہوتی تھی۔ میلاد میں تو مٹھائی (جلیبی یا لڈو) گھر ہی پر حلوائی بلوا کر بنوائی جاتی تھی، بازار سے اس موقع کے لئے مٹھائی خریدنا والد ماجد پسند نہیں فرماتے تھے۔ اور مجلس شہادت کے لئے ایک بکرا خود خرید کر لاتے تھے اور اس کا پلاؤ پکوایا جاتا تھا جو اہلِ مجلس میں تبرکاً تقسیم ہوتا۔ اسی ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے یہاں بکرے کے گوشت کا رواج شادیوں تک میں بھی نہ تھا، عام طور سے گائے کا گوشت ہی استعمال ہوتا تھا لیکن مجلس شہادت کے لئے ہمارے گھر یہ خصوصی اہتمام برتا جاتا تھا — ایام عزا کی یہ مجلسیں ہمارے حقیقی ماموں حافظ سعید احمد مرحوم (اپنی پارٹی کے ساتھ) پڑھا کرتے تھے۔ ان مجلسوں کا ایک شعر اب تک یوں یاد ہے کہ —

خدا کے نور سے پیدا ہوئے یہ پنجتن محمد و علی و فاطمہ حسین و حسن

کچھ اپنا رونا رُلانا

جیسا کہ اوپر عرض کر آیا ہوں، مجھے ۶، ۷ سال کی عمر میں پورا شعور آگیا تھا، مجلسوں میں جو کچھ سنتا تھا اُسے سمجھتا تھا، واقعۂ شہادت کو سُن کر خوب رویا کرتا تھا۔ بلکہ اتنی دلچسپی اس واقعے سے ہو گئی تھی کہ عشرۂ محرم کے علاوہ بھی جو اِس دلچسپی کا خاص موسم ہوتا ہے میں نانا کے گھر جاتا اور جس کتاب سے ماموں صاحب شہادت کے واقعات پڑھا کرتے تھے اُس کتاب کو لے کر پڑھتا، اور روتا جاتا تھا۔ یہ بات ۸-۹ سال کی عمر کی ہے۔

جہاں تک یاد کرتا ہوں میرا حال یہ تھا کہ حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ وغیرہ اصحاب کرام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، دنیا کی اور اسلام کی سب سے بڑی شخصیت بس حضرت حسینؓ کو سمجھتا تھا۔ اور سب سے بڑا خبیث یزید کو جانتا تھا، اس سلسلے کا ایک لطیفہ بھی ہے۔ غالباً عمر کا آٹھواں سال تھا جبکہ میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ رہا تھا۔ پندرھویں پارے میں سورۂ بنی اسرائیل کی جب وہ آیت آئی جس میں "وَلَا یَزِیْدُ الظَّالِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا" آتا ہے تو میں نے دل میں سوچا کہ اوہو! یزید ایسا خبیث تھا کہ اللہ میاں نے اس کو ظالمین — یعنی بہت بڑا ظالم — کہا ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ اس پر دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ حضرت حسین کی شہادت کا واقعہ تو بہت بعد کا ہے، قرآن مجید میں اس کا ذکر کیسے آگیا؟ اور پھر اس کا جواب بھی دل میں یہ آگیا کہ اللہ میاں تو سب کچھ جانتے ہیں، انھیں خبر تھی کہ یزید اتنا بڑا ظالم ہوگا اس لئے انھوں نے مسلمانوں کو پہلے ہی سے خبردار کر دیا۔

تبدیلی کا آغاز

میرے ایک قریبی رشتے کے نانا حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے اور صاحب درس تھے۔ میری عمر جب ۱۴-۱۵ سال ہوئی تو تعلیم کے سلسلے میں مجھے ان کے سپرد کر دیا گیا۔ اور پھر تین سال تک جہاں وہ اپنی تدریسی ذمہ داری کے سلسلے میں

رہے میں اُن کے ساتھ ہی رہا۔ یہ پہلی صحبت تھی جس کی بدولت مجھے دین کی کچھ سمجھ آئی۔ اور جو باتیں ماحول کے اثر سے خواہ مخواہ دین بن کر ذہن میں جم گئی تھیں اُن کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی۔ اُس کے بعد تعلیم کی تکمیل کے لئے دو سال دارالعلوم دیوبند میں رہنا نصیب ہوا۔ الحمدللہ کہ میری تعلیم کے اس پانچ سالہ دور میں والد ماجد کے خیالات میں بہت کافی تبدیلی آگئی۔ اب ہمارے گھر میں رسمی مجلسِ میلاد کی جگہ بیانِ سیرتِ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس ہوتی تھی۔ اور عاشورہ کی مجلس میں شہادت ناموں کے بجائے ہمارے بڑے بھائی مولوی محمد حسن صاحب مرحوم تاریخ ابن خلدون کے اردو ترجمے[1] سے واقعۂ کربلا کا بیان پڑھتے اور میں کچھ زبانی بیان کیا کرتا تھا ___ لیکن واقعہ کے سلسلے میں تصور وہی تھا جو سنی سنائی باتوں سے قائم ہوگیا تھا۔ کبھی خود براہِ راست تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرکے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ قصے کی واقعی حقیقت کیا تھی۔

شہرتِ عام کی تاثیر

۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں بریلی میں قیام اختیار کرکے الفرقان جاری کیا، الفرقان کے ربیع الاول کے شمارہ میں اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ لکھا جاتا اور اس کے لیے میں سیرت اور حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا ___ لیکن واقعۂ کربلا کے سلسلے میں جہاں تک یاد ہے میرا سب سے بڑا ماخذ بس مولانا آزاد کا مضمون شہیدِ کربلا تھا جو الہلال کے زمانہ میں میرے پاس موجود تھا۔ اس سے زیادہ تاریخی مطالعہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ یا یوں کہیے کہ شہرتِ عام کے اثر سے جو ذہن اس مسئلے میں بن گیا تھا اُس نے یہ ضرورت

---

[1] میری یادداشت کے مطابق مترجم الہ آباد کے کوئی صاحب تھے۔ اور انھوں نے لکھا تھا کہ اس میں واقعۂ کربلا کے بیان میں اصل کتاب (تاریخ ابن خلدون) کے اندر چند صفحات خالی چھوٹے ہوئے تھے اور ترجمے میں واقعہ کا بیان بہت طویل تھا۔ مترجم نے دوسری کتابوں کی مدد سے پُر کر دیا ہے۔ اب بعد کی تحقیق (ترجمہ) نے نفسِ مطلب اور ترجمہ دونوں کو دیکھ کر پتا لگایا ہے کہ ابن خلدون نے صفحے خالی چھوڑے تھے جن کی کمی کو مترجم نے دو صفحے لکھ کر پورا کیا ہے۔ مترجم کا نام حکیم احمد حسین الہ آبادی مرحوم ہے۔

محسوس ہی نہ ہونے دی اور واقعہ یہ ہے کہ شہرت عام ایسی ہی طاقتور چیز ہے خواہ وہ کسی کے حق میں ہو یا کسی کے خلاف۔

اس کی ایک بہت قریبی مثال شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدی (متوفی ۱۲۰۶ھ) اور ان کی جماعت کے بارے میں بہت سے نہایت قابل احترام اکابر علماء حق کا رویہ ہے۔ اُن میں سرِفہرست ہیں مکہ مکرمہ کے مشہور عالم و محدث اور مفتی شیخ احمد زینی دحلانؒ۔ نیز خود ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ـــــ شرک و بدعت کے خلاف شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے بے لاگ موحدانہ جہاد نے (نیز سیاسی میدان میں آلِ سعود کے لئے ان کی حمایت نے) مخالفانہ پروپیگنڈہ کا وہ طوفان اٹھایا کہ ہر بُری سے بُری بات ان کے حق میں لائق یقین بن گئی ـــــ اس کی تفصیل کے لیے اس عاجز کی کتاب "شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علماء حق پر اس کے اثرات" دیکھی جاسکتی ہے ـــــ اِس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ شیخ احمد زینی دحلان نے اپنی کتاب "خلاصۃ الکلام" اور "الدرر السنیۃ فی ردّ الوہابیۃ" میں ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کی ہیں جن کی بنیاد پر ان کو یہود و نصاریٰ وغیرہ کافروں سے بھی بدتر درجہ کا، کافر قرار دینا صحیح اور برحق ہوگا۔ اور اسی طرح کی باتیں ہمارے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے رسالہ "رجوم المذنبین" میں تحریر فرمائی تھیں لیکن بعد میں حضرت مدنیؒ نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ اعتراف فرمایا کہ انھوں نے "رجوم المذنبین" میں جو کچھ اس سلسلہ میں لکھا تھا وہ عام شہرت ہی کی بنیاد پر لکھا تھا۔

الفرقان ۱۳۷۰ھ کا مضمون

بہرحال واقعۂ کربلا کے سلسلے میں اپنا وہی پرانا ذہن چلتا رہا جو اس عام اور روایتی تصور سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا جس کا کچھ ذکر اوپر کی سطروں میں آیا ہے۔ حتیٰ کہ

شوال یا ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ کی بات ہے کہ میں کسی لمبے سفر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا جبکہ اُجَین (مدھیہ پردیش) کے ایک صاحب کا خط آیا جو الفرقان کے بہت قدر داں تھے، انھوں نے لکھا تھا کہ محرم کا مہینہ آنے والا ہے۔ اس میں اُلٹے سیدھے شہادت نامے پڑھے جاتے ہیں اور غلط سلط روایتیں دہرائی جاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ الفرقان میں اس موضوع پر کوئی مستند قسم کا مضمون آجائے۔ اور ہم کوشش کریں کہ ہمارے یہاں مجلسوں میں وہی پڑھا جانے لگے۔ میں یہ ذمہ داری مولوی عتیق الرحمٰن کے سپرد کر کے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا تھا، مولوی عتیق نے "واقعۂ کربلا" کے عنوان سے یہ مضمون لکھا اور ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ کے الفرقان میں شائع ہو گیا۔ میں سفر سے واپس آیا اور یہ مضمون پڑھا تو اُس کی دو باتوں کی وجہ سے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ غصے سے میرا دماغ کھول اٹھا، ان باتوں میں سے ایک یہ تھی کہ سیدنا حسین رضؓ کے اقدامات کے لیے بغاوت کا لفظ اس مضمون میں استعمال کیا گیا تھا — دوسری بات مضمون کا یہ بیان تھا کہ جب حضرت حسین رضؓ کوفہ کے قریب پہنچ کر اس حقیقت سے آگاہ ہوئے کہ کوفہ والے غداری کر گئے ہیں۔ اور پھر یزیدی لشکر کے پہنچ جانے سے آپ کے لیے واپسی کا راستہ بھی نہ رہا تو یزیدی سپہ سالار عمر ابن سعد کے سامنے آپ نے تین شکلیں رکھی تھیں کہ ان میں سے کسی کو قبول کر لیا جائے جن میں سے ایک یہ تھی کہ "انھیں یزید کے پاس جانے دیا جائے تاکہ وہ براہ راست اُس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیں"۔

میں یزید کو جتنا بڑا ظالم، خبیث اور ناہنجار ساری عمر سے جانتا آرہا تھا اُس کی بنا پر میرے نزدیک یہ ناممکن بات تھی کہ حضرت حسین رضؓ ایسی پیش کش فرمائیں، حضرت حسین رضؓ کے لئے یہ بات سوچنی بھی میرے لیے محال تھی۔ میں غصہ میں اٹھا اور مولوی عتیق کے گھر کی طرف کو روانہ ہوا تاکہ اُن سے باز پرس کروں کہ یہ کیا لکھ دیا ہے؟

تو قدم کے قریب چلا ہوں گا کہ لفظ بغاوت کے بارے میں ذہن میں یہ بات آئی

کہ بغاوت ہر جگہ تو معیوب نہیں ہے۔ بلکہ اگر ایک ظالمانہ اور کافرانہ نظام کے خلاف ہو تو ایک طرح کا جہاد ہے۔ آخر ۱۸۵۷ء میں ہمارے بزرگوں نے انگریزوں کے خلاف جو کچھ کیا تھا وہ بغاوت ہی تو تھی جس پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں ___ البتہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی بات ویسی ہی ناقابلِ قبول بنی رہی ہیں اسی حال میں مولوی عتیق کے گھر پہنچا اور بڑے غصّے کے ساتھ اُن سے پوچھا کہ تم نے یہ بات کیسے اور کہاں سے لکھ دی؟ ___ مولوی عتیق کے پاس اس طرح کے غصّے کے کچھ خطوط پہلے ہی آچکے تھے اور وہ اس سلسلے میں ایک دوسرے مضمون کی تیاری کر چکے تھے۔ اُس کے لئے انھوں نے تاریخ کی متعدد کتابوں سے عبارتیں اور حوالے نقل کر کے رکھے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے بھی ماننا پڑ گیا کہ پھر تو غلط نہیں لکھا ہے۔

یہ کتاب

اس واقعہ پر تقریباً تیس سال گزر گئے تھے کہ آج سے ۷-۸ سال پہلے جب میری کتاب "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" شائع ہوئی تو بعض مخلص دوستوں نے توجہ دلائی کہ جس مقصد سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اسی مقصد کی خدمت کے لیے یہ بھی مفید ہوگا کہ مولوی عتیق الرحمٰن صاحب کا مضمون واقعۂ کربلا اور اس کے بعد کا وضاحتی مضمون بابت محرم ۱۳۷۹ھ بھی کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ میں نے اس رائے کو پسند کیا اور ۱۹۸۷ء میں جب مولوی عتیق الرحمٰن کا ہندوستان آنا ہوا تو میں نے اُن سے کہا کہ وہ پرانی فائل سے اپنے وہ دونوں مضمون نکلوا کر ایک نظر ڈال لیں اور کتب خانہ الفرقان کے حوالہ کر دیں۔ مگر اُن کی رائے یہ ہوئی کہ اس مسئلے پر تو اب بالکل از سرِ نو لکھا جانا چاہیئے۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اس کی اساس تو وہی ۱۳۷۹ھ اور ۱۳۸۰ھ کے مضامین ہیں لیکن عزیز مصنّف نے اس پر نظرِ ثانی میں جو نئی محنت کی ہے اُس نے اسے ایک بالکل نئی چیز بنا دیا ہے۔ کتاب کے مشتملات میں سے مجھے خاص طور پر اس کے آخری

باب میں آنے والے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے اقتباس کی بابت یہ عرض کرنا ہے کہ اس اقتباس نے خود مجھے بڑا اہم فائدہ پہنچایا ہے۔ حضرت مسلم ابن عقیلؓ کی شہادت کی خبر پانے پر واپسی کے ارادے کے بعد بھی صرف بعض برادران مسلم بن عقیل کی دلداری میں حضرت حسینؓ کے سفر جاری رکھنے پر مجھے ایک خلش تھی۔ اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام کو اور اس کتاب کے عزیز مصنف کو جزائے خیر دے کہ شیخ الاسلام کے اس اقتباس میں اس خلش کے رفع ہونے کا سامان مل گیا ___ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنے بندوں کے لیے نافع بنائے اور اگر اس میں کوئی بات غلط آگئی ہو تو اس کے اثر سے بندوں کی حفاظت فرمائے۔ نیز عزیز مصنف کو اس سے رجوع کی توفیق بخشے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔
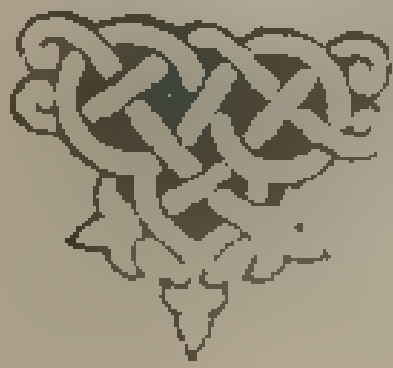
بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقدمہ

مصحفیؔ ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

۲۷ برس پہلے کی بات ہے۔ الفرقان کی ترتیب وادارت کی نئی نئی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ ایک ایجنسی کی فرمائش آئی کہ محرم کا مہینہ قریب آرہا ہے۔ سانحۂ کربلا کے سلسلے میں غلط سلط روایات والے شہادت نامے مسلمانوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ الفرقان میں اگر ایک مستند مضمون کربلا کے واقعہ پر آجائے تو مفید ہو۔ یہ فرمائش غالباً مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے حضرت والد ماجد (مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ) کے نام آئی تھی۔ مجھے حکم ہوا کہ لکھو۔

والد ماجد کے کتب خانے ہی میں ایسی کتابوں کی جستجو شروع کی جن کی مدد سے یہ فرمائش پوری کی جاسکے۔ ایک مصری مصنف کی کتاب ہاتھ آئی جو بڑی قابلِ اعتماد اور قابلِ استفادہ محسوس ہوئی۔ (نام نہ اب کتاب کا یاد ہے نہ مصنف کا) اس کتاب کی روشنی میں "واقعۂ کربلا" کے عنوان سے ایک مضمون تیار کرکے ذی الحجہ ۷۳ھ کے الفرقان میں دیدیا۔

مضمون میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ واقعات کا سادہ سا بیان تھا۔ اور اس معاملے میں جو فکری اور علمی بے اعتدالیاں شیعیت کے اثر سے یا اس کے ردِّ عمل سے پیدا ہوگئی ہیں۔ اُن کے سلسلے میں نقطۂ اعتدال واضح کرنے کی کوشش تھی۔ مگر دو باتوں کی

وجہ سے یہ مضمون کچھ "معرکہ انگیز" قسم کا ہوگیا۔ ان دو میں سے ایک بات یہ تھی کہ یزید کے خلاف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کیلئے "بغاوت" کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ دوسری یہ تھی کہ کربلا میں حضرت حسین نے یزیدی سپہ سالار عمر بن سعد کو جن تین باتوں کی پیش کش کی تھی اُن باتوں کے بیان میں وہ روایت درج کردی گئی جس میں دوسرے نمبر کی پیش کش بتائی تھی کہ "آپ دمشق جاکر یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کو بھی تیار تھے"۔

اس سلسلے میں بہت سے حضرات کے خطوط آئے تو آئندہ اشاعت میں اِن دونوں نکات پر کچھ وضاحت اور تفصیل کے لئے مکرر لکھا گیا۔ جو بالعموم اطمینان اور تشفی کا باعث ہوا۔ اور یہ حقیقت تسلیم کی گئی کہ نہ "بغاوت" کا لفظ کوئی نامناسب لفظ تھا۔ اور نہ پیش کش کے بیان میں کوئی غلط بیانی یا بے احتیاطی۔ بلکہ ایک حقیقت جو شیعی اثرات کے ماتحت مستور چل رہی تھی، وہ سامنے آگئی۔ اور پورے مسئلے پر ایک نئے غور و فکر کا دروازہ کھل گیا[1]۔ یہ دونوں مضمون مل کر ایک اچھے خاصے رسالے کی شکل میں آسکتے تھے، مگر اس کام کی کبھی توفیق ہی نہ ہوئی کہ اپنے ایسے مضامین جو الفرقان میں نکلے تھے، انھیں کوئی کتابی شکل دی جائے۔

نومبر ۱۹۸۶ء میں لندن سے جہاں ۱۹۷۰ء سے اقامت اختیار کی گئی ہے، یہاں آنا ہوا تو والد صاحب نے فرمایا کہ تمہارا مضمون "واقعۂ کربلا" کتابی شکل میں چھپ جانا چاہیے، اس پر کچھ نظر ثانی کرنی ہو تو کرکے مکتبہ الفرقان کے سپرد کردو۔ مضمون نکال کر نظر ثانی کی تو محسوس ہوا کہ نئے سرے سے لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اپنے علم و خیالات دونوں ۲۲ برس پہلے کے مقابلے میں بہت بدل چکے ہیں۔ اور یہ کام اُس وقت ممکن نہ تھا۔ دماغ ایک عرصے سے بالکل تیار نہیں رہا تھا، کسی تحقیقی عمل کے لئے ذہن نہ تھا۔ چنانچہ والد صاحب سے یہی عرض کردیا۔ مگر اُن کا تقاضہ دیکھ کر ارادہ کیا تھا کہ جب بھی ممکن ہوگا یہ کام کردیا جائے گا۔

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ [illegible]
سے شیعیت نے جو فائدہ اٹھایا [illegible]

گزشتہ سال (سنہ ۵۹ء میں) جبکہ میرے دماغ کی وہ کیفیت رفع ہو چکی تھی۔ والد ماجد کے ضعف و اضمحلال کی خبریں سن کر لکھنؤ کے سفر کا خیال پیدا ہوا تو اپنا وہ ارادہ بھی یاد آیا اور اس مضمون کی نئے سرے سے تسوید کیلئے اصل ماخذ تاریخ طبری وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا، اور اس مطالعہ نے اُس نتیجے پر پہنچایا جس کا اظہار سرنامہ کے شعر میں ہوا ہے کہ اس مضمون کا جو مقصد تھا وہ اس پر کسی "نظرِ ثانی" اور "تبدیل و ترمیم" کے عمل سے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کیلئے تاریخ کے اس حصے کے مکمل پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہے جو حصہ واقعۂ کربلا اور اسکے پس منظر والے واقعات کی روایتوں پر مشتمل ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں اسی عمل سے گزر کے واقعات کی اصلیت تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تاریخی روایتوں کا حال اور اس کی مثال

میں نہ تاریخ کا طالب العلم رہا نہ کسی اور حیثیت سے تاریخ دانی کا دعویٰ۔ بالکل ممکن ہے کہ میں نے اس مطالعے میں جو کچھ محسوس کیا اور جو نتائج نکالے وہ اہلِ فن کی نگاہ میں قابلِ اتفاق نہ ہوں۔ مگر میرا احساس بالکل اس نوعیت کا احساس ہے جیسے کسی بدیہی چیز کا احساس ہوتا ہے اور اس نوعیت کے احساسات کو آدمی نہ رد کر سکتا ہے نہ خواہ مخواہ شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔

میرا احساس یہ ہے کہ ہماری تاریخ کا ایسا نازک حصہ جس قدر احتیاط اور جس قدر احساسِ ذمہ داری کے ساتھ قلمبند کئے جانے کی ضرورت تھی اسی قدر بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری یہاں کارفرما نظر آتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:-

طبری ج ۶ ص ۲۳۳ پر ایک روایت بتاتی ہے کہ حضرت حسینؓ کربلا میں اُترے تو وہ جمعرات کا دن اور محرم سنہ ۶۱ھ کی دوسری تاریخ تھی۔ پھر ص ۲۳۷ پر ایک روایت آتی ہے کہ جمعرات کا دن اور محرم کی ۹ تاریخ تھی کہ مخالف لشکر کے سالار عمر بن سعد، عبید اللہ ابن زیاد کے ایک فوری حکم کے ماتحت، عصر کے بعد اپنے کیمپ سے اُٹھ کر حضرت حسینؓ پر چڑھائی

کرنے کیلئے پہنچ گئے۔ مگر پھر مفاہمت ہو گئی۔ اور آئندہ صبح تک کیلئے کارروائی روک دی گئی، ظاہر بات ہے کہ اسکے بعد آئندہ صبح جو آئے گی تو وہ جمعہ کی صبح ہو گی جب ۲ محرم کو بھی جمعرات بنائی گئی۔ پھر ۹ محرم کو بھی جمعرات ہی بنائی گئی تو ۱۰ محرم کو سوائے جمعہ کے اور کوئی دن نہیں ہو سکتا۔ مگر آگے صفحہ ۲۴۰ پر دوسری صبح کو عمر بن سعد کی کارروائی (یعنی اپنے لشکر کو حرکت میں لانے) کا بیان آتا ہے تو ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ:۔

قال فلما صلّی عمر بن سعد	راوی کہتا ہے پھر جب ہفتے کو عمر بن سعد
الغداة یوم السبت وقد بلغنا	نے فجر کی نماز پڑھ لی ــــ اور ہمیں یہ بھی
ایضاً انہٗ کان یوم الجمعۃ وکان	روایت ملی ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا۔
ذالک الیوم یوم عاشوراء	اور وہ دن عاشوراء (۱۰ محرم) کا تھا۔
خرج فیمن معہ من الناس۔	تو ابن سعد اپنے لوگوں کو لے کر نکلا۔

فرمایئے کہ صفحہ ۲۳۲ اور صفحہ ۲۳۷ والی روایتوں کے پس منظر میں جن میں ۲ تاریخ کو جمعرات کا دن اور پھر ۹ تاریخ کو جمعرات کا دن بتایا گیا ہے، کوئی تُک اس طور پر صفحہ ۲۴۰ کی اس روایت کو لینے کی ہے جس میں ۱۰ تاریخ کو ہفتے کا دن بتایا گیا ہے؟

ہمیں نہیں معلوم کہ "وقد بلغنا ایضاً" (اور ہمیں یہ بھی روایت ملی ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا) یہ الفاظ طبری کے ہیں، یا راوی کے۔ اگر راوی کے ہیں اور طبری نے کچھ کہا ہی نہیں تب تو کہنا ہی کیا؟ اور اگر راوی کے نہیں طبری کے ہیں، تب بھی ایک مؤرخ کی ذمہ داری کے لحاظ سے اس انداز کلام کو کوئی ذمہ دارانہ انداز نہیں کہا جا سکتا جس سے ۱۰ محرم کو جمعہ کا دن ایک مشکوک دن بن جاتا ہے۔ حالانکہ گزشتہ بیانات کی رو سے وہ قطعی ہے، کہنے کی بات یہ تھی کہ "یہ دن ہفتے کا نہیں جمعہ کا ہونا چاہیئے۔ اور اگر ہفتہ ہی ثابت ہے تو پھر اگلے دونوں بیانات غلط ہیں"۔

طبری کا اپنا اعتراف

یہ مثال سامنے لا کر ہم طبری کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے ہیں کہ اگر ان کی زندگی میں کہی جاتی تو شاید وہ کوئی صفائی دے سکتے۔ اُن کا خود اپنا اعتراف ہے کہ اُن کے قاری کو ایسی روایات مل سکتی ہیں جو کسی طرح صحیح نہ ہو سکتی ہوں، جو کسی طرح سمجھ میں نہ آسکتی ہوں۔ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :-

"میں نے اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اُس میں میرا اعتماد اپنی اطلاعات اور راویوں کے بیانات پر رہا ہے نہ کہ عقل و فکر کے نتائج پر کسی قاری کو اگر میری جمع کردہ خبروں اور روایتوں میں کوئی چیز ایسی دیکھے ناقابلِ فہم اور ناقابلِ قبول نظر آئے کہ نہ اس کی کوئی تک بیٹھتی ہے نہ کوئی معنیٰ بنتے ہیں تو اُسے جاننا چاہئے کہ ہم نے یہ سب اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے بلکہ اگلوں سے جو بات ہمیں جس طرح پہنچی ہے ہم نے اسی طرح نقل کر دی ہے۔" (جلد اول ص۵)

پھر کونسی بات بعید ہے

مؤرّخ کا دامن جب اتنا وسیع ہو کہ اتنی موٹی اور دور سے نظر آنے والی ابجومگی کے ساتھ بھی، جیسی کہ مذکورہ بالا مثال میں پائی جاتی ہے۔ ایک روایت کو اسکے یہاں بے چون وچرا جگہ مل سکتی ہے۔ تو پھر راویوں کی کونسی غلطی، مبالغہ آرائی یا غلط بیانی رہ جاتی ہے جس کی توقع ہمیں اپنے ان مؤرخین کی کتابوں میں نہیں کرنی چاہئے؟ خاص کر کربلا کے جیسے واقعات میں کہ جن سے جذبات متعلق ہوتے ہیں۔ تعصّبات متعلق ہوتے ہیں اور مثبت و منفی (POSITIVE & NIGATIVE) مفادات بھی

متعلق ہو جاتے ہیں۔[1]

چنانچہ اس واقعے (واقعۂ کربلا) اور اسکے پس منظر کے واقعات کے سلسلے میں جہاں بظاہر صحیح اور قابل قبول روایات موجود ہیں، وہیں نہایت منکر اور ناقابلِ قبول روایات کا بھی ڈھیر لگ گیا ہے۔ اور فی الواقع یہ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ کسی روایت کو صحیح مانتے ہوئے بھی یہ ڈر لگتا ہے کہ گو عقلاً صحیح نظر آتی ہے مگر ہو سکتا ہے کہ واقعہ میں یہ بھی صحیح نہ ہو۔ روایات کی اس صورت حال کا اندازہ آپ کو آگے بڑھ کر کتاب میں ہو گا۔ خاص کر کربلا کے میدان والی روایات میں۔ اور اسی لئے ہم نے اگرچہ کچھ روایات کو عقل، عادت، حالات و ماحول اور دوسرے قابلِ لحاظ پہلوؤں کی روشنی میں، قابلِ قبول اور کچھ کو ناقابل قبول ٹھیرایا ہے۔ کچھ کو ترجیح دی ہے اور کچھ کو رد کر دیا ہے، مگر جس کو صحیح ٹھیرایا اور جس کو ترجیح دی اُس کو بھی فی الواقع اور سو فی صد صحیح کہنے کی ذمہ داری ہم نہیں اُٹھا سکتے۔ جھوٹ اور سچ اور من گھڑت روایات کی وہ آمیزش نظر آتی ہے کہ اللہ کی پناہ۔

کربلا کے واقعے میں غلط بیانی کے اسباب

اور اُس کی وجہ وہی ہے کہ کربلا کا سانحہ (چاہے جس شکل میں ہوا ہو) اوّل تو بجائے خود بہت جذبات انگیز ہے۔ اور پھر اس کے پیچھے سیاسی صف آرائی کی ایک لمبی (کم از کم ۲۵ سالہ) تاریخ ہے جو ناگزیر طور پر دو طرفہ تعصّبات کو بھی جنم دے چکی ہے اور مفادات میں دلچسپی رکھنے والے حلقے بھی بنا چکی ہے۔ مزید، کوفیوں کی جس بے وفائی اور غدّاری نے یہ سانحہ کرایا اس کا بھی

---

[1] تاریخ تو پھر تاریخ ہے کہ جس میں بہت سی گنجائشیں مان گئی ہیں طبری کی تو تفسیر میں بھی اسی درجہ کی عجوبہ داستانیں ایسے معاملات تک میں پائی جاتی ہیں جن میں ادنیٰ تساہل کی گنجائش نہیں مانی جا سکتی، سورۂ النجم کی تلاوت کے دوران میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان پر معاذ اللہ مشرکین کے بتوں کی تعریف و توثیق میں "تلك الغرانیق العُلیٰ" والے شیطانی کلمات جاری ہونے کی روایت کئی کئی سندوں سے بلا کسی نقد و نظر کے اس تفسیر میں دی گئی ہے۔

تقاضہ ہے کہ (قبائلی رقابتوں کے ماتحت) ایک دوسرے کو الزام دینے اور اپنے آپ کو اندر سے باوفا دکھانے والی روایتیں گھڑی جائیں، خاص کر جبکہ واقعہ کے چند سال بعد ہی یزید کی وفات سے حالات نے ایک دم پلٹا کھایا تھا۔ اور ان سب باتوں سے اوپر بہت سے راویوں اور مقتل نگاروں کا وہ شیعی جذبہ، جو اگر اس نہایت قیمتی موقع کو ایا نداری کی نذر کر دیتا اور شیعیت کے مفاد کے لئے حسب ضرورت اور حسب استطاعت رنگ آمیزی اور روایت آفرینی کی خدمت انجام نہ دیتا تو یہ ایک غیر فطری بات ہوتی۔ غرض ان مختلف قسم کے محرکات و عوامل نے مل کر واقعۂ کربلا اور اس کے پس منظر سے تعلق رکھنے والے واقعات کے بیان میں وہ غضب ڈھایا ہے کہ حقیقت کی بازیافت مشکل بن گئی۔ نہایت بے لاگ طریقے سے روایتوں کا تجزیہ کیا جائے تبھی ممکن ہے کہ صداقت تک رسائی ہو سکے۔

کام مشکل بھی اور ضروری بھی

اس قصے میں صداقت تک رسائی اور اس کا اظہار کسقدر مشکل (یعنی پرخطر) کام ہے، اس کا اندازہ کسی اور کو ہو یا نہ ہو، اس راقم کو تو اُس وقت سے ہے جب اس موضوع پر ۲۷ سال پہلے والے مضمون میں بغیر یہ جانے ہوئے کہ کسی پوشیدہ صداقت کا اظہار ہوا جا رہا ہے، وہ روایت نقل کر دی گئی جس کے مطابق حضرت حسینؓ نے یہ آمادگی ظاہر کی تھی کہ :-

(و اما) ان اَضَعَ یدی فی ید یزید	(اور یا) میں یزید کے ہاتھ میں اپنا
بن معاویۃ فیریٰ فیما بینی	ہاتھ دیدوں پھر وہ جو مناسب سمجھے
وبینہ رأیہ۔[1]	فیصلہ کرے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اس بیان کی بنا پر یہ مضمون بڑا ہنگامہ خیز ہو گیا۔ اور آئندہ ماہ کے

---

[1] تاریخ طبری ج ۶ صد ۲۳۵۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ صد ۱۷۰ میں "فیریٰ فیما بینی وبینہ رأیہ" کی جگہ "فیحکم فی ما رأیٰ" کے الفاظ ہیں جو زیادہ صحیح ہیں۔

الفرقان میں جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے سے یہ بیان مدلل کر دیا گیا تب بات قابو میں آئی۔ لیکن وہ بھی صرف سچے علم دوست اور صداقت پسند لوگوں کی حد تک۔ باقی جن لوگوں کے لئے یہ شاعری جزو ایمان بن چکی تھی کہ۔ ع

سر داد و نداد دست در دست یزید

وہ اپنے بے دلیل ایمان پر اس کے بعد بھی قائم اور سرگرداں رہے۔

ایک ناگزیر ضمنی بحث

اگرچہ یہ موقع کسی بحث اور تفصیل کا نہیں ہے تاہم اس اندیشے کے پیش نظر کہ آج کی اِن سطروں کو پڑھ کر بھی ایسے تمام حضرات کو گرانی لاحق ہو، اسقدر بات یہاں کہدینا مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور فیصلہ اُس پر چھوڑنے کی بات طبری، ابن اثیر اور البدایہ والنہایہ وغیرہ سب کے صفحات میں اسقدر روشن حقیقت ہے کہ جو لوگ اس کے بیان پر ناراض ہوتے ہیں وہ سچائی سے ناخوش ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ طبری نے اس واقعہ کے سلسلے کی سب سے پہلی روایت یہ دی ہے کہ حضرت حسینؓ نے عمر بن سعد سے ملاقات کی اور کہا کہ دونوں لشکروں کو یہیں کربلا کے میدان میں چھوڑ کر ہم تم دونوں یزید کے پاس چلیں۔ مگر عمر بن سعد نے اس کو قبول کرنے سے عذر کیا، اس کے بعد طبری میں دوسری روایت اِن الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔

قال ابو مخنف واما ما حدثنا به	ابو مخنف نے کہا: لیکن مجالد بن سعید
مجالد بن سعید والصقعب بن	اور صقعب بن زہیر وغیرہ محدثین کا
زهیر الازدی وغیرهما من	قول وہ ہے جو محدثین کی جماعت کا قول
المحدثین فهو ما علیه جماعة	ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ نے کہا
المحدثین قالوا انه قال اختاروا	تھا کہ میری تین باتیں قبول کرلو یا میں

منّي خصالاً ثلاثاً إمّا أن ارجع الى	اس جگہ کو لوٹ جاؤں جہاں سے
المكان الّذي اقبلت منه وإمّا أن	آیا ہوں۔ یا یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ
اضع يدي في يد يزيد بن معاوية	دیدوں پھر وہ میرے اور اپنے
فيرى فيما بيني وبينه رأيه	معاملے میں جو سمجھے فیصلہ کرے، اور یا تم
وامّا ان تسيّروني الى ثغر من	مجھے مسلمانوں کی کسی سرحدی مقام پر
ثغور المسلمين شئتم فاكون	جہاں بھی تم چاہو پہنچا دو، وہاں میں
رجلاً من اهله لي ما لهم وعليّ	وہیں کا ایک آدمی ہو کر رہوں گا جیسے
ما عليهم۔[1]	وہ سب ویسا میں۔

سب سے پہلی روایت بھی طبری نے ابو مخنف ہی سے لی تھی۔ اور وہ ابو مخنف نے ایک فرد واحد ہانی بن ثبیت کے بیان کے طور پر دی تھی، بعد ازاں یہ دوسری روایت دی جس پر وہ محدثین کا اتفاق بتاتا ہے۔ اس کے بعد اسی ابو مخنف کی ایک تیسری روایت طبری میں آتی ہے، جو حضرت حسینؓ کے قافلے کے ایک باقیماندہ فرد اور خاندانی غلام عُقبہ بن سمعان کا بیان ہے کہ میں اوّل سے آخر تک آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے کہیں کوئی اُس طرح کی بات نہیں فرمائی جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ:۔

دعوني فلأذهب في هذه الارض	مجھے چھوڑ دو کہ کہیں بھی اس لمبی چوڑی
العريضة حتّى ننظر ما يصير امر	زمین میں نکل جاؤں حتیٰ کہ یہ بات واضح
الناس۔ (ص ۲۳۵)	ہو کر سامنے آجائے کہ لوگ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

و پھر چوتھی روایت اسی ابو مخنف سے (دوسری روایت کی تکمیل کے طور پر) ہے کہ عمر بن سعد سے آپ کی ملاقات (جو معاملے کے سلجھاؤ کیلئے آپ نے شروع کی تھی) تین یا چار بار ہوئی، اور اسکے نتیجے میں عمر نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ اللہ کا شکر ہے معاملات سدھرنے کی صورت نکل آئی

---
[1] ج ٦ ص ۲۳۵

ہے اور حسینؓ نے پیش کش کی ہے کہ :۔

ان یرجع الی المکان الذی منه اتیٰ او ان نسیرہ الی ثغر من ثغور المسلمین شئنا فیکون رجلاً من المسلمین له ما لهم وعلیه ما علیهم او ان یأتی یزید امیر المؤمنین فیضع یدہ فی یدہ فیریٰ فیما بینه وبینه رأیه۔	یا تو وہ اسی جگہ کو لوٹ جائیں جہاں سے آئے تھے یا ہم اُن کو مسلمانوں کے جس کسی سرحدی مقام پر چاہیں بھیجدیں اور وہاں وہ ایک عام مسلمان کی طرح رہیں گے، اور یا پھر وہ امیر المؤمنین یزید کے پاس چلے جائیں اور اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیدیں۔ پھر وہ ان کے اور اپنے معاملے میں جو مناسب سمجھیں کریں۔

عُقبہ بن سمعان کا بیان اگر اس معاملے میں مان لیا جاتا تو اس سے قضیہ کی ایک بڑی گتھی حل ہو سکتی تھی۔ جو عُقبہ کے بیان کے برخلاف یہ دوسرا بیان ماننے سے پیدا ہوتی ہے کہ حضرت حسینؓ نے تین باتوں کی پیش کش کی تھی جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس بیان کو ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ابن زیاد کو کیا مصیبت آئی تھی کہ اپنے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مطالبہ کر کے بے ضرورت قتال کی صورت پیدا کی؟ تاریخ کی روایات میں اس کا صرف ایک جواب ملتا ہے کہ شمر بن ذی الجوشن نے چڑھا دیا (طبری ص ۲۳٦) مگر یہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے۔ ابن زیاد کوئی ایسا ہلکا اور سطحی آدمی تو نظر نہیں آتا جو ایسی حماقت کسی کے چڑھانے سے کر لے۔ خاص طور سے جب کہ اسی روایت کا یہ بیان بھی سامنے رکھا جائے کہ عمر بن سعد کے اس خط پر ابن زیاد کا اپنا ردّ عمل نہایت مسرت اور قبولیت کا تھا۔ بہرحال راقم سطور کی نظر میں اس گتھی کا کوئی معقول اور تشفی بخش حل نہیں ہے۔ البتہ عقبہ بن سمعان کا بیان مان لیا جائے تو پھر سرے سے کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قتال کی بات بالکل سمجھ میں آتی ہے۔ اور ابن زیاد

کیلئے یہ کہنے کا موقع ہوتا ہے کہ "اچھا اب وہ ہاتھ میں آ کر ہمارے ہاتھ سے نکل جانا چاہتے ہیں؟"
لیکن اس سہ گانہ پیش کش والی روایت کا پلڑا اتنا بھاری ہے اور اتنے شواہد اس کے حق میں
پائے جاتے ہیں کہ چار و ناچار اسی کو ماننا پڑتا ہے اور عقبہ بن سمعان کی شہادت کے بارے
میں وہ کہنا پڑتا ہے جو جسٹس امیر علی مرحوم نے (اپنی شیعیت کے باوجود مگر معقول پسندی کی
بنا پر) کہا ہے کہ "عقبہ کا یہ انکار شاید اس بنا پر تھا کہ سہ گانہ پیش کش والی روایت میں انکو
حضرت حسینؓ کی توہین نظر آتی تھی"۔ (اسپرٹ آف اسلام مطبوعہ ۱۹۷۸ء دہلی ص۱-۳۰)

اس روایت کے وزن کی سب سے پہلی بات تو ابومخنف کا یہ بیان ہی ہے کہ
"جماعتِ محدثین کا اس پر اتفاق ہے"۔ دوسرے یہ کہ ابومخنف اور طبری دونوں عقبہ بن
سمعان کی بات نقل کرنے کے بعد آگے چوتھی روایت پانچویں روایت اور چھٹی روایت میں
مسلسل وہ باتیں بیان کرتے جو سہ گانہ پیش کش کے نتیجے میں پیش آتی چلی گئیں گویا ابن سمعان
کی بات کو ناقابلِ اعتنا قرار دیدیتے ہیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ ان تاریخ کے واقعات
میں حضرت حسینؓ کے ساتھیوں کی زبان پر ابن سعد اور اس کے ساتھیوں کو خطاب کرتے
ہوئے بار بار یہ بات ملتی ہے کہ:۔

أَفَمَا تَقْبَلُونَ واحدۃً من الخصال التی عرض علیکم رضیً؟	کیا حضرت کی پیش کی ہوئی باتوں میں سے کوئی ایک بھی تم کو قبول نہیں؟

طبری ج ۶ کے صرف ۲ صفحوں ص ۲۴۴۔ اور ۲۴۵ میں تین جگہ یہ بات آتی ہے اور اس کے
بعد بھی آتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی گنجائش ہی نہیں کہ اس روایت کو نہ مانا جائے۔

اصل بات جو کہنا تھی

یہ تمہید بات اگرچہ بہت طویل ہو گئی۔ ورنہ اصل بات یہ کہنی چاہی تھی کہ اس قصے
میں عمل تحقیقت اور تصحیح واقعات کی بات کتنی مشکل اور اس سے زیادہ اُس کا نتیجہ کتنا

اس لئے کہ اس میں لوگوں کو یا حضرت حسینؓ کی (معاذ اللہ) توہین نظر آتی ہے اور یا یزید وابن زیاد کی طرفداری لیکن ہے یہ ایک ضروری کام۔ اس لئے کہ یہ "توہین" نظر آنا اور "طرفداری" نظر آنا، یہ دونوں باتیں ہم سب کی نظروں میں (اِلّا ماشاء اللہ) شیعیّت کا رنگ آجانے کا نتیجہ ہے۔ اور یہ رنگ کوئی اچھا رنگ نہیں ہے۔ واقعۂ کربلا سے اور جو کچھ ہوا یا نہ ہوا ہو، شیعیّت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا وہ بے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور اسی لئے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سنّی معاشرے پر شیعیت کے اثرات

میں اور کسی کا کیا کہوں، اپنے والد ماجد کا (اللہ اُن کا سایۂ مبارک دراز فرمائے) ایک اعتراف اور ایک بیان نقل کرتا ہوں۔

ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ کے الفرقان میں میرا مضمون واقعۂ کربلا شائع ہوا تو والد ماجد لکھنؤ سے باہر کہیں سفر میں تھے۔ میری عادت یہ رہی تھی کہ جو کچھ بھی لکھتا بالعموم اُن کو دکھا کر ہی الفرقان میں دیتا تھا۔ مگر یہ مضمون اُن کی حالتِ سفر کی وجہ سے نہیں دکھایا جاسکا تھا۔ واپس آکر پڑھا تو میرے یہاں تشریف لائے۔ بقول خود بہت غصے میں گھر سے نکلے تھے کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کو "بغاوت" سے تعبیر کر دیا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ 'یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دیدینے (یعنی بیعت یا سپردگی منظور کر لینے) کی لغویات نہ جانے کہاں سے لکھدی! لفظ 'بغاوت' کی خلش کے بارے میں تو خود ہی فرمایا کہ وہ آتے آتے راستے ہی میں دور ہوگئی کہ یہ ہمارے فقہاء کے یہاں بُرا لفظ تھا لیکن آج کل کا ہندوستانی تو اس لفظ کو اپنے یہاں کے آج کے استعمال کے مطابق لے گا۔ اور آج کے ستعمال میں، خصوصاً تحریک آزادئ ہند کے پس منظر میں تو یہ لفظ ایک پسندیدہ اور فخر سے بولا جانے والا لفظ ہے نہ کہ کوئی مکروہ و مذموم

لفظ لیکن دوسری خلش باقی رہی اور وہ اس وقت دور ہوئی، جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے میں نے پیش کئے جو ایک دوسرا وضاحتی مضمون لکھنے کے لئے جمع کئے گئے تھے۔

یہ بات تو آج سے ۲۷ برس پہلے ہوئی۔ زیر نظر کتاب کا وہ باب جب تیار ہوا اور والد ماجد نے سنا جو "حضرت مغیرہ بن شعبہ اور یزید کی ولی عہدی" کے متعلق ہے تو بیان فرمایا کہ ہمارے بچپن میں عشرۂ محرم میں ہمارے گھر مجلس ہوتی تھی، ہمارے بڑے بھائی صاحب "تاریخ ابن خلدون" سے حضرت حسینؓ کی شہادت کا بیان سناتے تھے، جس میں حضرت مغیرہؓ کا ذکر بھی آتا تھا، تو بعض بڑے بوڑھوں کا اُن کے متعلق یہ کہنا یاد ہے کہ "ہاں شیرے کی بوند تو مغیرہ ہی نے لگائی تھی"، یعنی فساد کا بیج تو انہوں نے ہی بویا تھا[1]۔ ایک صحابی (اور وہ بھی صاحبِ فضائل و مناقب صحابی) کے متعلق کس بے تکلفی سے کتنی بڑی بات کہدی جاتی تھی! —— اور یہ ہمارے وطن سنبھل کے پرانے بڑے بوڑھوں ہی میں نہیں کہدی جاتی تھی، جن کے پاس کوئی خاص علم نہ تھا اور جن کے زمانے تک اس موضوع پر کوئی بڑا اصلاحی کام ہندوستان میں نہ ہوا تھا۔ بلکہ ہمارے زمانے کے ایسے اہل علم تک جن کے متعلق اس طرح کے کسی تبصرے کا خیال بھی اُن کے علمی اور تنقیدی مذاق کی بنا پر نہیں کیا جانا چاہئے تھا۔ اُن کے قلم سے ہم جیسے بھی "شیعیت" ٹپکتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ یزید کی ولی عہدی کے تذکرے میں اُس فضول سی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے جو کہتی ہے کہ حضرت مغیرہ نے اپنی گورنری بچانے کیلئے یزید کی ولی عہدی کا خواب حضرت معاویہؓ کو دکھایا جو اُن کیلئے اتنا خوش کن تھا کہ حضرت مغیرہ سے لی جانے والی گورنری بحال کر دی[2]۔ کس طنزیہ انداز میں لکھا گیا ہے کہ:۔

---

[1] یہ ایک قصے کی طرف اشارہ ہے کہ شیطان نے ایک حلوائی کی دکان پر جہاں بھٹی پر کڑھاؤ چڑھی ہوئی تھی شیرے کی ایک بوند ٹپکا دی۔ اس پر ایک مکھی آگئی۔ مکھی کو اپنا لقمہ بنانے کے لئے چھپکلی دوڑی، اس کو شکار کرنے کے لئے بلی جھپٹی، بلی پر ایک کتے نے حملہ کر دیا۔ کتے [illegible] لڑائی کے نتیجہ میں بھٹی پر چڑھی کڑھائی اس طرح الٹی کہ حلوائی بہت بری طرح جل گیا۔ یہ دیکھ کر حلوائی [illegible] وہ ختم ہو گیا۔ [illegible] بھی لاٹھی لے کر آگیا، پھر کیا تھا دونوں میں جنگ شروع ہو گئی جس کے نتیجہ میں دونوں شدید زخمی ہوئے —— یہ سارا خون خرابہ شیطان کی لگائی ہوئی شیرے کی ایک بوند کے نتیجہ میں ہوا۔

[2] زیر نظر کتاب میں ایک پورا باب اس روایت پر آپ کو ملے گا۔

"یزید کی ولی عہدی کے لئے ابتدائی تجویز کسی صحیح جذبے سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کیلئے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا[1]۔"

حضورؐ کی قرابت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی قرابت بے شک قابل لحاظ اور واجب الاحترام شئی ہے۔ وہ آدمی بد نصیب ہے جو آپؐ کی قرابتوں کا لحاظ اور احترام نہ کر سکے لیکن لحاظ و احترام الگ چیز ہے۔ اور معصومین محض کا درجہ کسی کو دینا الگ چیز ہے شیعیت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت فاطمہ، حضرت علی اور حضرات حسن و حسین (رضی اللہ عنہم) کو بھی عصمت کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ نتیجے میں ان محترم حضرات سے کسی خطا اور بھول چوک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جبکہ ان سے اختلاف کی صورت میں اختلاف کرنے والا لازماً ہی خطاکار و گنہگار قرار پائے گا۔

ہم اہل سنت بطور عقیدہ یہ بات نہیں مانتے مگر بہت تھوڑے لوگ ہیں کہ جن کا ہمارا عمل اسی ذہنی رویے کی شہادت دیتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے سے حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے تک کے معاملات میں بعض دوسری اعتقادی قسم کی رکاوٹیں ہمیں اس رویے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتیں لیکن اس دور کے ختم ہوتے ہی جو نیا دور شروع ہوتا ہے تو ہمارے اس رویے کے اظہار کا دور بھی شروع ہو جاتا ہے حضرت علیؓ و حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی کہانی میں ہم ذرا بھی انصاف پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے، انصاف کے بجائے حضرت معاویہؓ کو بس کچھ رعایت ہم شکل دیتے ہیں۔ اگر ہم سچ مچ انصاف پر آمادہ ہو سکتے تو اس قضیے کی صورت ہماری نظروں میں آج بہت کچھ

---

[1] خلافت و ملوکیت۔ از سید ابو الاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۵۰

مختلف ہوں، ہم اپنے اس رویّے کو کتاب وسنّت پر مبنی کچھ اعتقادات سے مربوط کرتے ہیں مگر واقعہ میں اس کا ربط اُن شیعی اثرات سے ہے جن سے اہلِ سنت کا کوئی طبقہ بھی بمشکل بچ سکا ہے۔

بے انصافی کی ایک مثال

بے انصافی کی صرف ایک مثال لیجئے ـــــ اس لئے کہ یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں نکل سکتی ـــ کہ جن تاریخی کتابوں سے ہم حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ پر "سبّ وشتم" کی روایتیں پاتے ہیں اُنھیں کتابوں کی شہادت یہ ہے کہ:۔

وکان علی اذا صلی الغداۃ	اور (واقعہ تحکیم کے بعد) علی جب فجر
یقنت فیقول: اللهم العن	کی نماز پڑھتے تو قنوت پڑھتے اور کہتے کہ
معاویۃ وعمرًا وابا الاعور و	اے اللہ لعنت کر معاویہ پر، عمرو پر
حبیبًا وعبد الرحمٰن بن خالد	ابو الاعور پر، حبیب پر، عبد الرحمٰن بن
والضحاک بن قیس والولید	خالد (بن ولید) پر ضحاک بن قیس پر
فبلغ ذالک معاویۃ فکان	اور ولید پر۔ پس یہ بات جب معاویہ
اذا قنت لعن علیًا وابن عباس	کو معلوم ہوئی تو وہ بھی جب قنوت
والحسن والحسین والاشتر۔[1]	کرتے تو علی، ابن عباس، حسن، حسین
	اور اشتر پر لعنت کرتے۔

لیکن اس صاف وصریح بیان کے باوجود ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ معاویہ اور اُن کے ساتھی حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کرتے تھے[2]، یہ نتیجہ حضرت علی کے اُس احترام کا

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۔۔ [2] دیکھیں یہ نوٹ رہیے کہ طبری کی روایت میں جیسا کہ نقل کیا گیا، دونوں جگہ لعنت کا لفظ ہے لیکن ابن اثیر نے اپنی کتاب میں دوسری جگہ یعنی حضرت معاویہ کے بارے سبّ کے لفظ سے بدل دیا ہے جس کا ترجمہ ہم سبّ وشتم کرتے ہیں۔

نہیں ہے جواز روئے کتاب وسنت ہم پر واجب ہے۔ کیونکہ کتاب وسنت بے انصافی نہیں سکھاتی۔ بلکہ اس "احترام" کا نتیجہ ہے جو شیعیت والے عقیدۂ معصومیت سے لازم آتا ہے۔ اہلِ سنت کے اصل مذہب کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اگر یہ روایت حضرت علیؓ کے حق میں قابلِ یقین یا قابلِ بیان نہیں تھی تو ایسا ہی حضرت معاویہ کے حق میں بھی سمجھ جاتا۔

حضرت علی کے مقابلے میں جیسے کچھ بھی تھے حضرت معاویہ بہر حال ایک صحابی تھے۔ اس لئے ہم اپنے علم کلام کے ماتحت مجبور ہوتے ہیں کہ اُن کے ساتھ کچھ رعایت برتیں لیکن جب اُن کے بیٹے یزید کا دور آتا ہے تو اسکے اور حضرت حسین بن علیؓ کے معاملے میں ہم میں اور شیعوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لئے کہ یزید کو ایسا کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا جیسا اُس کے والد حضرت معاویہ کو حاصل تھا۔ شیعوں نے "مثلاً" کہا کہ وہ فاسق و فاجر تھا۔ اور کسی طرح اس لائق نہ تھا کہ تختِ خلافت پر اس کو جگہ ملتی تو یہ بات چونکہ حضرت حسینؓ کی حمایت میں کہی گئی تھی۔ اس لئے بالکل باآسانی ہم نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔ پھر بعض کو خیال آیا کہ اس سے تو حضرت معاویہ پر بڑا الزام آتا ہے۔ تب یوں کر دیا گیا کہ حضرت معاویہ کی زندگی میں تو وہ ایسا نہیں تھا۔ لیکن بعد میں ہوا۔ حد ہے کہ ابن خلدون جیسا آدمی جس نے یزید کی ولی عہدی کی زبردست وکالت اپنے مقدمۂ تاریخ میں کی ہے وہ بھی ذرا سا آگے چل کر جب یزید اور حضرت حسینؓ کے قضیے پر آتا ہے تو ٹھیک یہی بات کہنی شروع کر دیتا ہے یعنی یہ کہ وہ فاسق و فاجر ہو گیا تھا کب ہو گیا تھا؟ اور کب اس بات کا پتہ چلا؟ تاریخ تو کوئی سی بھی اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ہر جگہ ایک ہی بیان ہے کہ جیسے ہی مدینہ کے گورنر نے حضرت حسینؓ کو یہ اطلاع دی کہ حضرت معاویہ انتقال فر گئے اور اُن کے ولی عہد یزید بن معاویہ آپ سے بیعت چاہتے ہیں، ویسے ہی حضرت حسینؓ نے مدینہ چھوڑ دینے کا ارادہ فرمالیا۔ وہ آنے والی رات میں مع تمام خاندان کے مکے کی راہ لے لی۔ سکے بعد جب اسکی اطلاع شیعانِ عراق کو پہنچی تو وہ بھی اپنے مشاورتی جلسے کر کے عازم مکہ

ہوئے۔ اور صرف سوا مہینے کی مدت میں یہ مرحلہ آگیا کہ عراق میں حالات کی جانچ پڑتال اور عزیز کی پیشگی تیاریوں کے لئے مسلم بن عقیل کوفے کو روانہ کر دیئے گئے۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ یزید نے تختِ خلافت بعد میں سنبھالا والد کے انتقال کی خبر پاتے ہی فسق و فجور کا وہ عالم برپا کیا کہ حضرت معاویہ کے انتقال کی خبر سے پہلے یزید کے فسق و فجور کی خبریں پھیل گئیں؟ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ اس بات کیلئے سوا مہینہ بالکل ناکافی تھا، کم از کم ایک سال تو گزرتا "بیچاری مے" کی طرح فسق و فجور مفت میں بدنام ہوا ہے[1]۔

لکیر کی فقیری یا طلبِ علم و تحقیق؟

اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب ابن خلدون جیسے آدمی نے بھی یہی لکھ دیا تو پھر ثبوت ہو یا نہ ہو، سمجھ میں آئے نہ آئے، نہ ماننے کی کیا گنجائش ہے؟ یہ وہ طریقہ اور وہ طرزِ فکر ہے جس نے سچی بات یہ ہے کہ ہمارا خانہ خراب کیا ہے اور علم کے نام سے جہل قابلِ فخر بن گیا ہے، اگلوں کی توقیر اور تعظیم کے نام پر طلبِ علم و تحقیق کی راہ بند کرنے والا یہ طرزِ فکر اگر ہمارے یہاں عام نہ ہوا ہوتا تو ہمارا عالم آج کے عالم سے بہت مختلف ہوتا منجملہ اس کے یہ جو شیعیت ہمارے یہاں اُس وقت گھس آئی تھی جب اُس نے ایک باقاعدہ متوازی مذہب کی شکل اختیار نہیں کی تھی، یہ بعد کے دور میں قطعی طور سے نکالی جا سکتی تھی، اور نکال دی جاتی اگر جانب علمانہ کی جگہ یہ منصوفانہ ذہنیت ہم پر حاوی نہ ہو چکی ہوتی کہ جو اوپر والوں نے کہہ دیا اور لکھ دیا وہ حرفِ آخر اور پتھر کی لکیر ہے۔ اور اس لکیر کی فقیری ہم کو کرنا ہی ہے۔ ؎

؎ بہ مَے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید

اللہ ہی جانے کہاں سے یہ طرزِ فکر اس دنیائے اسلام میں آیا جس کا خمیر ہی ذاتی غور و فکر کی دعوت سے اُٹھایا گیا تھا اور آیۂ وجادلہم بالتی ہی احسن و جد العلماء کی مذمتی تقلید کو

---

[1] کتاب میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

ضلال و خسران بنایا گیا تھا؟ کھلی ہوئی بات ہے اور ہم سبھی جانتے اور مانتے ہیں کہ کوئی آدمی عالمِ کُل نہیں ہوتا۔ پھر ہر ایک کا کچھ نہ کچھ خاص زاویۂ نظر ہوتا ہے، ہر ایک اپنے زمانے، اپنے ماحول اور ماحول پر غالب چیزوں سے متأثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی کتنا بھی بڑا عالم اور محقق ہو کہیں نہ کہیں ٹھوکر ضرور کھائے گا، کسی نہ کسی لاعلمی یا غلط فہمی کا شکار ضرور ہوگا اِلَّا مَن شَاءَ اللّٰہُ اس لئے اگر اسکے احترام کے ساتھ ساتھ علم کے حق کا احترام بھی منظور ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اسکی باتوں کو تقلیداً لینے کے بجائے تحقیقاً لینے میں کوئی حرج سمجھا جائے اور "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِرَ" (جو ٹھیک ہے وہ لے لو، جس میں گڑبڑ ہے وہ چھوڑ دو) کے دانشمندانہ مقولے پر عمل نہ کیا جائے کسی بڑے آدمی کے حوالے ہی کی ضرورت اگر اس کھلی ہوئی بات کو بھی قبول کرنے میں ہو تو حضرت امام مالک کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

کل یؤخذ منہ و یرد علیہ	سوائے اس قبر والی ذات گرامی کے ہر ایک کا قول
اِلَّا صاحب ھذا القبر۔	جس طرح قابل قبول ہو سکتا ہے ناقابل رد بھی ہو سکتا ہے

انسان کی اس محدودیت اور انفعالیت کے علاوہ ایک دوسری کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ کسی گزشتہ زمانے کو ہم اخلاق و کردار اور عادات و اطوار کے لحاظ سے اُسکے بعد والے زمانوں کے مقابلے میں خواہ کیسا ہی بہتر سمجھیں مگر وسائل کے معاملے میں ہر بعد والا زمانہ پہلے زمانوں کو پیچھے چھوڑتا آرہا ہے۔ وسائلِ علم کا بھی یہی حال ہے کہ وہ برابر ترقی پذیر ہیں۔ کتنے ہی علوم جو اگلی صدیوں میں یا تو مدوّن نہ تھے، اور مدوّن ہو گئے تھے تو اُنکے مجموعے آسانی سے دستیاب نہ تھے، جبکہ زمانے کی ترقیوں نے اُن کو اب نہایت منقح شکلوں میں ہر کہہ و مہ کی دسترس میں کر دیا ہے، پھر علمی تحقیقات کو آسان بنانے کا فن نت نئے طریقے اور وسیلے ایجاد کر کے اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ نتیجے میں نئی علمی تحقیقات کا بھی ایک سرمایہ فراہم ہو چکا ہے۔ ایسے حال میں ہم اہلِ علم حوالوں اور جمود و تعلق کا نمونہ بنا رہے جس معاملے میں جو بات اگلے لوگ

دے گئے تھے، اور جو رائے ظاہر کر گئے تھے، اُسے نئے اور بہتر وسائل کی روشنی میں پرکھ کر دیکھنے اور پھر رد کر دینے یا قبول کئے رہنے کا اپنا فیصلہ کرنے کی جرأت کے بجائے ہم جوں کے توں اُسی رائے پر قائم رہتے ہیں اور ہر نئی آواز اور نئی رائے سے لڑ جانے ہیں اپنی سعادت سمجھیں۔ یہ بے شک (حسن نیت کے ساتھ) اُخروی سعادت ضرور ہو سکتی ہے۔ مگر دنیوی سعادت کی قیمت پر ہو گی ___ اور ہو رہی ہے ___ جبکہ ہمارا دین بیک وقت دونوں سعادتوں کا کفیل ہے اور دونوں کی بیک وقت طلب ہی وہ ہمیں سکھاتا ہے[1]۔

دوسرا طریقہ جو ابن خلدون جیسے اہلِ علم کا اصلاً طریقہ ہے، یہ ہے کہ ہمیں اگر حضرت حسین کی زندگی میں یزید کے فسق و فجور کی کوئی معتبر معاصر شہادت نہیں ملتی[2] تو پھر ساری دنیا کہے، بشمولِ ابن خلدون کہے تب بھی اس قول اور بیان کو بس اِس پر محمول کرنا چاہئے کہ بعض باتیں اپنی شہرت کی بنا پر اس درجہ یقینی اور قطعی بن جاتی ہیں اور ایک زمانے تک بنی رہتی ہیں کہ ان کی واقعیت میں کسی شک اور اُنکے بارے میں کسی تحقیق کی ضرورت کا سوال ہی ذہن میں نہیں آتا۔ اور یہی چیز اس معاملے میں پیش آئی ہے جہ حضرت حسین جیسی شخصیت کا یزید کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل اور پھر شیعہ پروپیگنڈہ مشنری (جس نے پروپیگنڈے کے زور پر حضرت عثمانؓ جیسے

---

[1] بلا تکلف اعتراف ہے کہ جو چیز آج قطعاً نا قابلِ فہم معلوم ہو رہی ہے۔ بہت کچھ ناقدانہ ذہن رکھنے کے باوجود ایک زمانے میں ایک حد تک وہ اپنا حال بھی رہی۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ کاش عمر کا وہ قیمتی حصہ اس کم فہمی کی نذر نہ ہوتا۔

[2] صرف ایک شہادت، ہمارے علم کی حد تک یہ ملتی ہے کہ حضرت معاویہ نے یزید کی ولی عہدی کے معاملے میں اپنے حاکم بصرہ زیاد سے مشورہ مانگا تو اُس نے یزید کے شوقِ شکار، ور کچھ آزاد روی وسہل انگاری کا اندازہ کرکے یہ مشورہ دیا کہ یہ کام کچھ مؤخر کر دینا مناسب ہو گا۔ اور ساتھ ہی یزید سے کہلوایا کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کرے چنانچہ اسی روایت کے مطابق اُس نے اپنی بہت کچھ اصلاح کر لی۔ (طبری ج ۶ صنہ ۱۷۰) یعنی جو کچھ تھا وہ حضرت معاویہ کی زندگی میں تھا اور اُسی زمانے میں ختم ہو گیا۔

عظیم المرتبت صحابی کو ایک کافر و مرتد باور کرا دیا تھا) ان دو چیزوں کی طاقت مل کر یزید کے بارے میں کیا کچھ نہیں باور کرا سکتی تھی؟ اس شہرت کا پردہ جیب تک چاک نہ ہوا تھا۔ اور پروپیگنڈے کا سحر ٹوٹا نہ تھا تب تک جس طرح بات چلتی رہی چلتی رہی۔ مگر کیا وجہ ہے کہ ہمیشہ یوں ہی چلتی رہے اور حقیقت کھل جانے پر بھی اسکے ساتھ حقیقت پسندانہ معاملہ نہ کیا جائے؟

مؤمن کا معیار اور اس کی ذمّہ داری

یزید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں۔ اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؓ سے ہے حضرت معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں، اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؓ سے ہے۔ مگر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جن کی ذات اقدس کی طرف یہ تمام رشتہ داریاں لوٹتی ہیں اُنکی مبارک تعلیم نے ہمارا رشتہ سب سے پہلے حق اور صداقت کے ساتھ قائم کر دیا ہے۔ باقی تمام رشتہ داریوں کا درجہ اسکے بعد رکھا ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ[1]	اے ایمان والو مضبوط کھڑے ہو انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اللہ کے۔ اگرچہ گواہی تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہو۔
یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی[2]	اے ایمان والو کھڑے ہو مضبوط اللہ کیلئے انصاف کے گواہ بن کر۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں بے انصافی پر آمادہ نہ کرے انصاف ہی کرو کہ یہ قرین تقویٰ ہے۔

اسلام کی اس واضح اور صریح تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہمیں تو اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یزید کیلئے اور حضرت حسینؓ کے لئے ہمارے پاس الگ الگ ترازو، اور الگ الگ باٹ ہوں۔

---

[1] القرآن۔ سورۃ النساء (۴) آیت ۱۳۵ [2] القرآن۔ سورۃ المائدہ (۵) آیت ۸

العین تدمع والقلب یحزن — آنکھوں میں نم ہے اور دل میں غم گزیں ہے
ولا نقول الا ما یرضی بہ ربنا[1] — ہم بس وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔

حضرت حسینؓ اور یزید کے قضیے کا مطالعہ اگر اللہ و رسول کی ان تعلیمات کی روشنی میں اسی اسپرٹ سے کیا جائے جس اسپرٹ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک یہودی ملزم کے ساتھ برابری کی سطح پر اپنے قاضی کی عدالت میں حاضری قبول فرمائی جس اسپرٹ کے ساتھ قاضی نے حضرت علیؓ کے خلاف فیصلہ دیا۔ (اور صرف اس ٹیکنیکل بنیاد پر دیا کہ گواہی کا نصاب (کورم) پورا نہیں ہے) اور جس اسپرٹ کے ساتھ حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ بے تأمل قبول فرمایا۔ انصاف کی اس اسپرٹ کے ساتھ اگر ہم معاملے کو جانچنے کی کوشش کریں۔ تو اس قضیے میں اب تک جو تصور چلا آرہا ہے۔ اسکے باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اگر واقعی ایک ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اس تصوّر اور تأثر کو باقی رکھنے کی اجازت نہیں دیتا جو اس معاملے میں ابتک عام طور سے رہا ہے تو پھر یقیناً یہ ایک ایماندارانہ فریضہ ہے کہ اس مطالعے کو سامنے لایا جائے اور ان تمام حلقوں تک اسے پہنچانے کی امکان بھر سعی کی جائے جو اب تک کے تصور کو ایک ایمانی سعادت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اس طرح حقائق کے ساتھ بے انصافی جیسی غلط چیز ایمان کا تقاضہ بن جاتی ہے۔

اس کام کی ضرورت

ہمیں پورا احساس ہے بلکہ تجربہ ہے جس کا اوپر اظہار ہو چکا ہے کہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق نازک قسم کے جذبات سے جڑ گیا ہو ایک صدیوں اور نسلوں سے جمے ہوئے تأثر اور تصور کو چھیڑنا ایک پُرخطر کام ہے۔ مزید یہ اس لئے بھی ایک دشوار کام ہے کہ خود اپنے جذبات کی دنیا بھی، اس "ایمانداری" کے ہاتھوں جگہ جگہ آزمائش میں پڑتی ہے۔ اس لئے کہ ابتک کا عمومی تصوّر

---

[1] یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اُس موقع کا ارشاد ہے جب صاحبزادہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے ہاتھوں میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر رہے تھے۔ اور آپ پر غم کا عالم طاری تھا۔

کچھ نہ کچھ ہم سبھی کو ورثے میں ملا ہے. مگر یہ معاملہ جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا ہے' ان معاملات میں سے ہے جنھوں نے ہمارے دینی زاویۂ نظر کو مجموعی طور سے بہت متأثر کیا ہے' یہ ان معاملات میں سے ہے جن معاملات نے ہمارے اندر ایمانداری اور غیر جانبداری کے شعور کو مدھم کیا ہے' جن معاملات نے انصاف پسندی کی بے لاگ اسلامی روح کو بے جان کر دیا ہے' اور حقیقت بینی اور حقیقت پسندی جو اسلام کی سب سے بڑی دین تھی اُس سے اُمّت کو بحیثیت مجموعی محروم کیا ہے' اُمّت کا ہر حلقہ (خاص طور سے ہر دینی حلقہ) جو آج اپنے آپ کو معیارِ حق بنائے ہوئے ہے' اور اس طرح حق سب سے زیادہ مشتبہ اور متنازعہ چیز بن گئی ہے' یہ ایسے ہی معاملات کا رفتہ رفتہ اثر ہے جن میں انصاف اور حقیقت پسندی جیسے اوّلین اسلامی اور انسانی تقاضوں کو دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر قربان کر دیا جاتا رہا' ہمارے اندر نئے نئے حلقوں کی پیدائش پرانے حلقوں کے باہمی بُعد میں اضافہ اور ان میں سے ہر ایک کے اندر انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے نئی باہمی تقسیمیں' یہ سب عذاب اسی انصاف پسندی' حقیقت پسندی اور حقیقت بینی کے فقدان کا ہے' اس عذاب سے امّت کے نکلنے کی کوئی صورت اسکے بغیر نہیں ہے کہ جہاں جہاں سے اس فساد کی ابتداء ہوتی نظر آتی ہے' وہاں وہاں سے اصلاح کے کام کی ہمت کی جائے۔

پیشِ نظر کتاب اصلاً تو والد ماجد مدظلہ' کے ایماء کی تعمیل ہے' مگر جس خاص شکل میں اور جس انداز پر یہ تیار ہوئی ہے وہ میرے انہی مذکورہ بالا احساسات کا نتیجہ ہے' برسہا برس سے بڑی شدت کے ساتھ احساس ہے کہ ہمارے یہاں حقیقت پسندی اور انصاف پسندی جس پر تمام دینی اور دنیوی سعادتوں کا مدار ہے ایک عنقا صفت شئی ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سعادت بھی ہمارے یہاں عنقا ہو گئی ہے عاقبت کی خبر تو خدا جانے ہم پر وہاں کا حال وہیں جا کے کھلے گا. دنیا کی ہر سعادت سے' بحیثیت قوم و ملت' محرومی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے جو قوم بھی حقیقت بینی اور حقیقت پسندی کا دروازہ اپنے اوپر بند کرے گی اور مزعومات کو عقائد بنالے گی وہ لازماً پسماندگی اور محرومی ہی کو اپنا مقدّر بنائے گی. اللہ رب العزت

سے دعا ہے کہ اپنا یہ حال بدلے اور یہ کتاب اس تبدیلیٔ حال میں مددگار ہو۔ وآخرُ دعوانا ان الحمد للہِ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

چند ضروری باتیں

۱۔ کتاب میں کافی اقتباسات تاریخ، سیر اور حدیث کی کتابوں سے ہیں۔ ان اقتباسات میں جہاں جہاں اصل عربی عبارت بھی دی گئی ہے وہاں یہ بات دیکھی جاسکتی ہے کہ جامعین حدیث ہوں یا اہلِ سیر و تاریخ صحابۂ کرام کے ناموں کے ساتھ ہمارے یہاں کے رواج کے مطابق نہ نام سے پہلے "حضرت" جیسا کوئی تعظیمی لفظ لکھتے ہیں۔ نہ بعد میں رضی اللہ عنہ (یا اس کا مخفف رضؓ)۔ ان عبارتوں کے اردو ترجمے میں اپنی طرف سے ان تعظیمات کا اضافہ کرنا سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لئے ان مصنّفین و مؤلفین کا اپنا اسلوب برقرار رکھا گیا ہے بلکہ پھر غیر شعوری طور پر اپنی عبارت میں بھی بہت سی جگہ ایسا ہی ہو گیا ہے۔ رسمی بات تو الگ ہے مگر متقدم مصنفین و مؤلفین کا یہ طرزِ عمل سامنے رکھتے ہوئے اس بارے میں کسی واقعی معذرت کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

۲۔ کتاب کی تسوید کا بیشتر کام فروری ۸۰ء سے جولائی ۹۰ء تک ہندوستان کے قیام میں ہوا مگر اسکی شروعات لندن ہی میں ہو چکی تھی۔ لندن میں البدایۃ والنہایۃ اور تاریخ ابن اثیر کے جو ایڈیشن سامنے رہے تھے اور جن سے لئے ہوئے کچھ نوٹس وغیرہ بھی ساتھ تھے، ہندوستان میں کام کرتے وقت یہ ایڈیشن دستیاب نہ ہو سکے۔ اسکی بنا پر ایک ہی کتاب کے دو ایڈیشنوں کے حوالے کتاب میں آگئے ہیں؛ کوشش کی گئی ہے کہ حوالے میں ایڈیشن کا امتیاز بھی ہو جائے۔ مگر امکان ہے کہ کہیں کچھ التباس ہو گیا ہو۔ اگر کوئی صاحب ان دونوں کتابوں کا کوئی حوالہ ملائیں اور اُس میں کوئی دقت پیش آئے تو سمجھ لیا جائے کہ یہ صفحہ کا نمبر دوسرے ایڈیشن کا ہے۔ ان کتابوں میں واقعات کا

سنہ وار ذکر ہے اس لئے سنہ کے حساب سے ہر واقعہ بآسانی ہر اڈیشن میں پایا جا سکتا ہے۔

۳۔ کتاب کی تیاری کے سلسلے میں جن اصحاب کی مدد کا میں ممنون ہوں اُن میں سرِ فہرست نام جناب مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب ناظم کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا ہے۔ جن کی عنایت و کرم فرمائی سے ضرورت کی ہر وہ کتاب جو کتب خانہ میں تھی بروقت اور بآسانی دستیاب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انکو اس مہربانی کا بہترین اجر میری طرف سے دے اور وہ بہت دن اپنے "مبحث" کے ساتھ سلامت رہیں۔ ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں اپنے محبّ قدیم مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی اور ایک نئے محبّ مولانا عتیق احمد صاحب بستوی کو بھی میں نے کئی دفعہ بعض چیزوں کی تلاش کیلئے تکلیف دی جسے ان حضرات کے علمی ذوق و تفرنے آسان کر دیا بروقت کے اور حسب ضرورت مددگار دن میں میرے عزیز برادر خورد میاں خلیل الرحمن سجاد ندوی رہے۔ اللہ انکو سلامت باعافیت رکھے۔ کتابت کی تصحیح وغیرہ کی ذمہ داری اب جبکہ میں اس کام کو مکمل کئے بغیر لندن چلا آیا ہوں انھیں کے اوپر ہے، و ان شاء اللہ اگر یہ مکمل ہو کر آئی تو اُن کا اور میرے چھوٹے اور انکے بڑے بھائی میاں حسّان نعمانی ناظم کتب خانہ الفرقان کا اس کی تکمیل و تیاری میں بڑا حصہ ہوگا۔

۴۔ اللہ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر اتنجام پائے تو اسے قبول فرمائے اور قلم نے کہیں لغزش کی ہو تو اُسکے اثرات سے ناظرین کو بچائے۔ اور مجھے اُس پر متنبہ ہونیکی سبیل پیدا فرمائے۔

عتیق الرحمن سنبھلی

لندن ۴ر اگست سنہ ۹۰ء

باب اوّل

شہادت عثمانؓ — خانہ جنگی — صلح حسنؓ

شہادتِ عثمانؓ اور خانہ جنگی

حضرت عثمانؓ کی شہادت (۳۵ھ) کے وقت سے مسلمانوں میں باہم تلوار چلنے کا جو دروازہ کھلا تو پھر اُس پر حرام ہو گیا کہ بند ہو، اور یہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:-

اذا وضع السیف فی اُمّتی	میری اُمّت میں جب ایک دفعہ
لم ترفع عنہا الی یوم القیٰمۃ[1]	آپس میں تلوار اُٹھ جائے گی تو پھر وہ قیامت تک رکھی نہ جائے گی۔

یہی بات حضرت عبداللہ بن سلام رضؓ نے اُن کوفیوں، بصریوں اور مصریوں سے فرمائی تھی جو حضرت عثمانؓ کے درپئے قتل تھے مؤرخ ابن اثیر نے اُن کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

یا قوم لا تسلّوا سیف اللّٰہ	اے لوگو، اللہ کی تلوار کو آپس میں مت
فیکم فواللّٰہ ان سللتموہ	کھینچو، خدا کی قسم اگر تم نے اسے بے نیام
لا تغمدوہ و یلکم انّ	کر دیا تو پھر یہ واپس نیام میں جا نہ پائی
سلطانکم الیوم یقوم بالدّرۃ	نہیں بد دیکھو سمجھو آج تک تمہاری
فان قتلتموہ لا یقوم	حکومت فقط دُرّے سے چلتی رہی ہے

---

[1] ابوداؤد و ترمذی۔ مشکوٰۃ باب الملاحم۔

إلَّا بالسيف۔[1] اگر تم نہ مانے اور عثمان کو قتل کر دیا تو پھر یہ تلوار ہی سے چلے گی۔

اور خود حضرت عثمانؓ نے اِن لوگوں سے اس بات کو یوں کہا تھا کہ:۔

"اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر آئندہ کبھی باہمی محبت سے نہ رہ سکو گے، ایک ساتھ نماز نہ پڑھ پاؤ گے اور ایک جان ہو کے دشمن سے نہ لڑ سکو گے۔"[2]

جنگ جمل اور صفّین

یہ تلوار آپس میں چلی اور ایسی چلی کہ الامان الحفیظ! شہادتِ عثمانؓ پر ایک سال بمشکل گزرا کہ مسلمانوں نے آپس میں دو جنگیں، جنگِ جمل اور جنگِ صفّین کے نام سے لڑیں اور اپنے بہترین افراد ان باہمی جنگوں کی نذر کر دیئے، دونوں جنگوں کے مقتولین (یا شہداء) کی تعداد نوّے ہزار تک بتائی گئی ہے۔

عالی مقام بیٹا

خانہ جنگی کا یہ دور کوئی پانچ سال (۳۶ھ تا ۴۰ھ) رہا، رمضان ۴۰ھ میں حضرت علیؓ کو ایک خارجی نے شہید کر دیا۔ آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؓ جانشین بنائے گئے۔ آپ نے اس باہمی خون خرابے کو ختم کرنے کے لئے حضرت معاویہؓ سے صلح پسند کی، ۴۱ھ میں یہ صلح ہوئی، اور مسلمانوں نے اس سال کو "عام الجماعۃ" (اجتماعیت کا سال) قرار دیا کہ تفرقہ مٹ کر اسلامی وحدت واپس آگئی تھی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک ارشاد نبوی بخاری میں روایت ہوا ہے کہ آپؐ نے حضرت حسنؓ کی طرف اشارہ کر کے (جبکہ وہ بچے تھے) فرمایا کہ:۔

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۹۸ مطبوعہ دار الفکر بیروت [2] تاریخ طبری ج ۳ جزء ۵ ص ۱۱۵ مطبوعہ دار القلم بیروت۔

اِبنی ھٰذا سید ولعلّ اللہ	میرا یہ بیٹا سید (عالی مقام) ہے
ان یُصلح بہٖ بین فئتین	امید ہے کہ اللہ اسکے ذریعے مسلمانوں
عظیمتین من المسلمین۔[1]	کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعدد صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے جنگِ جمل اور جنگِ صِفّین سے (جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے آپس میں لڑیں) اپنے آپ کو علیحدہ رکھا مثلاً حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، یہ اور اُن کے ساتھ اور بہت سے حضرات اس اختلاف اور خانہ جنگی کو ایک فتنہ سمجھتے تھے، طبری نے امام شعبی سے روایت کی ہے کہ :-

باللہ الذی لا الٰہ الا ھو	قسم خدائے وحدہٗ لاشریک کی، اس
ما نہض فی تلک الفتنۃ اِلّا	فتنے میں بدری صحابہ میں سے چھ کے سوا
ستۃ بدریین مالھم سابع	کوئی ساتواں یا سات کے سوا کوئی آٹھواں
او سبعۃ مالھم ثامنٌ۔	نہ تھا جو شریک ہوا ہو۔[2]

حضرت حسنؓ کی عمر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اگرچہ اتنی نہ تھی کہ وہ "فتنہ" کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات اور تنبیہات سے واقف ہوسکتے جیسے ارشادات حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے بزرگ صحابہ کو اس موقع پر یاد آرہے تھے۔[3]

---

[1] مشکوٰۃ (بحوالہ بخاری) باب مناقب اہلِ بیت۔ [2] طبری ج ۵ ص۱۶۵ روایت میں چھ اور سات کا جو شک ہے اسکی وجہ طبری کی اگلی روایت کے مطابق حضرت ابوایوب انصاری کے بارے میں امام شعبی کا شک ہے۔

[3] مثلاً حضرت ابوموسیٰ اشعری نے لوگوں کو یاد دلایا کہ "میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ عنقریب ایک فتنہ (آزمائش اور غیر واضح معاملہ) رونما ہوگا جس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا (یعنی پیدل چلنے والا) سواری پر چلنے والے سے (ابن اثیر ج ۳ ص۱۱۱) اسی فتنے کا حوالہ ان تمام لوگوں کی (باقی آئندہ صفحہ پر)

اور اس لئے وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ جنگِ جمل اور جنگِ صفین دونوں میں شریک ہوئے مگر اُنکی طبیعت جس سانچے میں ڈھلی تھی اُس کے زیرِ اثر اُن کی ابتدائی کوشش یہی رہی تھی کہ اُن کے والد ماجد حضرت علی جنگ سے گریز فرمائیں۔ طبری اور ابن اثیر دونوں میں ہے کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے جب بالکل قطعی جواب آگیا کہ وہ قصاص عثمانؓ سے پہلے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے والے نہیں ہیں تو اہلِ مدینہ کو فکر ہوئی کہ پتہ چلے کہ اب علیؓ کا ارادہ کیا ہے۔ وہ معاویہؓ کے خلاف لشکر کشی کریں گے اور اس طرح اہلِ قبلہ[1] کے خلاف تلوار اٹھائیں گے۔ یا اس سے رک جائیں گے؟ اور تجسس خاص کر اس لئے ہوا تھا کہ انھیں پتہ چلا تھا کہ حسنؓ اپنے والد کو یہ رائے دے رہے ہیں کہ وہ کوئی اقدام نہ کریں۔

وقد بلغهم ان الحسن بن علی دعاه الی القعود وترك الناس۔[2]

اور انھیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حسن بن علیؓ اپنے والد کو رائے دے رہے ہیں کہ آپ کوئی اقدام نہ کریں اور لوگوں کو انکے حال پر چھوڑ دیں۔

ابن کثیر نے اس موقع پر حضرتِ حسنؓ کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ اِن الفاظ میں آپؓ نے اپنے والد ماجد کو کسی اقدام کے خلاف رائے دی۔

یا أبت دع هذا فانّ فیه سفك دماء المسلمین و وقوع الاختلاف بینهم۔[3]

ابا جان! یہ نہ کیجئے۔ یہ ارادہ ترک کر دیجئے کیونکہ اس میں مسلمانوں کی خونریزی اور باہم اختلاف انگیزی ہے۔

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) گفتگوؤں میں ملتا ہے جنھوں نے حضرت علیؓ کی خلافت قبول کی مگر جنگ میں اُن کا ساتھ قبول نہیں کیا۔ [1] "اہلِ قبلہ کے خلاف" تلوار اُٹھانے کے الفاظ طبری اور ابن اثیر کی روایت ہی کے ہیں: "رأیہ فی قتال اهل القبلة، أیجترأ علیه ام ینکل عنه؟" طبری ج ۵ ص ۱۶۳ [2] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۰۲
[3] البدایۃ والنہایۃ ج ، ص ۲۵ مطبعۃ الاصمعی ریاض۔

ابن اثیر ہی میں ایک دوسری جگہ آتا ہے (اور طبری اور البدایہ والنہایہ میں بھی ہے[1]) کہ اہلِ شام پر فوج کشی کی تیاری ہو ہی رہی تھی کہ پتہ چلا مکّہ سے حضرت عائشہؓ کی سرکردگی میں اور حضرت زبیرؓ و طلحہؓ کی رہنمائی میں ایک فوج حضرت علیؓ کے ساتھیوں کی طرف سے (جن میں قاتلانِ عثمانؓ اور ان کے ہمنوا شامل تھے) بے اطمینانی کے ماتحت بصرہ کی طرف روانہ ہوگئی ہے تو حضرت علیؓ نے یکایک مدینے سے نکل کر ان لوگوں کو راستے میں روکنے کا فیصلہ کیا۔ روایت سے ایسا لگتا ہے کہ حضرت حسنؓ ساتھ نہیں تھے لیکن بعد میں پہنچ کر ربذہ کے مقام پر ملے نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اُن کے روکنے سے حضرت علیؓ رُکے نہیں تھے تو وہ خود اُنکے ساتھ روانہ نہیں ہوئے مگر پھر کچھ خیال آیا تو پیچھے سے چل کر ربذہ پہنچے اور وہی گفتگو پھر کی جس کا اشارہ اوپر کی روایت میں ملتا ہے:

وأتاه ابنه الحسن في الطريق	آپ کے بیٹے حسن راستے میں آپ کے
فقال له لقد امرتك فعصيتني	پاس آئے اور کہا کہ میں نے کچھ آپ سے
فتقتل غداً بمضيعة لاناصر	کہا تھا جو آپ نے نہیں مانا نتیجہ یہ ہوگا کہ
لك فقال له عليٌ ..... وما الذي	کل کو آپ بے یار و مددگار مارے جائیں گے
امرتني فعصيتك قال امرتك	حضرت علیؓ نے کہا کہ تم نے مجھ سے کیا کہا
يوم أُحيط بعثمان أن تخرج	تھا، جو میں نے نہیں مانا؟ کہا کہ جس دن
عن المدينة فيقتل ولست بها	حضرت عثمانؓ محصور کئے گئے میں نے آپ سے کہا تھا
ثم أمرتك يوم قُتل أن لا	کہ آپ مدینے سے باہر چلے جائیں تاکہ آپ کی
تبايع حتى تأتيك وفود العرب	موجودگی میں کچھ نہ ہو۔ پھر جب عثمانؓ
وبيعة اهل كل مصر فانهم لن	قتل کر دیئے گئے تو میں نے آپ سے کہا کہ
يقطعوا امراً دونك فابيت	آپ بیعت مت لیجئے حتیٰ کہ تمام عرب سے
عليّ وامرتك حين خرجت	وفود آپ کے پاس آویں اور ہر شہر کے لوگوں

[1] کیونکہ ابن اثیر کی اصل طبری ہی کی روائتیں ہیں اور اسی طرح البدایۃ والنہایۃ کی بھی اصل وہی ہے۔

هٰذه المرءة وهذان الرجلان ان تجلس فی بیتك حتیٰ یصطلحوا فان کان الفساد کان علیٰ ید غیرك فعصیتنی فی ذالك کله۔[1]

کی بیعت آجائے۔ اس لئے کہ یہ لوگ آپ کے سوا کسی اور کو منتخب کر ہی نہیں سکتے آپ نے یہ بات بھی نہیں مانی اور پھر جب عائشہؓ اور زبیرؓ و طلحہؓ نکلے تو میں نے کہا کہ آپ گھر بیٹھئے حتی کہ یہ آمادۂ اصلاح ہو جائیں اور اگر فساد ہوتا ہے تو وہ آپ کے نہیں دوسرے کے ہاتھ سے ہو مگر آپ نے میری کوئی بھی بات نہیں مانی۔

حضرت علیؓ کی رائے میں صاحبزادے حسنؓ کا مشورہ صحیح نہ تھا، اس لئے انھوں نے جس بات کو صحیح سمجھا اس پر عمل فرمایا اور پھر باہمی جنگ اور خونریزی کا ایک طویل سلسلہ چلا جس میں حضرت حسینؓ بھی والد ماجد کے دوش بدوش شامل رہے مگر جب ۴۰ھ میں ایک خارجی کے ہاتھ سے حضرت علیؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا اور آپ کی جانشینی کا بار حضرت حسنؓ کے کاندھوں پر رکھا گیا تو اس وقت یہ حقیقت بالکل آئینہ ہو چکی تھی کہ اِس اختلاف سے مسلمانوں کا بے پناہ نقصان ہو گیا تھا اور اب بھلائی اسی میں تھی کہ یہ باب بند کر دیا جائے حضرت علیؓ کے حامیوں میں انتشار، حکم عدولی اور شکست خوردگی بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اس لئے گروہی نقطۂ نظر سے بھی بہتری با عزت مصالحت ہی میں تھی، چنانچہ حضرت حسنؓ کے حصے میں یہ سعادت آئی کہ اُن کی پیش قدمی کی بدولت مسلمانوں کا پانچ سالہ تفرقہ مٹے اور وہ پھر سے ایک جماعت بن جائیں، اور اس طرح وہ پیشگوئی بھی پوری ہو جو بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لئے فرمائی تھی کہ "میرا یہ بیٹا بڑا اعالی مقام ہو گا اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کا تفرقہ مٹے گا۔

امن و یکجہتی کے بیس سال

حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات کی بدولت حضرت معاویہؓ کے بارے میں

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۱۴

کسی کی کچھ بھی رائے ہو مگر ایک بات سے انکار کسی انصاف پسند کے لئے ممکن نہیں ہے کہ ان کے اندر عرب سرداری کی اعلیٰ ترین خصوصیات تھیں۔ ایک طرف وہ اپنے زمانے کی عرب دنیا کے پانچ دوراندیشوں اور دیدہ وروں (دُھاۃِ عرب) میں سے ایک مانے جاتے تھے، اور الخوارج ثابت کر دیا کہ ان پانچ میں وہ سب سے بڑھ کر تھے[1] دوسری طرف سخاوت اور حلم کے بادشاہ، داد و دہش میں ہاتھ نہیں رکتا تھا اور بُردباری کی انتہا نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کی ان صفات نے تفرقے کی خلیجوں کو پاٹنے اور اس زمانے کی تلخ یادوں کو بھلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کا بیس سالہ دورِ حکومت (سنہ ۴۱ھ تا سنہ ۶۰ھ) بڑے امن عافیت اور مسلمانوں کی یکجہتی کے ساتھ گزر گیا۔ اور مسلمان آپس کی جنگ سے چھٹی پا کر اُن محاذوں کی طرف واپس چلے گئے جہاں وہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ مصروفِ جنگ ہوتے اور نئی نئی فتوحات حاصل کرتے تھے۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا:۔

"خلافت عمری اور خلافت عثمانی میں حضرت معاویہؓ کے ہاتھوں شامی محاذ پر جہاد اور فتوحات کا جو شاندار سلسلہ چلتا رہا تھا وہ اس وقت بالکل رُک گیا جب اُن کے اور حضرت علیؓ کے درمیان معرکوں کا دور چلا۔ ان دنوں میں نہ اِن کے ہاتھ پر کوئی نئی فتح ہوئی نہ اُن کے ہاتھ پر...... حتیٰ کہ حضرت حسنؓ کے ساتھ صلح ہوئی اور حضرت معاویہؓ کی خلافت پر۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے سنہ ۴۱ھ میں ۔ پوری اسلامی دنیا نے اتفاق کر لیا۔ اُس وقت سے لے کر اپنے سنِ وفات (سنہ ۶۰ھ) تک وہ بے غل و غش حکمراں رہے۔ اس شان کے ساتھ کہ دشمن کی سرزمین پر جہاد ہو رہا ہے، حق کا پرچم بلند ہے، چاروں طرف سے مال غنیمت آ رہا ہے اور مسلمان اُن کے ساتھ آرام، انصاف اور عفو و درگزر

---

[1] باقی چار کے نام ہیں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، قیس بن سعد اور عبداللہ بن بُدیل ان میں سے ۱۔ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے ۲۔ غیر جانبدار اور ۳ و ۴۔ حضرت علیؓ کے ساتھ طبری ج ۳ جزء ۶ ص ۹۳

کی فضا میں رہ رہے ہیں۔[1]"

حضرت معاویہؓ اور حضرات حسنینؓ

شیعہ علماء و مصنفین پر افسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے معاویہؓ دشمنی میں حضرت معاویہؓ کی مسلّمہ صفات، حلم، سخاوت و سماحت اور اُن پر مبنی تاریخی حقائق کو بھی جھٹلانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے، یہاں تک کہہ دیا کہ انھوں نے تو وہ وعدے بھی پورے نہیں کئے جو حضرت حسنؓ کے ساتھ شرائط صلح کے طور پر طے ہوئے تھے، حالانکہ اُن کا معاملہ حضرت حسنؓ تو حضرت حسن حضرت حسین کے ساتھ بھی اس حد تک حسنِ سلوک اور رواداری کا تھا کہ اعلیٰ درجے کے حلم، تدبّر اور کریم النفسی کے بغیر اُس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے لئے خود انہی حضرات کی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ یمن سے دمشق کو ایک سرکاری قافلہ بہت سا قیمتی سامان مثلاً یمنی چادریں، عنبر اور دیگر خوشبوئیات لے کر حسب معمول مدینے سے گزر رہا تھا حضرت حسینؓ نے روک کر اُس کا تمام مال اُترا لیا اور حضرت معاویہؓ کو یہ خط لکھ بھیج دیا کہ "ایسا ایسا قافلہ جو دمشق میں تمھارے خزانے بھرنے اور تمھارے باپ کی اولاد کا سامانِ عیش مہیّا کرنے کے لئے جا رہا تھا میں نے اُسے روک کر اس کا مال لے لیا ہے کیونکہ مجھے ضرورت تھی۔"[2] ہم یقین نہیں کر سکتے کہ حضرت حسین نے ایسی نامناسب زبان اپنے خط میں استعمال فرمائی ہوگی،

---

[1] البدایۃ والنہایہ ج ۸ ص ۱۲۹ [2] حیات الامام حسین بن علیؓ۔ از باقر شریف القرشی مطبوعہ مؤسسۃ الوفاء بیروت ج ۲ ص ۲۳۲ نیز مقتل الحسینؓ از عبدالرزاق الموسوی المقرم مطبوعہ دارالکتب اسلامی بیروت حاشیہ ص ۱۲۳ بحوالہ شرح نہج البلاغہ ابن حدید ج ۴ ص ۳۲۷ طبع اول۔ احتیاطاً خط کے عربی الفاظ کو بھی یہاں پڑھ لیجئے: "من الحسین بن علی الی معاویۃ بن ابی سفیان اما بعد، فان عیراً مرّت بنا من الیمن تحمل مالاً وحللاً وعنبراً وطیباً الیک، لتودعہا خزائن دمشق وتعلّ بہا بعد النہل بنی ابیک، وانی احتجت الیہا واخذتہا والسلام"

گمان غالب ہے کہ خط کو یہ زبان ان حضرات کی عطا کردہ ہے جو اس بات کے روادار نہیں کہ حضرت حسینؓ کو حضرت معاویہؓ کے ساتھ اس سے بہتر زبان میں مخاطب ہوتا ہوا دیکھیں بہرحال ان حضرات کی روایت کے مطابق یہ خط حضرت حسینؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا۔ اب دیکھئے کہ اس کا کیا اور کس انداز کا جواب حضرت معاویہؓ نے انہی حضرات کی روایت کے مطابق دیا :-

" اللہ کے بندے معاویہ کی طرف سے حسین بن علی کے نام تمھارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ یمن سے آتا ہوا قافلہ روک کر اُس کا سامان تم نے لے لیا ہے۔ لیکن تمھیں یہ چاہئے نہیں تھا جبکہ وہ میرے نام سے آرہا تھا کیونکہ یہ حق صاحب حکومت (والی) کا ہے کہ مال اسکے ہاتھ میں آوے اور پھر وہی اُسکو تقسیم کرے، اللہ جانتا ہے کہ اگر تم اسکو میرے پاس آنے دیتے تو میں اُس میں سے تمھارا حصّہ دینے میں کوئی کمی نہ کرتا، لیکن بھتیجے! بات یہ ہے کہ تمھارے دماغ میں ذرا تیزی ہے کاش کہ یہ بس میرے ہی زمانے تک رہے کیونکہ میں تمھاری قدر و قیمت جانتا ہوں۔ اور ایسی باتوں سے درگزر کر لیتا ہوں، ڈر لگتا ہے کہ (بعد میں) تمھارا واسطہ کسی ایسے سے نہ پڑ جائے جو تمھیں کوئی چھوٹ دینے کو تیار نہ ہو"[1]

اس چھوٹی سی خط و کتابت سے کیا کیا بات ثابت ہوتی ہے، اس وقت اس سب کے احاطہ کا موقع نہیں صرف اتنی بات یہاں کہنا مقصود ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ جواب دیکھ کر کسی ادنیٰ انصاف پسند کے لئے شبہ کی بھی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ حضرات حسنین کے ساتھ پاس و لحاظ اور کریم النفسی کے سوا کوئی دوسرا معاملہ کرتے ہوں گے چہ جائیکہ وہ وعدے بھی پورے نہ کریں جس پر حضرت حسنؓ نے خلافت کی جنگ سے دستبرداری دی تھی۔

یہ دعوےٰ (یا کہئے کہ حضرت معاویہؓ پر بدعہدی کا الزام) یوں تو شیعہ حضرات کے یہاں قدیم ہے، لیکن بہت تعجب اُس وقت ہوا جب اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں لکھنؤ کے

---

[1] حوالۂ سابق

شیعہ عالم جناب سید علی نقی (المعروف بہ نقن صاحب) کی تصنیف "شہید انسانیت" دیکھتے ہوئے اس دعوے کی دلیل میں تاریخ طبری کا حوالہ نظر سے گزرا۔ یہ حوالہ جلد ۶ ص۹۳ کا ہے[1]۔ طبری کے اس مقام پر واقعتہً یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ "فَلَمْ يُنْفِذْ لِلْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامِ مِنَ الشروط شيئاً" جن کا ترجمہ اگر کوئی چاہے تو بے شک ان الفاظ میں کر سکتا ہے کہ "جتنی شرطیں کی گئیں تھیں، ان میں سے کوئی ایک بھی پوری نہیں کی گئی" لیکن اہلِ علم سے بعید ہے کہ وہ طبری کے اس جملے کا حوالہ اس مقصد کے لئے دیں۔ کیونکہ اسی تاریخ طبری میں ایک صفحہ پہلے ص۹۲ پر گزر چکا ہے کہ:-

وقد صالح الحسن معاوية على ان جعل له ما في بيت ماله وخراج دارابجرد وعلى ان لا يشتم عليٌّ وهو يسمع فأخذ ما في بيت ماله بالكوفة وكان فيه خمسة آلاف الف۔	اور حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح اس شرط پر کی تھی کہ کوفے کے بیت المال میں جو کچھ ہے وہ اُن کا ہوگا نیز دارابجرد[2] کا خراج ان کو ملا کریگا اور ان کے سامنے حضرت علی پر سب و شتم نہیں ہوا کریگا پس انھوں نے وہ تمام رقم لے لی جو کوفے کے بیت المال میں تھی، اور وہ پانچ کروڑ تھی۔

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں کی گئی۔

ایک صفحہ آگے چل کر یعنی ص۹۳ پر طبری نے جن شرائط کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پوری نہیں کی گئیں، اُن کا قصّہ دوسرا تھا۔ وہ یہ تھا کہ یہ شرائط جن کا اوپر ذکر آیا، یہ تو وہ تھیں جو حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی خواہش کرتے ہوئے ان کو لکھ کر بھیجی تھیں۔ ادھر

---

[1] شہید انسانیت ص۲۲-۲۳۔ سید العلماء اکادمی لکھنؤ۔

[2] شہر کا نام ہے سیر الصحابہ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں اسی شہر کا نام اہواز لکھا گیا ہے۔

حضرت معاویہؓ خود نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان کشت وخون کا سلسلہ چلتا رہے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ حضرت حسن کا مراسلہ ان تک پہنچے انھوں نے خود دو آدمی ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر کے اس پیغام کے ساتھ بھیجے تھے کہ حسنؓ جو شرائط صلح چاہیں اس کاغذ پر لکھ دیں مجھے منظور ہیں۔ چنانچہ حضرت حسنؓ نے اس کاغذ پر کچھ نئے شرائط بڑھا کر لکھ دیئے، یہ تھے وہ شرائط جن کے بارے میں طبری کی ص۹۳ کی روایت بتا رہی ہے کہ:-

فاختلفا فی ذالك فلم یُنفذ للحسن علیہ السلام الخ	ان شرائط کے بارے میں اختلاف ہوا اور ان میں سے کوئی شرط حضرت معاویہ نے پوری نہیں کی۔

مولانا نقن صاحب نے اس پورے قصے کو قلم انداز فرما دیا، اور افسوس ہے کہ اسی ایک جگہ نہیں اور بھی بہت سی جگہوں پر موصوف نے اسی طرح کا معاملہ شیعہ مزعومات کو نباہنے کے لئے اپنی اس تصنیف میں کیا ہے جن میں سے بعض کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔

بہر حال شرائط صلح پورے نہ کئے جانے کی بات بڑی ہی زیادتی ہے ایک شرط کے بالکل نقد ایفاء کا ذکر تو طبری کی مذکورہ بالا روایت میں آگیا دوسری شرط دارابجرد کا خراج اس کے بارے میں طبری کے اندر کوئی مزید روایت نہیں ملتی لیکن دوسرے ذرائع مثلاً ابن اثیر کی تاریخ کامل اور ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دارابجرد جس کا تعلق بصرہ کے مرکز سے تھا اس کے خراج والی شرط پر بصرہ کے لوگ معترض ہوئے کہ یہ خراج تو ہمارا حق ہے یہ کسی اور کو نہیں دیا جانا چاہیئے۔ ابن اثیر نے بس اتنی ہی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے لیکن ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اس کے بدلے میں آنکو سالانہ ہر چھ ہزار کے بدلے میں ایک ہزار دینا منظور کیا جو حضرت حسنؓ اپنے حین حیات دمشق کے سالانہ سفر میں علاوہ دیگر عطیات وتحائف کے وصول فرماتے رہے[1] یہی تیسری

---

[1] فعوضہ معاویۃ من کل ستۃ آلاف الف درھم فی کل عام فلم یزل یتناول مع ماله ذٰلک من زیادۃ من الجوائز والتحف الی ان توفی۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص۴۵ (اس عبارت کے مذکورہ بالا ترجمے پر مجھے پورا اطمینان نہیں ہے۔ اخفیاء کا پہلو رکھ کر وہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ ع)

شرط کہ (کم از کم) حضرت حسنؓ کی موجودگی میں حضرت علی پر سب و شتم نہ کیا جائے۔ اس کے بارے میں ابن اثیر کا بیان ہے کہ یہ شرط پوری نہیں کی گئی،[1] اور تنہا یہ ایک بیان اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ ابن اثیر بھی اُنہی مؤرخین میں سے ہیں جن پر حضرت علی، حسن و حسین (رضی اللہ عنہم) اور حضرت معاویہؓ و یزید کے درمیان والے معاملات میں آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ بیان اگر صداقت پر محمول کر لیا جائے تو ہمیں یہ ماننے کے لئے تیار ہونا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) حضرت حسنؓ کو غیرت اور عزّت نفس کی کوئی ادنیٰ مقدار بھی دربار حق تعالےٰ سے عطا نہیں ہوئی تھی۔ ان کے والد ماجد کو حضرت معاویہؓ اور اُن کے لوگ منہ پر بُرا بھلا کہتے تھے۔ اور حضرت حسنؓ اس کے باوجود کبھی ایک حرفِ شکایت بھی منہ پر لائے بغیر ہر سال دمشق جا کر مقررہ وظائف و تحائف انہی حضرت معاویہؓ کے ہاتھ سے وصول کیا کرتے تھے۔ کیسے ممکن ہے کہ اتنی نامناسب بات، جو شرائط صلح کے بھی خلاف تھی حضرت معاویہ اور ان کے حکام کے طرزِ عمل میں شامل رہے اور حضرت حسنؓ ۹۔۱۰ سال تک[2] اسے خاموشی سے برداشت ہی نہ کرتے رہیں بلکہ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں سالانہ حاضری بھی دیتے رہیں اور اُن سے تحائف و وظائف لینا گوارا کرتے رہیں؟

ابن اثیر ہی نے دارا بجرد کے خراج کے سلسلے میں اہلِ بصرہ کے اعتراض کی بابت یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس میں خود حضرت معاویہ کا اشارہ بھی شامل تھا۔ مگر اس کا کوئی ثبوت؟ نہ ثبوت ہے نہ تک۔ حالانکہ اگر اس بیان میں کچھ واقعیت ہوتی تو نہ تو یہ ممکن تھا کہ حضرت حسنؓ کو مصالحت کے وقت سے لے کر اپنی وفات تک (۹۔۱۰ سال کے عرصے میں) اس کا پتہ نہ چلتا جبکہ یہ بھی کوفے کی طرح آپ کی اور آپ کے والد ماجد کی عملداری کا حصہ رہا تھا، اور نہ ہی یہ بات قابل تصور ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے آپ چھ ہزار سالانہ کی جگہ ایک ہزار سالانہ پر خوشی سے راضی رہتے ۔۔۔ اور حضرت حسنؓ کے بارے میں اگر کسی طرح اُن کی نرم طبیعت وغیرہ کے حوالے سے شرائطِ صلح کی یہ سب مبیّنہ کھلی اور چھپی خلاف ورزیاں قابلِ تحمل بھی مان لی جائیں تو حضرت حسینؓ کے بارے میں تو یہ تصور قطعی ہو یہ

---

[1] ج ۳ ص ۲۰۳ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۹۷۸ء [2] صلح ۴۱ھ میں ہوئی اور حضرت حسنؓ کی وفات ۵۰ھ میں۔

ناقابلِ قبول ہے۔ اُن کا مزاج بالکل مختلف تھا، وہ سرے سے صلح کے ہی روادار نہ تھے لیکن حضرتِ حسن کے فیصلے سے مجبور ہو گئے تھے، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:۔

"جب خلافت حضرتِ حسنؓ کے ہاتھ میں آئی اور انھوں نے مصالحت کا فیصلہ کیا تو حضرت حسینؓ کو یہ فیصلہ بہت شاق گزرا۔ وہ اپنے بھائی کی رائے کو بالکل صحیح نہیں سمجھتے تھے اور مُصر تھے کہ اہلِ شام سے قتال جاری رہے (اُن کا اصرار اور صلح کی مخالفت یہاں تک بڑھی کہ) حضرت حسن کو کہنا پڑا کہ میں سوچتا ہوں کہ تمھیں گھر میں بند کر دوں اور جب تک مصالحت کی کارروائی سے پوری طرح فارغ نہ ہو جاؤں باہر نہ نکالوں[1]"۔

ایک روایت میں اس اختلاف رائے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرتِ حسینؓ نے صلح کی بات سن کر حضرت حسنؓ سے کہا کہ "میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اپنے باپ کو جھوٹا اور معاویہ کو سچا مت ٹھہرایئے، اس پر حضرت حسنؓ نے یہ کہہ کر اُن کو خاموش کیا کہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں[2]۔

الغرض حضرت حسین کا مزاج بالکل مختلف تھا، اُن کے لئے کسی بھی طرح نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ ایسے حالات و معاملات کے ہوتے ہوئے حضرت معاویہ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا گوارا کر سکتے تھے، حالانکہ اسی البدایہ والنہایہ میں مذکورہ بالا بیان کے بعد مذکور ہے کہ:۔

"حسن کا یہ رویہ دیکھ کر حسین نے خاموشی اور موافقت اختیار کر لی۔ اور پھر جب خلافت کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ کے ہاتھ میں آگئی تو اپنے بھائی حسن کے ساتھ حسین بھی معاویہ کے پاس آتے جاتے تھے اور معاویہ دونوں کا غیر معمولی اکرام فرماتے تھے، مرحبا و اہلاً سے استقبال فرماتے، اور بڑے بڑے عطیات دیتے[3]"۔

حتیٰ کہ حضرتِ حسن کا انتقال (۴۹ھ میں) ہو گیا تب بھی حضرت حسین نے حضرت معاویہ کے پاس سالانہ تشریف بری کا معمول تن تنہا ہی قائم رکھا[4]۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳ [2] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۳ [3] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳

[4] ولما توفی الحسن کان الحسین یفد الی معاویہ فی کل عام فیعطیہ ویکرمہ، حوالہ سابق۔

الغرض حضرت معاویہؓ اور حضرات حسنینؓ کے درمیان جو حسنِ تعلق کی صورت اور بالخصوص حضرت معاویہ کی طرف سے اکرام و عطا کی جو روش ان کی خلافت کے پورے عرصے میں برقرار رہی وہ نہ صرف اس الزام کی قطعی تردید کرتی ہے کہ حضرت معاویہ نے شرائط صلح کا احترام نہیں کیا تھا بلکہ اُن بیانات کے لئے ایک تصدیق بھی فراہم کرتی ہے جو حضرت معاویہؓ کے حلم و عفو اور داد و دہش کے غیر معمولی اوصاف کے سلسلے میں مؤرخین کے یہاں ملتے ہیں[1]۔
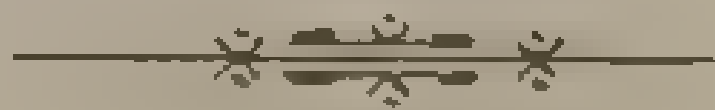
[1] مثلاً حضرت علیؓ کے دست راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے جو طبری نے نقل کیا ہے کہ "میں نے حکومت کیلئے معاویہؓ سے بڑھ کر موزوں آدمی نہیں دیکھا کہ لوگوں کے ساتھ بجد کشادہ دلی کا برتاؤ کرتے تھے" (ج ۶ صـ۱۸۸) یا خود حضرت معاویہؓ کا قول اپنے بارے میں جو حلم و عفو کی ایک آزمائش کے موقع پر ان کی زبان پر آیا کہ "مجھے گوارا نہیں کہ کوئی خطا میرے عفو سے بڑھ جائے اور کوئی جہالت میرے حلم سے یا کسی کی کوئی کمزوری ایسی کھلی ہو جائے جس کی میں پردہ داری نہ کرسکوں اور کسی کی بدسلوکی ایسی جس کا جواب میں حسن سلوک سے نہ دے سکوں" (ایضاً صـ۱۸۷) ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ ج ۸ میں پورے ایک صفحے (۱۴۸) پر حضرت معاویہ کے اسی وصف میں متعدد بیانات اور واقعات نقل کئے ہیں اور اپنے طور پر ان الفاظ میں ان کی ثنا بیان کی ہے کہ "یعنی انہ کان جید السیرۃ حسن التجاوز جمیل العفو کثیر الستر رحمہ اللہ مختصر یہ وہ عمدہ سیرت کے مالک، نہایت اعلیٰ عفو درگزر کرنے والے اور عیوب کی بہت ہی پردہ داری کرنے والے تھے (ج ۸ صـ۱۲۷)

بابِ دوم

کوفی مزاج ــــ ریشہ دوانیاں ــــ اور حضرت حسینؓ

اہلِ کوفہ

حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہ تھوڑی سی گفتگو بالکل ضمناً آگئی ورنہ اصل مدعا تو اُن حالات اور اسباب کی تحقیق تھی جن کے نتیجے میں حضرت معاویہ کا بیس سالہ پُر امن و پُر سکون دور ختم ہوتے ہی واقعۂ کربلا جیسا سانحہ وجود میں آگیا۔ اسی تحقیق کے سلسلے میں اہلِ کوفہ کے مزاج و کردار کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

کوفہ کی بنیاد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت سعد بن وقاص کے ہاتھوں سے پڑی تھی۔ وہ مختلف عرب قبائل جو عراق کے محاذ پر مصروفِ جہاد تھے انہی کے خاندانوں سے یہ نیا شہر آباد کیا گیا۔ اور اس طرح یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی چھاؤنی اور اُن کی جنگی طاقت کا مرکز بن گیا۔ لیکن اس خصوصیت کے ساتھ اس شہر کی یہ خصوصیت بھی رہی کہ اس کے شہریوں میں بڑی تلوّن مزاجی اور بے سرے پن کی سی کیفیت پائی جاتی تھی۔ اپنے حکّام سے بہت جلدی ناراض ہو جاتے اور مرکز سے شکایتیں کر کے نئے حاکم کا مطالبہ کرنے لگتے تھے۔ یہ حال حضرتِ عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں رہا۔ حضرت علیؓ کا زمانہ آیا تو آپ نے مدینہ چھوڑ کر اسی شہر کوفہ کو مرکزِ خلافت بنایا۔ اور یہیں کے لوگوں پر اُن کی طاقت کا اصل انحصار ٹھہرا۔ مگر ایک سال بھی نہیں گزرنے پایا کہ اُن کی تلوّن مزاجی، انتشار پسندی اور بے استقامتی ایسا رنگ دکھانے لگی کہ حضرت علیؓ نے اپنا

باقی وقت اُن کے ساتھ رو رو کر پورا کیا۔ آپ کے اُس دور کے خطبوں میں بار بار ایسے جملے ملتے ہیں کہ "سب سے بڑا دھوکہ کھانے والا وہ ہے جس نے تم پر اعتماد کر لیا۔"

ایک خطبہ میں ہے:۔

ایتھا الفرقۃ التی اذا امرتُ لم تطع واذا دعوت لم تجب ان اُمهلتم خضتم وان حوربتم خرتم وان اجتمع الناس علیٰ امام طعنتم..... لا ابا لغیرکم[1]	اے وہ گروہ کہ جب بھی میں نے کسی بات کا حکم دیا اُس نے نافرمانی کی، اور جب کسی کام کی طرف بلایا لبیک نہ کہی۔ ذرا مہلت مل جاتی ہے تو فضولیات میں لگ جاتے ہو۔ اور جب دشمن حملہ آور ہو تو بزدلی دکھاتے ہو۔ اور جب لوگ کسی امام پر جمع ہو جائیں تو تم کیڑے نکالتے ہو۔ ہائے افسوس تم پر۔

یہی لوگ تھے کہ حضرت علی کی زندگی میں جنگ سے جی چراتے اور آپ کے احکام سے سرتابی کرتے رہے اور جب حضرت حسنؓ نے مصالحت کی تو اُن کے خیمے پہ حملہ کر دیا۔ سامان بھی لوٹا اور زخم بھی لگایا۔[2] ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا حضرت معاویہ کے ساتھ کیسے گزارا ہو سکتا تھا چنانچہ حضرت معاویہؓ کے حلم نے اگر کہیں جواب دیا تو یہ کوفے والوں ہی کے ساتھ ہوا۔

الغرض اس امن و امان اور اسلامی جمعیت کی بحالی کے دور میں اگر کہیں سے کچھ خلفشار پیدا کرنے کی خواہش اور جستجو ہوتی رہی تو وہ کوفے ہی کی سرزمین سے تھی۔ حضرت حسینؓ کے متعلق ان لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ مصالحت سے خوش نہ تھے، بس حضرت حسنؓ کے دباؤ سے مجبور ہو گئے تھے۔ جیسا کہ اس سلسلے میں اوپر تاریخی بیان گزر چکا ہے۔ حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد ان لوگوں نے سمجھا کہ اب حضرت حسین کو آمادۂ جنگ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ ج ۲ ص۱۰۱ (دار المعرفۃ) [2] طبری ج ۶ ص۹۳ ابن اثیر ج ۳ ص۲۰۳

چنانچہ البدایہ والنہایہ کی روایت کے مطابق :-

وقدم المسیّب بن عتبہ الفزاری فی عدۃٍ معہ الحسین بعد وفاۃ الحسن فدعوہ الی خلع معاویۃ[1]	مسیّب بن عتبہ فزاری حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد مع اور کئی آدمیوں کے حضرت حسینؓ کے پاس آیا اور ان لوگوں نے آپ کو حضرت معاویہ کی بیعت توڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

پھر یزید کے لئے ولی عہدی کی بیعت کا قصّہ کھڑا ہوا تب ان لوگوں نے از سر نو یہی کوشش کی۔

لمّا بایع النّاس معاویۃ لیزید کان حسین ممّن لم یبایع لہٗ، وکان اھل الکوفۃ یکتبون الیہ یدعونہٗ الی الخروج الیھم فی خلافۃ معاویۃ[2]۔	جب لوگوں نے (عام طور پر) یزید کے لئے حضرت معاویہ سے بیعت کر لی تو حضرت حسینؓ ان لوگوں میں تھے جنھوں نے نہیں کی اور (اسی بنا پر) اہلِ کوفہ حضرت معاویہ کے زمانے میں حضرت حسین کو لکھتے رہے تھے کہ (مدینے سے نکل کر) اُنکے پاس آ جائیں۔

آگے ابن کثیر لکھتے ہیں :-

کل ذالك یأبیٰ علیھم[3]۔	حضرت حسین نے ہر بار ہی ان کی اس بات کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

حضرت حسین کی رائے

لیکن حضرت حسین کے اس انکار سے یہ سمجھ لینے کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ کی

---

[1] ج ۸ ص ۱۲۵ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۲۵ [3] ایضاً

اُس رائے میں تبدیلی آگئی تھی جس رائے کی بنا پر آپ نے اپنے برادر بزرگ حضرت حسن کی مصالحت پسندی سے اختلاف فرمایا تھا۔ بلکہ دوسرے تاریخی بیانات کی روشنی میں نظر آتا ہے کہ آپ کی رائے میں تو کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ البتہ جو بیعت آپ حضرت حسن کے ساتھ حضرت معاویہ سے کر چکے تھے یا تو اس کا احترام آپ کو کسی ایسے اقدام سے مانع تھا جسکی طرف اہلِ کوفہ بلاتے تھے۔ یا مصلحت نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ایسا اقدام کیا جائے۔ تاریخ کے بیانات سے دونوں ہی امکانات سامنے آتے ہیں۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ جب کوفیوں نے حضرت حسین کے پاس فتنہ انگیز آمد و رفت شروع کی تو مدینے کے گورنر مروان نے حضرت معاویہ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے خطرات کی پیش بندی کی طرف توجہ دلائی اس پر حضرت معاویہ نے حضرت حسین کو لکھا کہ :۔

انّ من اعطیٰ اللّٰہ صفقتہ	جس شخص نے اللہ کو قول و قرار دیا ہو اسکو
یمینہ وعہدہ لجدیر بالوفاء	لائق ہے کہ وفائے عہد کرے، مجھے اطلاع
وقد أنبئت ان قومًا من	دی گئی ہے کہ کوفے کے کچھ لوگوں نے تمہیں فتنہ
اھل الکوفۃ قد دعوک الی	آرائی کی دعوت دی ہے حالانکہ یہ اہلِ عراق
الشقاق واھل العراق من قد	وہ ہیں جن کو تم خوب جانتے ہو کہ انھوں نے
جرّبت قد افسد واعلی ابیک	تمہارے باپ اور بھائی کو کس فساد میں ڈالا
وأخیک فاتق اللّٰہ واذکر المیثاق	پس اللہ سے ڈرو، عہد یاد رکھو اور یہ کہ اگر تم نے
فانک متی تکدنی اکدک[1]۔	میرے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو میں بھی اٹھاؤں گا۔

اس خط پر حضرت حسین کا جواب یہ نقل کیا گیا ہے کہ :۔

اتانی کتابک وانا بغیر الذی	تمہارا خط ملا۔ معلوم ہونا چاہئے کہ
بلغک عنّی جدیرٌ والحسنات	میرا حال اُس سے مختلف ہے جو تمھیں

---

[1] ج ۸ ص ۱۶۵

لا یہدی لہا الا اللہ۔ وما اردت لك محاربۃ ولا علیك خلافا وما اظن لی عند اللہ عذرا فی ترك جہادك وما اعلم فتنۃ اعظم من ولایتك امر ہذہ الامۃ۔[1]	میرے تعلق معلوم ہوا ہے۔ اور یہ بس اللہ کا فضل ہے جس کے سوا نیکیوں کی ہدایت دینے والا اور کوئی نہیں ہیں تمہارے خلاف کسی محاذ آرائی اور مخالفت کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔ اگرچہ میں نہیں جانتا کہ تمہارے خلاف جہاد نہ کرنے کیلئے میرے پاس اللہ کے سامنے کیا عذر ہوگا۔ اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر فتنہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں اس امت کی سربراہی ہو۔

اس جواب کے سخت لہجے کے باوجود یہی اندازہ ہوتا ہے ـــــ خاص کر پہلے فقرے کی روشنی میں ـــــ کہ حضرت حسین کیلئے اصلاً یہی بیعت مانع تھی اور اس کو توڑ ڈالنے کا خیال آپ نے اپنے آپ سے بعید۔ اور اپنے لئے نازیبا قرار دیا تھا۔ لیکن کوئی شخص آخری فقروں کا سہارا لے کر کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ بیعت کا خیال مانع نہیں تھا بلکہ بات مصلحت وقت کی تھی جو مانع ہو رہی تھی یعنی حضرت معاویہ کے اقتدار کے استحکام کو دیکھتے ہوئے کسی مخالفت اقدام کی کامیابی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اور شیعہ حضرات یہی کہتے ہیں، کیونکہ وہ تو سرے سے بیعت ہی کا انکار کرنا چاہتے ہیں حیاۃ الامام الحسین (عربی) جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، کے شیعہ مصنّف باقر شریف القرشی لکھتے ہیں کہ:۔

ولم یکن من رأی الامام الخروج علی معاویۃ، وذالك لسلمۂ بفشل الثورۃ وعدم نجاحہا۔[2]	امام (حسینؓ) کی رائے میں معاویہ کے خلاف خروج مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کامیابی نہیں ہوگی۔

---

[1] ایضاً [2] حیاۃ الامام حسین ج ۲ ص ۲۳۰

اس کے بعد اخبار الطوال (ص ۲۰۳) اور انساب الاشراف (ج اق ا) کے حوالے سے آپ کا یہ خط بھی نقل کیا ہے جو اہلِ کوفہ کی طرف سے خروج کی دعوت کے جواب میں لکھا گیا تھا:۔

...... واما انا فلیس رأیی الیوم	اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو فی الحال میری
ذالک، فالصقوا رحمکم اللہ	رائے اسکی (خروج کی) نہیں ہے پس تم لوگ
بالارض واکمنوا فی البیوت	جب تک کہ معاویہ زندہ ہیں زمین سے
واحترسوا من الظنۃ مادام	چپکے رہو، گھروں میں قرار پکڑو اور کسی طرح
معاویۃ حیًّا فان یحدث اللہ	کے شک و شبہ کا ماحول مت پیدا کرو۔ ہاں
بہ حدثًا وانا حیٌّ کتبت الیکم	اگر معاویہ کو کچھ ہو گیا اور میں اُس وقت
برأیی۔[1]	زندہ ہوا تو میں تمہیں اپنی رائے سے آگاہ
	کروں گا۔

اس خط کا انداز بتا رہا ہے اُن لوگوں کی تائید میں جا رہا ہے جو سمجھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کا عدمِ خروج بر بنائے حالات و احتیاط تھا، نہ کہ اُس بیعت کے احترام میں جو آپ نے حضرت حسنؓ کے ساتھ حضرت معاویہ کے ہاتھ پر کی تھی۔

بہرحال جو بھی واقعہ ہو، اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت حسینؓ کا یہ رویہ بس حضرت معاویہ کی زندگی تک کے لئے تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد کے لئے جب بطور ولی عہد اپنے بیٹے یزید کا تقرر کیا اور چاہا کہ لوگ اسے قبول کر لیں تو حضرت حسینؓ کا اس کو قبول کرنے اور یزید کے لئے بطور ولی عہد بیعت کرنے سے انکار اسی بات کی ایک علامت تھی کہ وہ اپنے آپ کو آئندہ کسی اقدام کے لئے آزاد رکھنا چاہتے تھے، اور اس میں کچھ نہ کچھ دخل کوفیوں کا بلا شبہ تھا۔

---

[1] جلاء العیون، م حسینؓ ج ۲ ص ۲۳
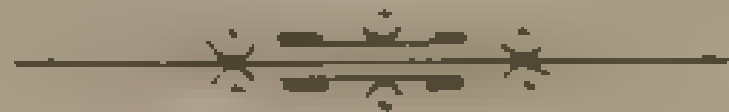
باب سوم

یزید کی ولی عہدی کی تجویز اور حضرت مغیرہ رضؓ بن شعبہ

مؤرخین (طبری ۔ ابن اثیر ۔ ابن کثیر وغیرہ) کے بیان کے مطابق ۵۶ھ میں (یعنی اپنے انتقال سے ۴ سال پہلے) حضرت معاویہ نے طے کیا کہ اپنے بعد زمام خلافت سنبھالنے کے لئے یزید کو نامزد کر جائیں ۔ اور اس نامزدگی کے لئے رعایا سے رضامندی بھی حاصل کر لیں جس کی شکل اُس زمانے میں بیعت تھی ۔ تاکہ بعد میں کوئی جھگڑے قضیے کی صورت نہ پیدا ہو ۔ حضرت معاویہ کی اس کوشش کی بابت آتا ہے کہ :-

وفیہا : دعا معاویۃ الناس الی	اور اسی سنہ (۵۶) میں معاویہ نے تحریک
البیعۃ لیزید ولدہ ان یکون	کی کہ لوگ انکے بعد کے لئے انکے بیٹے یزید کی
ولی عہدہ من بعدہ	ولی عہدی کے لئے بیعت کریں ......
فبایع لہ الناس فی سائر	پس تمام اقلیموں میں لوگوں نے اس کیلئے
الاقالیم الا عبد الرحمٰن بن	بیعت کر لی سوائے عبد الرحمٰن بن ابی بکر
ابی بکر و عبد اللہ بن عمر و الحسین	کے اور سوائے عبد اللہ بن عمر، حسین بن
بن علی و عبد اللہ بن زبیر	علی، عبد اللہ بن زبیر اور عبد اللہ بن
و ابن عباس۔[1]	عباس کے ۔

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۷۹

جہاں تک یزید کی ولی عہدی کا تعلق ہے وہ ایک یقینی واقعہ ہے۔ اسی طرح حضرت حسین کا اس کو قبول کرنے سے انکار بھی ایک قطعی واقعہ ہے۔ مگر ان دونوں باتوں کی جو تفصیلات ہماری تاریخی کتابوں میں آتی ہیں اُن میں ایک بڑا حصہ ناقابلِ یقین ہے۔ یہ تفصیلات چونکہ خوب شہرت پا چکی ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ اس موقع پر تھوڑی سی گفتگو ان تفصیلات پر ہو جائے۔

ولی عہدی کی تجویز

یزید کو ولی عہد بنائے جانے کی تجویز کے سلسلے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ تجویز صحابی رسولؐ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے پیش کی تھی۔ اور اُس کا پس منظر خالص ایک خود غرضانہ اور نفس پرستانہ پس منظر تھا۔ ایسی خود غرضی اور نفس پرستی کہ اس میں اسلام اور ملت اسلام کی دشمنی بھی اُنھیں بخوشی منظور ہوئی[1] (العیاذ باللہ!)

حضرت مغیرہؓ کا مقام صحابیت

یہ مغیرہ بن شعبہ کون ہیں؟ اُن اصحاب کرام میں سے ہیں جنھیں ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت رضوان میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے[2]۔ یہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اصحاب نبیؐ کی وہ بیعت ہے جس کے بارے میں قرآن پاک نے بشارت دی کہ:

لقد رضی اللہ عن المؤمنین	بے شک اللہ راضی ہوا ہے ان مسلمانوں
اِذ یبایعونک تحت الشجرۃ۔	سے جب کہ وہ درخت کے نیچے تمھارے
سورہ ۴۸ (الفتح) آیت ۱۸	ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔

اور پھر اس صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت مغیرہ صرف شرکائے بیعت ہی میں نہ تھے بلکہ اُن کا

---

[1] روایت کی تفصیل آگے آتی ہے۔ [2] الاصابہ لابن حجر ج ۶ ص ۱۳۱ سیر اعلام النبلاء از علامہ ذہبی ج ۳ ص ۲۱ (بیروت) البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۴۸-۵۲

ایک اور خاص قابلِ ذکر کردار بھی اس موقع پر تھا جو اُن کے ایمانی مرتبے کا اظہار کرتا ہے، وہ کردار یہ ہے کہ اس صلح کے موقع پر قریش مکہ کی طرف سے جو صاحب سفیر ہو کر گفتگو کے لئے آئے تھے وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے چچا عروہ بن مسعود ثقفی تھے۔ عروہ بن مسعود نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو اُن کا ہاتھ بڑھ بڑھ کر بار بار آنحضرت کی ریش مبارک تک پہنچتا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ تلوار لئے اور آہنی خود پہنے، جس میں چہرہ بھی چھپا ہوا تھا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے برابر کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے چچا کے اس طرزِ گفتگو پر تڑک کر بولے کہ "اپنا ہاتھ روک لو قبل اسکے کہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھو"۔ عروہ بن مسعود جو طائف اور مکّے کی نہایت مؤقر شخصیت تھے۔ اس جملے پر سنّاٹے میں آگئے۔ آنحضرتؐ سے مخاطب ہو کر بولے کہ محمد! یہ کون شخص ہے؟ کسقدر بے تکی زبان میں بات کرتا ہے! آنحضرتؐ نے فرمایا "آپ ہی کا بھتیجا ہے"[1] ــــ اور یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ کوئی ایسے چچا بھتیجے تھے جن کے آپس کے تعلقات اچھے نہ رہے ہوں گے۔ نہیں، ان کے آپس کے تعلقات نہایت اچھے تھے جس کی شہادت عروہ کا اگلا جملہ دیتا ہے۔ عروہ آنحضرت کا جواب سن کر حضرت مغیرہ کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے "اچھا یہ تم ہو، دھوکہ باز! جس کے کئے کو کل ہی میں نے بھرا ہے"[2] ــــ یہ اشارہ تھا اس واقعے کی طرف کہ حضرت مغیرہ جو ابھی کچھ دن پہلے اسلام لائے تھے اُس سے متصلاً پہلے انھوں نے ایک سفر میں اپنے ساتھیوں کی کسی بات پر خفا ہو کر اُن سب کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ عروہ بن مسعود نے ان سب کی دِیت اپنے پاس سے ادا کر کے معاملے کو ختم کیا تھا۔

حضرت مغیرہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ جب ان کے شہر (طائف) والے مسلمان ہوئے تو ان کے مخصوص بُت "لات" کا بُت خانہ توڑنے کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جن دو اشخاص کو بھیجا تھا اُن میں سے ایک یہی حضرت مغیرہ تھے[3]۔

سنہ ۹ھ ہی میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ غزوہ تبوک ہوا ہے،

---

[1] سیر اعلام النبلاء ج ۳ صفحہ ۲۵ [2] ایضاً [3] الاصابہ ج ۶ صفحہ ۱۳۲

یہ غزوہ اپنی چند در چند سختیوں اور دشواریوں کی وجہ سے "غزوۂ عسرت" بھی کہلایا ہے، اور اسی حوالے سے اللہ تبارک وتعالےٰ نے اس کے شرکاء پر اپنی عنایت خاص کا اعلان بھی قرآن پاک کی سورہ ۹ (التوبہ) میں بایں الفاظ فرمایا ہے:-

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ	اور اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی نبی پر
وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ	اور مہاجرین وانصار پر کہ جنھوں نے
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ	تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا تھا
الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ	جبکہ ان میں سے بعض کے دل کج ہوئے
قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ	جا رہے تھے پھر اللہ نے اُن پر بھی نظر
عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ	رحمت فرمائی بے شک وہ ان کے لئے
رَّحِيْمٌ (آیت ۱۱۷)	رؤف اور رحیم ہے۔

حضرت مغیرہ کو اس غزوہ میں شرکت کا بھی شرف حاصل تھا اور وہ مہاجرین کے زمرے میں تھے۔ حضرت مغیرہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سو سے اوپر احادیث مروی ہیں۔ اِسی غزوۂ تبوک کے موقع کی بھی ایک روایت چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے کی ان سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور مؤطا امام مالک وغیرہ میں مروی ہوئی ہے، کہیں غزوۂ تبوک کے ذکر کے ساتھ اور کہیں بغیر اس کے ذکر کے[1]

حضرت مغیرہؓ خلفائے راشدین کے دور میں

دورِ نبویؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں بھی وہ ایک معتمد شخصیت اور مہمات میں نمایاں رہے[2] شجاعت میں بھی مرد تھے اور تدبیر وحکمت اور فطانت وذہانت میں بھی فرد،

---

[1] دیکھئے سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۲ مع حاشیہ

[2] الاصابہ میں لکھا ہے کہ شہد الیمامۃ ط ۱۳ وبعثہ ابوبکر الصدیق الی اہل الحیرۃ ص ۱۳۲

علامہ ذہبی لکھتے ہیں:۔

من کبار الصحابۃ اولی الشجاعۃ	بڑے درجے کے صحابہ میں سے تھے۔
والمکیدۃ شھد بیعۃ الرضوان۔	صاحبِ شجاعت بھی اور صاحبِ حکمت و تدبیر بھی۔[1]

غیر معمولی ذہانت اور اصابت رائے کی بنا پر "مغیرۃ الرائی" کہلاتے اور مدبّرین عرب میں شمار ہوتے تھے۔[2] حضرت عمر فاروق رضؓ کے دور میں بھی وہ معتمد رہے۔ بحرین کے گورنر بنائے گئے۔ بصرے کی گورنری پر رہے۔ اور پھر کوفے کی۔[3] بصرے کی گورنری کے زمانے میں اُن پر ایک سنگین اخلاقی الزام لگا۔ حضرت عمرؓ نے معزول کر کے شہادت طلب کی۔ شہادت ناکام ہوئی تو روایت میں ہے کہ:۔

فکبّر عمر۔	حضرت عمرؓ نے (خوشی سے) تکبیر کہی۔[4]

اور اُس کے بعد جب پھر ایک موقع آیا کہ کوفے کی گورنری کے سلسلے میں حضرت عمر سخت پریشان تھے جس آدمی کو بھی وہاں بھیجتے وہ ناکام ہوتا۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر گزرا سخت بے سرے لوگ تھے۔ اِدھر کوئی حاکم پہنچا اور اُدھر انھوں نے اس کے خلاف شکایتوں کا سلسلہ شروع کیا تو اس موقع پر آپ نے گہرے غور و فکر اور مشاورت کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ ہی کا انتخاب کیا۔

اسلامی انتظامیہ کا ایک اہم اصول اور حضرت مغیرہؓ

اس مشاورت و انتخاب اور اس کے پس منظر کی تفصیل بجائے خود بڑی بصیرت افروز ہے اور اسلامی انتظامیہ (ADMINISTRATION) کا ایک نہایت اہم اصول اس کے ذریعہ

---

[1] سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۱ [2] اصابہ ج ۴ ص ۱۳۱ اعلام ج ۳ ص ۲۲

[3] اصابہ ص ۱۳۱-۱۳۲ [4] اعلام ج ۳ ص ۲۵

ہمارے سامنے آتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عمّار بن یاسر کو کوفے کی گورنری پر بھیجا۔ حضرت عمّار اُن سابقین اوّلین میں ہیں جنھوں نے بڑی مصیبتیں اسلام کی راہ میں اُٹھائی ہیں۔ مگر کوفے والے تو بس کوفے والے، فوراً ہی شکایتیں شروع کر دیں۔ نہ صرف یہ شکایت تھی کہ نااہل ہیں بلکہ یہ بھی کہ امانت و دیانت سے بھی خالی ہیں[1]۔ حضرت عمرؓ نے واپس بلا لیا اور کہا کہ عمّار میں جانتا تھا کہ یہ کام تمھارے بس کا نہ ہوگا۔ مگر میرا دھیان اس آیتِ قرآن کی طرف گیا جس میں ارشادِ حق ہے کہ:۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ	اور ہم ارادہ کرتے ہیں کہ اُن لوگوں
اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ	پر احسان کریں جن کو کمزور بنا کر
وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ	رکھ لیا گیا ہے پس اُن کو سربراہی دیں
الْوَارِثِينَ ٥ سورہ ۲۸ (قصص) آیت ۵	اور زمین کی وراثت بخشیں۔

اس لئے میں نے تم کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد کوفے کے وفد سے پوچھا کہ اچھا تم بتاؤ کس کو چاہتے ہو۔ انھوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کا نام لیا۔ یہ بھی بڑے پائے کے صحابی تھے اِن لوگوں کے اپنے بھی تھے۔ مگر سال بھر مشکل سے گزرا کہ ان کے خلاف بھی شکایت شروع ہو گئی اور اور حضرت عمر نے اِن کو کوفے سے ہٹا کر بصرے بھیج دیا[2]۔ اور اب اس خالی جگہ کے لئے فکرمند تھے کہ کیا کریں کس کو بھیجیں۔ مسجد میں جا کر لیٹے اور نیند آگئی۔ اسی حالت میں حضرت مغیرہ بن شعبہ وہاں پہنچ گئے۔ حضرت عمر بیدار ہوئے تو انھوں نے اپنی قیافہ شناسی کے ماتحت کہا کہ آپ کچھ زیادہ ہی فکرمند معلوم ہوتے ہیں خیریت تو ہے۔ حضرت عمر نے قصہ بتایا۔ اسی دوران میں اہلِ شوریٰ بھی آ گئے[3]۔ اُن کے دریافت کرنے پر کہ معاملہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ:۔

اِنَّ اھل الکوفۃ قد عضلونی	اہلِ کوفہ نے مجھے بڑے جھمیلے میں ڈال دیا ہے۔

---

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶ [2] ایضاً [3] ابن اثیر کے الفاظ میں وَاَتَاہُ اَصْحَابُہٗ۔

اور پھر نئے تقرر کے سلسلے میں مشورہ طلب کرتے ہوئے اُن حضرات سے فرمایا کہ مسئلہ میرے سامنے یہ ہے کہ حکام اور والیان کے تقرر کے سلسلے میں کیا اصول برتوں؟ اعلیٰ اسلامی صفات والے کو ترجیح دوں اگرچہ وہ انتظامی لحاظ سے کمزور ہو؟ یا انتظامی لحاظ سے مضبوط اور اہل افراد کو ترجیح دی جائے اگرچہ وہ اسلامی صفات کے لحاظ سے اعلیٰ مقام کے نہوں بس میانہ رو ہوں آپ کے الفاظ جو روایت میں نقل ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔

ما تقولون فی تولیۃ رجل ضعیفٍ مسلم او رجل قوی مسدد؟

اس پر جواب دینے والے حضرت مغیرہ تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ:۔

امّا الضعیف المسلم فانّ اسلامہٗ لنفسہٖ وضعفہ علیک وعلی المسلمین وامّا القوی المسدد فانّ سدادہٗ لنفسہٖ وقوتہٗ لک وللمسلمین۔[1]	امیرالمؤمنین! جہاں تک (انتظامی اعتبار سے) کمزور مگر اچھے اعلیٰ درجے کے مسلمان کا سوال ہے تو اس کی اسلامیت کا فائدہ تو اسکی ذات کو پہنچے گا مگر اسکی کمزوری کا نقصان آپ کو اور مسلمانوں کو، اسکے برعکس بس میانہ رو مگر مضبوط فرد ہو تو اسکی میانہ روی اسکے لئے ہوگی اور مضبوطی آپ کے اور عامۂ مسلمین کیلئے

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب مذکورۂ بالا سوال اہل مشورہ کے سامنے رکھا تھا تو اُن کا اپنا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ اور وہ جو شکایت اُن سے مروی ہے کہ یا اللہ کیا کروں متقی ملتا ہے تو منتظم نہیں ہوتا اور جو منتظم ہوتا ہے اُس میں تقویٰ نہیں ملتا، اس شکایت اور تجربے کے نتیجہ میں بالآخر وہ یہی طے کرنے پر مائل ہو گئے تھے کہ تقوے کو کم اور انتظام کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر جو کہ آپ کی وفات سے دو ڈھائی سال پہلے

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶

(یعنی ۲۱ھ) کا واقعہ ہے، حضرت مغیرہ کا جواب سننے کے بعد آپ نے گویا اسی کو قبول کرلیا۔ اور حضرت مغیرہ ہی کیلئے طے کردیا کہ وہ کوفے کی ذمہ داری سنبھالیں روایت کے الفاظ ہیں:۔

فولّی المغیرۃ الکوفۃ فبقی علیہا حتی مات عمر وذالک نحو سنتین او زیادۃ۔[1]	پس آپ نے کوفے کی ولایت مغیرہ ہی کے سپرد کردی اور وہ اس عہدے پر رہے حتی کہ حضرت عمر نے وفات پائی اور یہ کوئی دو سال یا کچھ زیادہ کی مدت ہوئی۔

حضرت مغیرہؓ کی دوسری عظمت

حضرت مغیرہؓ کی ایک عظمت وہ تھی جو سورۂ توبہ اور سورۂ فتح کی اُن قرآنی آیات سے ثابت ہوتی ہے جن کا حوالہ اوپر گزرا اور جن کی رو سے حضرت مغیرہ ایک طرف اُن (چودہ سو) سر فروش انسانوں میں سے ہیں جن سے پروردگار عالم نے اپنی خوشنودی کا اعلان صلح حدیبیہ کے موقع پر فرمایا۔ اور دوسری طرف اُن تیس ہزار قربانیر داروں کی فہرست میں بھی اُن کا نام ثبت ہے جن کو پروردگار نے غزوۂ عسرت کی صعوبتیں اُٹھانے پر مہر و کرم کی ایک خصوصی نظر سے سرفراز فرمایا۔ یہ اُن کی ایک (اور سب سے بلند تر عظمت تھی، دوسری عظمت اوپر کے واقعہ سے سامنے آتی ہے کہ حدیبیہ اور تبوک کی سرفرازیاں حاصل ہونے کے باوجود ان کیلئے یہ بات ذرا بھی پریشان کن نہیں ہوئی کہ حضرت عمرؓ جس گفتگو کے سیاق و سباق میں اُن کو کوفے کی حکومت دے رہے ہیں اُس کی رو سے اُن کا درجہ ایک ذرا کم متقی مسلمان کا ہوا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ انھوں نے تو گویا خود اپنے ہی ہاتھ سے اپنے اوپر کم متقی مسلمان کا لیبل لگا لیا۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام سب ایک درجے کے نہیں تھے۔ تقویٰ و طہارت میں بھی اُن کے درجات مختلف تھے۔ اور اسے بس اُن کی عظمت کی بات کہا جا سکتا ہے کہ ایسی ایسی

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۷

قرآنی بشارتوں سے سرفرازی کے باوجود اُن میں سے اگر کوئی اپنے آپ کو تقویٰ و طہارت اور تدیّن میں مقابلۃً کمتر دیکھتا تھا تو بے تکلف اپنے آپ کو کمتر ہی جانتا اور کمتر سمجھے جانے پر راضی ہوتا تھا۔ اللہ کی طرف سے ملے خوشنودیوں کے تمغوں پر نظر کر کے غرّے میں نہیں مبتلا ہوتا تھا۔ البتہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ......ولکن سدّدوا وقاربوا[1]۔ پر نظر کر کے اللہ سے آخرت میں عفو و عنایت کی امید رکھتا تھا۔

بدنام کن روایت کا متن

شیعہ حضرات سوائے تین چار کے تمام اصحاب نبیؐ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گئے تھے بلکہ سابقین اولین ابوبکر و عمر اور عثمان وغیرہ تو شروع ہی سے معاذاللہ منافق تھے۔ ایسا گمان رکھنے والوں کے لئے ٹھیک ہے کہ وہ ان حضرات کی شان میں جو بھی چاہیں سوئے ادب کریں۔ مگر جو شخص اصحاب نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسے گمان کو اپنے لئے بدبختی کی بات سمجھتا ہو وہ کیسے مان سکتا ہے کہ یہ لوگ جنھوں نے اسلام کے لئے ایسی جاں نثاریاں اور فرمانبرداریاں کیں کہ خدائے پاک نے بھی سندِ قبولیت عطا فرمادی وہ اسلام کی جڑ کھودنے کے کام کریں گے۔ اور فخر سے کہیں گے کہ "میں نے اسلام اور امتِ اسلام کے لئے تباہی کی داغ بیل ڈالدی ہے"۔ یہی بدبختانہ بات ہے جو یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں حضرت مغیرہ جیسے صاحب فضائل صحابی رسولؐ کی طرف ہماری تاریخی کتابوں میں منسوب کی گئی ہے۔ تاریخ کی جو کتابیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں اُن میں سب سے زیادہ غضب ابن اثیر کی کتاب "الکامل فی التاریخ" میں ڈھایا گیا ہے۔

---

[1] حدیث نبوی ہے "ان الدین یسر ولن یشادّ الدین احدٌ الّا غلبہ فسدّدوا وقاربوا وابشروا الحدیث۔ اللہ کا دین آسان ہے جو کوئی اس میں شدت پسندی کرے گا بالآخر مغلوب ہو جائے گا پس میانہ روی سے کام لو اور (رضائے حق کی) خوشخبری پاؤ۔ (مشکوٰۃ باب الاقتصاد فی العمل بروایت بخاری)

اور یہ بیان دیا گیا ہے کہ:۔

اور اس سنہ (۵۶) میں لوگوں نے یزید بن معاویہ سے ولی عہدی کی بیعت کی۔ اور اس معاملے کی ابتداء مغیرہ بن شعبہ سے ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ معاویہ نے کوفے کی امارت سے مغیرہ کو معزول کر کے سعید بن عاص کو مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے طے کیا کہ مجھے معاویہ کے پاس جا کر خود ہی اپنا استعفیٰ پیش کر دینا چاہئے۔ تاکہ لوگوں کو یہ ظاہر ہو کہ مجھے اس عہدہ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ پس یہ طے کر کے وہ معاویہ کے پاس گئے اور وہاں (دمشق) پہنچ کر اپنے دوستوں سے کہا کہ میں نے اگر آج ولایت و امارت حاصل نہیں کر لی تو پھر کبھی بھی نہیں کر سکوں گا۔ یہ کہہ کر سیدھے یزید کے پاس پہنچے۔ اور اس سے بولے کہ میاں، بڑے بڑے اصحاب نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ قریش گزر چکے۔ اب صرف انکی اولاد رہ گئی ہے اور تم ان میں سے سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی اور سنت و سیاست کے علم کے اعتبار سے بھی افضل لوگوں میں ہو۔ میں نہیں جانتا کہ آخر امیر المؤمنین کو کیا چیز مانع ہے کہ وہ تمھارے لئے (ولی عہدی کی) بیعت لے لیں! یزید یہ سن کر بولے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی؟ مغیرہ نے کہا، کیوں نہیں؟ پس یزید اپنے باپ کے پاس پہنچے۔ اور یہ گفتگو بتائی معاویہ نے بات سن کر مغیرہ کو بلایا اور پوچھا کہ یہ یزید کیا کہہ رہا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں امیر المؤمنین!۔ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرے سامنے اس اختلاف اور خونریزی کا منظر ہے جو عثمان کے قتل کے بعد رونما ہوا (میں نہیں چاہتا کہ یہ دوبارہ ہو) یزید کی شکل میں آپ کے بعد ذمہ داریوں کو سنبھالنے والا ایک فرد موجود ہے۔ پس اس کا تقرر کر دیجئے تاکہ آپ کو کچھ ہو تو لوگوں کیلئے ایک جائے پناہ اور آپ کا خلف موجود ہو اور کوئی فتنہ و فساد رونما نہ ہونے پائے

معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ اس کام کی صورت کیا ہوگی؟ مغیرہ نے جواب دیا۔ کوفے
والوں کو (متفق کرنے) کے لئے میں کافی ہوں بصرے کے لئے زیاد موجود ہے
اور ان دو بڑے شہروں کے بعد کوئی نہیں رہ جاتا جو آپ کی مخالفت کرے
معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ اچھا تم اپنے منصب پر واپس جاؤ۔ اور اپنے بھروسے
کے لوگوں سے بات چیت کرو۔ پھر دیکھیں گے۔ یہ کہہ کر معاویہ نے ان کو رخصت
کیا۔ اور یہ لوٹ کر اپنے دوستوں میں پہنچے اور بولے کہ میں نے معاویہ کا پاؤں ایسی
رکاب میں پھنسایا ہے کہ اب نکلنے والا نہیں ہے اور امتِ محمدیہ میں پھوٹ کا وہ
سامان کیا ہے کہ اب ابد تک اس میں جوڑ کی صورت نہ ہوگی[1]

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اور بھی ہے لیکن جتنا اوپر آیا اس کا آخری (خط کشیدہ) جملہ
ایسا ہے کہ اس کے بعد کچھ اور سنانے کی ضرورت نہیں[2]۔

کیا کوئی گنجائش اس بات کی ہے کہ ہم اصحاب بیعت رضوان کے لئے اور [illegible]) یا
غزوۂ تبوک کے لئے خدائے ذوالجلال کی وہ خوشنودی اور کرم فرمائی بھی مانیں جس کا نہایت
بلند آہنگ اعلان قرآن پاک میں ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ان میں سے کسی کے بارے میں
ماننے کو بھی تیار ہو جائیں کہ اس نے دنیا کی ایک حقیر غرض کے لئے دیدہ و دانستہ نہ صرف اسلام
دشمنی کا ایک کام کیا بلکہ اس کا فخر سے اعلان بھی دوستوں میں کیا؟ خدا کی پناہ ورہزار بار پناہ۔
ہم یہ لغویات (بلکہ کفریات) مان کر قرآن اور [illegible] کو جھٹلانے کا کام کیسے کر سکتے ہیں؟

کچھ اور اس سے بڑھی ہوئی روایتیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ان قابلِ فخر مؤرخین کا معیار روایات کے قبول کرنے میں

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۷۲ [2] اصل عربی الفاظ یہ ہیں: "لقد وضعت رجل معاویۃ فی غرز بعید الغایۃ علی امۃ محمد وفتقت علیہم فتقاً لا یرتق ابداً۔"

کیا تھا؟ اور انھوں نے کیسے رافضیت سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود ایسی روایات کو بلا نقد و تبصرہ لے لیا؟ لیکن ہم ان پر آنکھ بند کرکے اعتماد ہرگز نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ان کے یہاں تو اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین اور ایمان سوز روایتیں موجود ہیں۔

حضرت مغیرہ ہی کے بارے میں ایک روایت طبری میں ہے اور ابن اثیر نے بھی اسکو حسب عادت من وعن لے لیا ہے۔ سنئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ کیا اسکو مانا جاسکتا ہے۔ روایت ہے کہ :۔

"سنہ ۴۰ھ میں حج مغیرہ بن شعبہ کی امارت میں ہوا"

اس کی تفصیل ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ :۔

"جب اس سال میں کہ جس میں علی قتل کئے گئے، موسم حج آیا تو مغیرہ بن شعبہ نے معاویہ کی طرف سے ایک جعلی خط بنایا اور اسکی بنیاد پر لوگوں کو سنہ ۴۰ھ کا حج کرایا۔ اور کہا گیا ہے کہ انھوں نے یوم ترویہ (۸ر ذی الحجہ) میں وقوف عرفہ کرایا (جو ۹ تاریخ کو عرفات میں ہوتا ہے) اور عرفہ کے دن (یعنی ۹ تاریخ کو) قربانی کرائی (جو ۱۰ تاریخ کو ہوتی ہے) اور یہ اس ڈر سے کرایا کہ کہیں انکی جعل سازی کا پتہ نہ چل جائے۔ اور ایک بیان اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ یہ جلدی جلدی کی کارروائی انھوں نے اس لئے کی کہ انھیں اطلاع مل گئی تھی کہ کل صبح کو عتبہ بن ابی سفیان امیر حج کی حیثیت سے مکہ پہنچنے والے ہیں"

آپ ذرا غور کیجئے مغیرہ دشمنی میں کیسی کیسی خرافات تیار کرنے والوں نے تیار کی ہیں۔ اور ہماری تاریخی کتابوں میں اُن کو جگہ مل گئی ہے۔ مان لیجئے کہ مغیرہ بن شعبہ اُن فضائل سے آراستہ ہوتے کے باوجود جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اس حد تک بھی (معاذ اللہ) گر سکتے تھے کہ جعلی تقررنامہ بنا کے حج کی امیری ہی نہ کریں بلکہ اس امیری کی خاطر حج کا حلیہ بھی بگاڑیں۔ یعنی ۹ر ذی الحجہ کے بجائے ۸ر کو حج (وقوف عرفہ) کرادیں اور ۱۰ر کے بجائے

ور کو قربانی کرا دیں۔ لیکن کیا اُس وقت کے اور وہ تمام مسلمان بھی اندھے ہو گئے تھے۔ جو حج کرنے آئے تھے، اُن میں سے کسی کو خبر نہیں رہی کہ مغیرہ کیا غضب کر رہے ہیں، یا کسی کے بھی منہ میں زبان نہ تھی جو اُنھیں ٹوکتا؟ آخر کون اس بیہودہ روایت کو مان سکتا ہے؟ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ تنہا طبری ہی نے اس کو قابل بیان نہیں سمجھا بلکہ ابن اثیر نے بھی بلا چون و چرا نقل کر دیا ہے۔ خدا بھلا کرے ابن کثیر نے ضرور اسے نقل کرنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت سمجھی ہے کہ "یہ روایت باطل ہے۔ حضرت مغیرہ کے بارے میں ایسے گمان کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ صحابہ کرام ایسی باتوں سے بالاتر تھے۔ یہ روایت دراصل شیعیت کا شوشہ ہے۔"[1]

حاصل کلام

بہر حال اس کا امکان تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت مغیرہ نے ایک صاحب رائے اور دور اندیش انسان کی طرح جس کے لئے وہ مشہور تھے، حضرت معاویہ کے بعد اختلاف کے اندیشے سے یہ رائے قائم کی ہو کہ اس کی پیش بندی کے لئے یزید کی ولی عہدی مناسب رہے گی۔ لیکن یہ بات کہ انھوں نے محض کوفے کی اپنی امارت بچانے کیلئے یہ داؤں کھیلا۔ اور اس بات کا پورا شعور رکھتے ہوئے کھیلا کہ اس تجویز کے ذریعہ وہ اُمّت مسلمہ کو تباہی و بربادی کے راستے پر ڈال رہے ہیں۔ یہ قطعاً ناقابل قبول بات ہے۔ قرآن پاک کی صاف صاف شہادت ہے کہ "اللہ اُن سے راضی ہوا" — "اللہ نے اُن پر رحمت کی نظر کی"۔ اس قرآنی شہادت کے مقابلے میں کوئی بھی ایسی روایت کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے جو حضرت مغیرہ کو ایسے کردار کا حامل دکھائے جس کے ساتھ اللہ کی رحمت و رضامندی ہرگز جمع نہیں ہو سکتی؟ اور پھر روایت بھی وہ جس کی کوئی سند تک ہمارے سامنے نہیں ہے۔[2]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶

[2] تاریخ ابن اثیر میں روایت کی سند درج نہیں ہوتی۔

ایک اور پہلو

اتنی ہی بات نہیں کہ یزید کی ولی عہدی کے لئے حضرت مغیرہ کی تجویز کی یہ روایت ازروئے درایت لائق تسلیم نہیں ہے بلکہ روایتی حیثیت سے بھی اس کی خامی یہ ہے کہ ابن اثیر تو اپنی بلا سند روایت میں واقعہ کی صورت یہ بیان کرتے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا کہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہ نے حضرت مغیرہ کو کوفے کی امارت سے معزول کر کے سعید بن عاص کو اُن کی جگہ لانے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ کو پتہ چلا تو وہ اس ارادے سے پیدھے ناظم دمشق ہوئے کہ عہدے سے اپنی بے نیازی ظاہر کرنے کے لئے خود جا کر استعفےٰ دیدیں الخ ـــ جبکہ طبری میں سند کے ساتھ صورت واقعہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مغیرہ اپنے ضعف کا عذر لے کر معاویہ کے پاس پہنچے کہ اُن کا استعفےٰ قبول کر لیا جائے جس پر حضرت معاویہ نے قبول کر لیا اور اُن کی جگہ پر سعید بن العاص کو لانے کا ارادہ کیا۔

دونوں روایتوں میں صورت واقعہ بالکل مختلف ہے۔ ابن اثیر کی روایت میں حضرت معاویہ ارادہ کرتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کو ہٹا کر سعید بن عاصؓ کا تقرر کر دیں۔ اور اس کو سن کر حضرت مغیرہ استعفےٰ دینے جاتے ہیں جبکہ طبری کی روایت میں حضرت مغیرہ خود سے استعفےٰ کے خواہشمند ہوتے ہیں اور نتیجۃً حضرت معاویہؓ ارادہ کرتے ہیں کہ سعید بن عاص کو تقرر کر دیا جائے۔ اس اختلاف کی صورت میں طبری کی باسند روایت کو قدرتی طور پر ابن اثیر کی بے سند روایت پر ترجیح ہونی چاہئے۔ طبری کی روایت آگے ایسی کوئی بات نہیں بیان کرتی جس کو حضرت مغیرہ جیسے ایک صحابی رسول کے حق میں ماننا ہمارے لئے ممکن نہ ہو۔

طبری کی روایت کا سقم

لیکن طبری کی روایت میں بھی ایک جھول ہے، یعنی آگے جو صورت واقعہ انھوں نے

بیان کی ہے وہ عقلاً کچھ سمجھ میں آنے والی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کا استعفٰی منظور ہونے اور سعید بن عاص کا اُن کی جگہ پر نام آنے کی بھنک جو حضرت مغیرہ کے سکریٹری (کاتب) کے کان میں پڑی تو وہ (سعید کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے) ایک دم سعید کے پاس جا پہنچے اور خوش خبری سنائی۔ اس کا پتہ حضرت مغیرہ کو چل گیا۔ اور یہ چیز جو انھیں ناگوار ہوئی تو ایک دم یزید کو ولی عہدی کا خواب دکھانے کی اسکیم تیار کرکے یزید کے پاس پہنچ گئے یزید یہ سنہرا خواب لے کے اپنے والد کے پاس پہنچے۔ اور والد نے اس کی خوشی میں حضرت مغیرہ کو اُن کی جگہ پر بحال کرکے کوفے واپس بھیج دیا کہ جائیں اور اس خواب کو واقعہ بنانے کی تدابیر کریں۔

مغیرہ بن شعبہ خود سے استعفٰی دینے کو جاتے ہیں ضعیف العمری کا تقاضہ ہے پھر یہ بات ہوئی کہ جو شخص اُن کا سکریٹری تھا۔ وہ نئے ہونے والے امیر کوفہ کو خوش کرنے کے لئے اس کے پاس خوشخبری لے کر پہنچ گیا تو آپ نہ صرف اس سے بگڑ گئے بلکہ اپنا استعفٰی ہی منسوخ کرنے کی ٹھان لی۔ یہ تو ایک بچوں والا مزاج ہوا۔ حالانکہ مغیرہ مانے ہوئے صاحب رائے اور دانشمند و مدبر کے پیشے میں ہیں۔ اب ظاہر روایت کا یہی ناقابل فہم پہلو ہے جس کی بنا پر ابن کثیر نے اسے طبری ہی کے حوالے سے درج کرنے کے باوجود اس کا یہ جگہ نہیں والا جزو نکال کر بس یوں بیان کیا ہے کہ:۔

"..... استعفٰی منظور ہونے اور سعید بن عاص کا تقرر کئے جانے کی خبر سننے سے مغیرہ کو شاید کچھ کھٹک دامن گیر ہوا جس کی بنا پر وہ یزید کے پاس گئے۔[1] ....."

اور چونکہ ابن کثیر نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں صراحۃً لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کی بنیاد صرف طبری کی روایت پر رکھی ہے۔ اور بعد میں وہ دوسرے مورخین کی روایات سے مدد طلب کرتے ہیں اس لئے یہ سمجھنا غلط نہیں ہوگا کہ نفس روایت تو اُن کے سامنے بھی

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۷۹

طبری ہی کی ہے، مگر ابن کثیر کی طرح انھوں نے بھی اس کو اس کی اصل صورت سے پیش کرنے میں دقّت محسوس کی تو اس کی اصلاح انھوں نے ابن کثیر سے بھی زیادہ کر دی۔ اور خود ہی استعفیٰ دے کر خود ہی نادم ہونے کو بھی حضرت مغیرہ جیسے ہوشمند اور پختہ کار سے بعید دیکھ کر واقعہ کو یوں بیان کیا کہ اصل ارادہ معاویہ کی طرف سے ہوا تھا کہ مغیرہ کو معزول کر کے سعید کا تقرر کر دیا جائے۔ مغیرہ کو اس کی بھنک پڑی تو وہ اس کی کاٹ کے لئے اپنا استعفیٰ لے کر پہنچ گئے۔ اور استعفیٰ کے ساتھ ساتھ یزید کے کان میں ولی عہدی کا افسوں بھی پھونک دیا۔ جس کے نتیجے میں معاویہ کو خود ہی ضرورت محسوس ہوئی کہ مغیرہ کو اُن کے عہدے پر باقی رکھا جائے[1]۔

سوال یہ ہے کہ ایسی روایت کی وقعت کیا ہے جو اتنی ناقابلِ فہم ہو کہ طبری کا نام لے کر بیان کرنے والے بھی اسکو کافی ردّ و بدل کے بغیر بیان کے قابل نہ سمجھتے ہوں؟

ایک اور سوال

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا انتقال معتبر روایات کے مطابق ۴۹ھ یا ۵۰ھ میں ہو جاتا ہے[2]۔ طبری کی روایت میں بھی ہے[3]، اگرچہ بہت مختصر طور پر۔ اور ابن اثیر نے تو بڑی تفصیلات اپنے بیان میں دی ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ جب کوفے واپس گئے تو حضرت معاویہ سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق یزید کی ولی عہدی کے لئے زمین ہموار کرنے میں لگ گئے۔ اور پھر وفود تیار کر کے دمشق بھیجے جو حضرت معاویہ سے درخواست کریں کہ اپنے بعد کے لئے یزید کی ولی عہدی کی شکل میں بندوبست کر جائیں[4]۔ لیکن یہ ساری روایتیں ہمیں ۵۶ھ کے واقعات کے ذیل میں ملتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ۵۶ھ میں یزید کو ولی عہد سلطنت بنایا گیا۔ اور اسکی تجویز دراصل مغیرہ بن شعبہ نے رکھی تھی۔ اور اِس طرح قصّہ پیش آیا تھا۔

---

[1] ابن اثیر کی بیان کردہ روایتوں کا پورا ترجمہ وغیرہ گزر چکا ہے [2] البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۴۸، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۳۸ بیان وفات ۵۰ھ [3] طبری ج ۶ ص ۶۵ [4] پوری تفصیل کیلئے دیکھئے ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۵

سوال یہ ہے کہ یہ قصہ پیش آیا کب تھا؟ کون سے سنہ کی بات ہے؟ اور جس سنہ میں (یعنی ۴۹ھ یا اُس سے پہلے کے کسی سنہ میں) یہ قصہ پیش آیا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے استعفیٰ دیا یا وہ معزول کئے گئے۔ اور پھر انھوں نے یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت معاویہ کو خوش کر کے اپنا عہدہ بچایا۔ اِس کا ذکر اُسی سنہ کے واقعات میں کہیں کیوں نہیں ملتا؟ طبری اور ابن اثیر کے صفحات حکام کی معزولیوں، تقرریوں، استعفوں اور ترقیوں کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ خود مغیرہ بن شعبہ ہی کا بالکل اسی طرح کا ایک استعفیٰ دینے کا واقعہ بھی ۴۵ھ کے واقعات میں موجود ہے[1]۔ لیکن جس معزولی اور دوبارہ تقرری کا تعلق یزید کی ولی عہدی جیسے اہم واقعہ سے ہے اور پھر اس کے ساتھ حضرت مغیرہ کے بھیجے ہوئے وفود کا دمشق آنا جانا بھی جڑا ہوا ہے، اُس کا ذکر اور اسکے ان اہم متعلقات اور نتائج کا ذکر کہیں سنہ وقوعہ کے اندر نہیں ملتا! اُسکے بعد اس ولی عہدی سے لوگوں کے اختلاف کی باتیں چلتی ہیں۔ بات حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر کے خروج اور محاذ آرائی تک پہنچتی ہے۔ طرح طرح کی گفتگوئیں ہیں، تبصرے ہیں، تنقید ہے، تائید ہے کسی ذیل میں بھی ہمیں حضرت مغیرہ کا نام اس سلسلے میں سننے کو نہیں ملتا۔ حالانکہ بالکل قدرتی بات تھی، کہ کبھی حضرت معاویہ ہی کے منہ پر اپنی پوزیشن کی صفائی کے سلسلے میں یہ نام آتا کہ بھائی یہ تو ایک غیر اموی کا تجویز کیا ہوا نام ہے۔ اور وہ بھی ایسے ایسے اوصاف وفضائل رکھنے والا۔ اسی طرح عادۃً غیر ممکن تھا کہ اس ولی عہدی کی مخالفت کرنے والے اور پھر ولی عہد سے لڑائی لڑنے والے اسکو اور اُسکے باپ کو بُرا بھلا کہنے کے ساتھ دو چار نام اس تجویز پیش کرنے والے کو بھی نہ رکھتے۔ ۵۶ھ کی اِن روایتوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا، کہیں سے کہیں تک آپ کو حضرت مغیرہ کا ذکر اس قضیے سے جڑا ہوا نہیں ملے گا کیا معاملے کا یہ پہلو ان روایتوں کی واقعیت میں شک پیدا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

---

[1] دیکھئے طبری ج ۶ ص ۱۲۲-۱۲۳

اور اب سند کی بات

اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایت کوئی قابل اعتناء درجہ کی نہیں ہے۔ اسکے ایک راوی علی بن مجاہد کے بارے میں ابن معین کا قول ہے کہ "کان یضع الحدیث" حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۵۲) حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ "متروک ہیں" اور "لیس فی شیوخ احمد اضعف منہ" (امام احمد کے شیوخ میں ان سے زیادہ ضعیف کوئی دوسرا نہیں ہے)۔ (ج ۱ ص ۱۲۴)
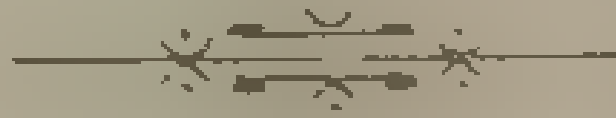
بابِ چہارم

ولی عہدی کی راہ میں زیاد کا وجود رکاوٹ؟

تجویزِ ولی عہدی اور زیاد

یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں جو راوی یہ بتاتے ہیں کہ یہ تجویز کوفے کے اموی گورنر مغیرہ بن شعبہ کے دماغ سے نکلی تھی اور نہایت بچگانہ حرکت کے طور پر نکلی تھی وہی راوی ایک مزید بات اس سلسلے میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے اپنے ایک دوسرے اہم گورنر زیاد[1] سے بھی اس سلسلے میں رائے مانگی تھی۔ اور اس نے رائے یہ دی کہ اس معاملے میں عجلت مناسب نہیں ہے۔ فی الحال اس کو التواء میں رکھنا اور موزوں حالات کا انتظار کرنا مناسب ہوگا حضرت معاویہ نے یہ رائے بلا چون و چرا قبول کر لی[1] اس کے بعد

---

[1] طبری ج ۶ ... زیاد بصرے کا گورنر تھا۔ اس کو زیاد بن ابیہ۔ زیاد بن سمیہ۔ زیاد بن ابی سفیان وغیرہ کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے یعنی نسب کے اعتبار سے ایک کمزور آدمی تھا۔ مگر نہایت باصلاحیت۔ طائف کے قبیلۂ ثقیف میں ہجری سنہ میں پیدا ہوا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کی صلاحیتیں کھلنا شروع ہوئیں۔ بصرہ میں گورنروں کا سکریٹری رہا حضرت علیؓ کا عہد آیا تو آپ نے اسے فارس کی گورنری دی اور حضرت حسنؓ کی صلح کے بعد بھی ایک گورنر تھا جس نے سال بھر تک حضرت معاویہ کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا۔ بالآخر ۴۲ھ میں اطاعت قبول کی اور کوفے میں رہائش کی اجازت حاصل کی حضرت معاویہ اس سے ... تھے کوفے کے گورنر حضرت مغیرہ ...
[illegible]

انہی راویوں کی یہ بھی روایت ہے کہ:-

لمّا مات زیاد دعا معاویۃ	جب زیاد کا انتقال ہو گیا تو معاویہ
بکتاب فقرأ علی الناس	نے یزید کو خلیفہ نامزد کرنے کی ایک
باستخلاف یزید. ان حدث	دستاویز تیار کر کے لوگوں کے سامنے
بہ حدث الموت فیزید	پڑھی. یعنی یہ کہ معاویہ کی موت واقع
ولی عہد فاستوثق لہ الناس	ہو جائے تو یزید جانشین ہوگا. پس
علی البیعۃ لیزید الا خمسۃ	لوگوں نے سوائے پانچ افراد کے، یزید
نفر[1]	کی بیعت کے لئے اپنا اقرار دیا.

روایت کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت معاویہ کو بس زیاد کی موت کا انتظار تھا. چنانچہ ابن اثیر اور ابن کثیر دونوں نے جو واقعات کو طبری کی طرح الگ الگ روایات میں توڑ کر نہیں بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرتے ہیں. انھوں نے بھی زیاد کا مشورہ اور حضرت معاویہ کے یہاں اُسکی قبولیت نقل کرنے کے بعد استخلافِ یزید کی از سرِ نو تحریک کو زیاد کی موت کے ساتھ بالکل اسی طرح جوڑ کے بیان کیا ہے جیسے بس زیاد کا وجود اس راہ میں رکاوٹ تھا. وہ ہٹا اور حضرت معاویہؓ از سرِ نو سرگرم ہو گئے[2]، حالانکہ زیاد کا انتقال باتفاقِ مؤرخین ۵۳ھ میں ہو گیا تھا (طبری. ابن اثیر. ابن کثیر تینوں کے یہاں اس کا ذکر موجود ہے[3])

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) پڑ گئیں یعنی ناکہ بندگی میں رہیں، مگر نہ تو زیاد جیسا آدمی ایسی زندگی پر راضی رہ سکتا تھا نہ حضرت معاویہ ایسے کار آمد آدمی کو اپنا بنائے بغیر چھوڑ سکتے تھے. بالآخر دونوں قریب آئے اور ۴۵ھ میں زیاد کو بصرہ کی گورنری مل گئی. اور پھر مسلسل ترقیاں پاتا ہوا ۵۳ھ میں انتقال کر گیا. (طبری ج ۶ ابن اثیر ج ۳ بیراعم ۲ بنر ج ۳)

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۷۰ [2] ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۵۰ البدایہ و نہایہ ج ۸ صفحہ ۸۶

[3] دوسروں کی طرح ابن کثیر نے بھی البدایہ و نہایہ ج ۸ میں ۵۳ھ کے واقعات میں زیاد کی وفات کا ذکر کیا ہے. اور ایک صفحے میں اُسکے آخری حالات لکھے ہیں لیکن ۵۶ھ کے واقعات میں جہاں (باقی اگلے صفحہ پر)

جبکہ حضرت معاویہ کی از سرِ نو سرگرمی کا وقت ۵۶ھ میں بتایا جا رہا ہے۔ ۵۶ھ کے واقعات کے عنوان کے تحت طبری کے الفاظ ہیں:۔

وفیہا دعا معاویۃ الناس	اور اسی سنہ میں معاویہ نے لوگوں کو
الی بیعۃ ابنہ یزید من بعدہٖ	اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کی بیعت کی
وجعلہ ولی العہد۔[1]	دعوت دی اور اُسے ولی عہد بنا دیا۔

اور تقریباً یہی الفاظ ابن کثیر اور ابن اثیر کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ پس اوّل تو کوئی وجہ ایسی سامنے نہیں ہے جس کی بنا پر یہ سمجھنا معقول ہو کہ حضرت معاویہ زیاد کے ڈر سے اپنی دلی خواہش دبائے بیٹھے رہے۔ دوسرے اگر یہی واقعہ تھا تو زیاد کا انتقال ۵۳ھ میں ہو جانے کے بعد ۵۶ھ تک مزید کون چیز اُنھیں روکے رہی؟ اور پھر کیا تُک ہے کہ ۵۶ھ میں ہونے والے واقعہ کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ جیسے وہ زیاد کی موت کے فوراً بعد ہی پیش آگیا تھا جو کہ تین۳ سال قبل ۵۳ھ میں ہو چکی تھی؟

قرینِ قیاس بات

جہاں تک زیاد سے مشورے کا سوال ہے، وہ توعین ممکن بلکہ قرینِ قیاس ہے، کیونکہ زیاد کا تعاون ناگزیر تھا لیکن تجویز کے احیاء کو زیاد کی موت سے خواہ مخواہ مربوط کرنا جس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ بس زیاد کا وجود رکاوٹ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے ولی عہدی کی تجویز ۸۔۔۱۰ سال سرد خانے میں پڑی رہی چنانچہ وہ راستے سے ہٹا اور معاویہ پھر سرگرمِ عمل ہو گئے۔ یہ ربط ایک زبردستی کا ربط ہے اور قابلِ قبول نہیں۔ اسکے

(گذشتہ صفحے کا بقیہ) انھوں نے زیاد کی وفات کے بعد حضرت معاویہ کا سرگرمِ عمل ہونا بیان کیا ہے وہاں یہ نہیں کہیں یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ زیاد کی وفات اسی سنہ میں ہوئی تھی: "فیہا مات زیاد۔ وکان ہذہ السنۃ شرع معدیہ"۔ ظاہر ہے یہ کوئی مجبوری تو تھی نہیں اس کسی کو خفا نہیں ہونا چاہیے۔ [1] ج ۶ ص ۱۶۹

مقابلے میں قابل قبول بات یہ ہو سکتی ہے کہ ۵۶ھ میں اپنی عمر اور صحت کے تقاضے سے حضرت معاویہ کو یہ خیال غالب ہوا ہو کہ انھیں اپنے بعد کے لئے انتظام میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اس وقت ان کی عمر ستر سے اوپر ہو چکی تھی۔ اور چار سال بعد ۶۰ھ میں اُن کا انتقال ہی ہو گیا[1]۔ حضرت معاویہ کی سرگرمی کی جو تفصیلات اہل تاریخ نے لکھی ہیں ان میں صاف طور سے اس کا اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ بعض کے بیانات میں تو صراحت کا درجہ ہے۔ مثلاً طبری میں ہے کہ جو پانچ آدمی یزید کی ولی عہدی سے متفق نہیں ہوئے تھے۔ جس کا ذکر اوپر دی ہوئی طبری کی روایت میں آ گیا ہے۔ اُن کو ہموار کرنے کے لئے حضرت معاویہ نے حجاز کا ایک سفر کیا تو اُن میں سے حضرت عبد اللہ بن عمر کے ساتھ بات چیت میں انھوں نے کہا کہ:-

إني ارهب ان ادع امة محمد بعدي كالضأن لا راعي لها[2]	مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بعد بکریوں کے اس ریوڑ کی طرح نہ چھوڑ جاؤں جس کا کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

اور ابن اثیر میں ہے کہ انھوں نے (اپنے سفر سے پہلے) مدینے کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے بعد کے لئے کسی کو نامزد کر جاؤں سو اس سلسلے میں اہل مدینہ کی رائے معلوم کرو۔ اس خط کا مضمون ابن اثیر میں اس طرح دیا گیا ہے کہ:-

إني قد كبرت سني ودق عظمي وخشيت الاختلاف	میری عمر بہت ہو چکی ہے اور ہڈیاں گل رہی ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ امت میں

---

[1] حضرت معاویہ کی عمر ۷۵ سے ۸۵ سال تک بتائی گئی ہے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ان کی عمر اس وقت موت کے وقت ۷۸ سال تھی اور کہا گیا ہے کہ ۸۶ سال تھی اور یہی زیادہ مشہور ہے۔

[2] طبری [illegible]

علی الامة بعدی وقد رأیت	میرے بعد اختلاف ہو۔ اس لئے
ان اتخیّر لھم من یقوم	ضروری سمجھ رہا ہوں کہ اپنے بعد کیلئے
بعدی وکرھت ان اقطع	کسی آدمی کو طے کر دوں لیکن تمہارے
امرًا دون مشورة من عندك	پاس جو لوگ ہیں (یعنی اہلِ مدینہ) انکے
فاعرض ذالك علیھم واعلمنی	مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کر دینا مجھے
بالذی یردّون علیك۔[1]	پسند نہیں پس تم میری یہ بات اُن
	لوگوں پر پیش کرو اور اُن کے جواب
	سے آگاہ کرو۔

ایک اور فائدہ

ابن اثیر کی اس عبارت سے جہاں ہمارے اس قیاس کو دلیل ملتی ہے کہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کے لئے جو سرگرم ہوئے وہ اس لئے نہیں تھا کہ زیاد کا انتقال ہو جانے سے راستہ صاف ہو گیا تھا بلکہ ضعیف العمری اور اپنے وقت کے قریب ہونے کا احساس اس کا باعث ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ ابن اثیر کی بیان کردہ اُن روایتوں کی تردید یا تضعیف کا سامان بھی (ابن اثیر ہی کی) اُس عبارت میں پایا جاتا ہے جو یزید کی ولی عہدی کے سبب میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کے متعلق اُن کی کتاب میں ایک ہی صفحہ پہلے درج ہوئی ہیں اور اس جلیل القدر صحابی کی مضحکہ خیزی کا سامان بنی رہیں۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے اُن روایتوں کی طرف اشارہ کیا تھا تفصیل نہیں دی تھی ـــــ ان روایتوں کے مطابق حضرت مغیرہ جب یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت معاویہ کو خوش کر کے کوفے کی امارت پر اس وعدہ کے ساتھ واپس ہوئے کہ کوفے والوں کو اس تجویز سے متفق کرنا

---

[1] ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۵۰

میرا کام ہے تو پھر انھوں نے وہاں سے ایک وفد بھی تیار کر کے حضرت معاویہ کے پاس اپنے لڑکے کی سرکردگی میں دمشق بھیجا تھا جو تیس[3] یا چالیس[4] آدمیوں پر مشتمل تھا. اس وفد نے یزید کے بڑے گیت گائے اور حضرت معاویہ پر زور دیا کہ ولی عہدی کا تاج بس یزید کے سر پہ رکھ ہی دیں تو اُن کو مناسب جواب دینے کے بعد حضرت معاویہ نے ابن مغیرہ سے پوچھا کہ تمھارے باپ نے کتنے میں ان سب کا دین خریدا؟ صاحبزادے نے جواب دیا "تیس ہزار[3] میں"۔۔۔۔۔ یا (دوسری روایت کے مطابق) "چار سو[4] دینار میں[1]"۔

یہ مضحکہ خیز واقعات ہو چکے ہوں اور حضرت معاویہ مروان کو ایسے انداز میں خط لکھیں جیسے کہ ولی عہدی کے سلسلے میں کوئی بات کبھی اس سے پہلے ہوئی ہی نہیں ہے. کوئی سمجھ میں آنے والی بات تو نہیں. مروان تو اندرون خانہ کے آدمی تھے۔

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۹
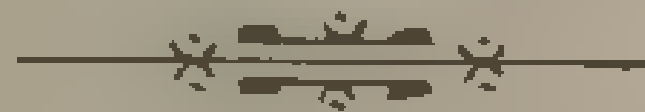
بابِ پنجم ۵

ولی عہدی کی بیعت اور اُسکے مخالفین کا قصّہ

اختلاف کی کہانی

اوپر طبری کی روایت گزری ہے کہ یزید کی ولی عہدی پر پانچ حضرات کے سوا اور سب نے اتفاق کر لیا تھا۔ اس کے بعد کی روایت میں ان پانچ حضرات کے نام طبری نے یہ دیئے ہیں۔

حسین بن علی۔ عبداللہ ابن عمر۔ عبداللہ ابن زبیر۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر۔
عبداللہ بن عباس (رضی اللہ تعالےٰ عنہم)

مگر اس ایک ابتدائی روایت کے سوا حضرت عبداللہ بن عباس کا نام اس اختلاف کے سلسلے میں کہیں نہیں ملتا۔ صرف باقی چار نام مختلف موقعوں پر دُہرا دُہرا کر آتے ہیں[1] حتیٰ کہ خود اس روایت میں جو آگے بیان ہے کہ حضرت معاویہ نے ان میں سے ہر ایک سے مل کر بات کی اور یہ بتا کی۔ اُس میں چار کے بعد پانچویں عبداللہ بن عباس سے حضرت معاویہ کی کوئی بات چیت نقل کرنے کے بجائے یہ لکھا ہوا ہے کہ "قال ولم یذکر ابن عباس" جس کا مطلب ہے کہ روایت کے اصل اور بنیادی راوی جو ایک مجہول اور نا معلوم الاسم

---

[1] مثلاً حضرت معاویہ کی جو وصیت یزید کے لئے بیان کی گئی ہے۔ اُس میں بھی چار نام اس حیثیت سے مذکور ہیں کہ ان لوگوں کی طرف سے تم کو اختلاف کا سامنا ہو سکتا ہے۔

طبری ج ۶ ص ۱۸۰-۱۷۹

شخصیت "رجل" بنخلۃ[1] ہیں۔ اُن سے روایت کرنے والے حمّاد جن کا نام ابن عوف ہے وہ کہتے ہیں کہ نخلہ والے صاحب نے بات چیت کے بیان کے سلسلے میں ابن عباس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یعنی بیان کے شروع میں اختلاف کرنے والوں کے جو نام انھوں نے گنائے تھے، اُن میں تو ابن عباس کا نام تھا۔ مگر ان حضرات سے حضرت معاویہ کی گفتگو کا جو قصّہ بیان کیا اُس میں پھر حضرت ابن عباس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا نام کسی غلطی سے آگیا ورنہ آنا نہیں چاہیئے تھا۔ اور بظاہر یہی وجہ ہے کہ ابن اثیر جو طبری کے حرف بحرف مقلّد ہیں انھوں نے بھی اس قصّے کے بیان میں چار ہی نام لئے ہیں حضرت ابن عباس کا نام اُن کے بیان میں نہیں ملتا۔ ابن کثیر نے البتہ ان کا نام بھی طبری کی پیروی میں باقی رکھا ہے۔ واللہ اعلم کیونکر؟

نہ صرف ابن عباسؓ

بہر حال ابن عباسؓ کا اس فہرست میں ذکر قطعی طور پر غلط ہے اور نہ صرف ابن عباسؓ کا نام یہاں غلط ہے۔ بلکہ ابن ابی بکرؓ کا نام بھی محلِّ غور ہے کہ آیا تاریخی تنقید سے بہ نام ۵۶ھ کے واقعات کی فہرست میں شامل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا سنہ وفات عام طور پر ۵۳ھ مانا گیا ہے خود ابن اثیر کی یہی روایت ہے، (ج ۳ ص ۲۴۶) چنانچہ اختلافی گفتگوؤں کا بڑا لمبا چوڑا قصّہ پورے ڈھائی صفحے میں بیان کرنے کے بعد آخر میں وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ :-

و ذکر عبد الرحمٰن بن ابی بکر	اور اس قصّے میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا
لا یستقیم علیٰ قول من یجعل	ذکر اُن لوگوں کے قول کے مطابق

[1] مقام نخلہ کے ایک صاحب۔ معجم البلدان میں نخلہ نام کے دو مقام ہیں۔ ایک نخلۂ شامیہ اور دوسرا نخلۂ محمود (ج ۸ ص ۲۶۷ جدید ایڈیشن) واللہ اعلم یہاں کون سا نخلہ مراد ہے۔

وفاتہ سنہ ثلاث وخمسین	ٹھیک نہیں بیٹھتا جو اُن کا سنہ وفات
وانما یمشی علیٰ قول من	۵۳ھ بتاتے ہیں۔ یہ صرف اُن لوگوں
یجعلہا بعد ذالک الوقت۔[1]	کے قول پر ٹھیک بیٹھے گا جو اُن کا
	سنہ وفات اس کے بعد بتاتے ہیں۔

ہمارے سامنے جو کتابیں ہیں ان میں صرف ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ میں یہ قول ملتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا سنہ وفات ۵۸ھ ہے۔ اور اس کو وہ "کثیر من علماء التاریخ" کا قول بتاتے ہیں۔ نام کسی ایک کا نہیں لیتے جب کہ اسکے مقابل ۵۳ھ کے قول میں واقدی کا نام ہے۔ محمد بن سعد کا نام اور ابوعبید وغیرہ کا نام ہے[2]۔ اس "وغیرہ" میں ہم ابن قتیبہ کی المعارف کا اضافہ کرتے ہیں[3]۔

اور خود ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ہی میں اس کا ایک "زلی قرینہ پایا جاتا ہے کہ ۵۸ھ کا قول صحیح نہیں ہے۔ ۵۸ھ کے وفیات ہی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کا نام بھی آتا ہے۔ چنانچہ بھائی بہن کے یہ دونوں نام البدایہ والنہایہ میں پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور اسی کے ساتھ حضرت عبدالرحمٰن کے تذکرہ وفات میں یہ بتاتے ہوئے کہ اُن کی وفات مکے کے راستے میں مکے سے ۶۔ یا ۔ ۱۲ میل کے فاصلے پر ہوئی تھی۔ جہاں سے اُن کو مکے لے جایا گیا اور بالائی مکہ میں دفن کیا گیا، یہ بھی بتایا گیا ہے کہ :-

فلما قدمت عائشۃ مکۃ	پس جب حضرت عائشہ مکے آئیں تو
زارتہ وقالت لو شہدتک	قبر پر گئیں اور کہا کہ میں اگر تمہاری
لم ابک علیک ولو کنت	موت کے وقت موجود ہوتی تو روتی
عندک لم انقلک من	اور تم کو اُس جگہ سے منتقل بھی نہ کرتی

---

[1] ج ۳ ص ۲۵۲ [2] ج ۸ ص ۸۹ طبع مطبعۃ السعادۃ مصر [3] ص ۱۲۶ طبع دوم مطبعۃ اسلامیہ، ازہر قاہرہ

موضع الذی مت فیہ[1]　　جہاں تمہاری موت واقع ہوئی تھی۔

اس عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبدالرحمٰنؓ کی خبر وفات سن کر مکے گئی تھیں۔ بلکہ عبارت کا تقاضہ یہ ہے کہ کہ ان کا جانا ہوا تو وہ بھائی کی قبر پر بھی گئیں۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات کا مکے جانا اگر ہوتا تھا تو وہ صرف حج کے لئے ہوتا تھا۔ ۵۸ھ میں حج کا موسم حضرت عائشہؓ نے پایا نہیں۔ اس لئے کہ اُن کی وفات کا مہینہ رمضان۔ اور بقول بعض شوال قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں مذکور ہے (ج ۸ ص ۹۴) پس اگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر پر گئیں تو ضروری ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کی موت ۵۸ھ سے پہلے کا واقعہ ہو۔

بہر حال یہ بات بھی مشکوک ہے کہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والے حضرات میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ہوں۔ ہاں اگر الاصابہ فی تمییز الصحابہ (از ابن حجرؒ) کی روایت صحیح ثابت ہو جائے جس کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن کا سنہ وفات ۵۶ھ ہوتا ہے۔ اور وفات کا واقعہ حضرت معاویہ سے گفتگو کے بعد پیش آیا[2]۔ تو پھر یہ بیان صحیح ہوگا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی ان حضرات میں شامل تھے جنھوں نے یزید کے لئے ولی عہدی کی بیعت سے انکار کیا۔ مگر اس گتھلک کا کیا کیا جائے کہ اس روایت کے متصلاً بعد ابن حجر اس روایت کی تائید میں مورخ ابن سعد وغیرہ کا جو بیان پیش کرتے ہیں اُس میں جہاں یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کا انتقال اسی سال ہوا جس سال حضرت معاویہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں حجاز آئے تھے، وہیں یہ بھی ہے کہ:۔

وماتت عائشۃ بعدہ بسنۃ　　اور عائشہ کا انتقال اُن کے سال بھر

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۹　[2] اصابہ ج ۴ ص ۱۶۹ مطبع شرفیہ۔ ابن حجرؒ کی بیان کردہ اس روایت میں حضرت عائشہؓ کے سفر مکہ کی بابت یہ صراحت بھی پائی جاتی ہے کہ یہ سفر حج کا سفر تھا۔

سنۃ تسع وخمسین۔ بعد ۵۹ھ میں ہوا۔

یعنی اب حضرت معاویہ کے سفر کا سنہ ۵۶ کے بجائے ۵۸ ہو گیا۔ حالانکہ وہ متفقہ طور پر ۵۶ھ ہے۔

بہتر ہے کہ اس گنجلک مسئلے کو اب چھوڑ ہی دیا جائے۔ کیونکہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اس اختلاف میں شریک تھے یا نہیں شریک تھے۔ مسئلے میں چونکہ شک کا پہلو سامنے آ گیا تھا۔ اس لئے ایک طالب علمانہ خواہش یہ تھی کہ صفائی ہو جائے۔ مگر معلوم ہوا کہ آسان نہیں ہے۔ مزید کافی وقت لگ سکتا ہے جس کی گنجائش سردست نہیں۔ اس لئے اس ضمنی مسئلے کو چھوڑ کر اب ہم اصل مسئلے پر آتے ہیں، یعنی اختلاف کی جو کہانیاں بیان کی جاتی ہیں دیکھا جائے کہ ان میں کہاں تک صداقت ہے۔

ابن کثیر کا بیان

اختلاف کی کہانی کا بیان اُس روایت میں بھی ہے جس کا ذکر ابھی اوپر اس حوالے سے گزرا ہے کہ اُس کے بنیادی راوی ایک نامعلوم شخص ہیں جنھیں "مقام نخلہ کے ایک صاحب" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے، مگر اس روایت والی کہانی میں ایک تشنگی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کہیں بیچ سے شروع کر دی گئی ہے، شروع کی کچھ کڑیاں رہ گئی ہیں۔ اس تشنگی کو ابن کثیر کا بیان دور کرتا ہے۔ اگرچہ اُس میں اختصار ہے اس لئے ہم ابن کثیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ زیاد کے مشورے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:—

"پس جب زیاد کا انتقال ہو گیا۔ اور یہ اسی سنہ کی بات ہے[1] —— تو معاویہ نے ولی عہدی کے لئے کارروائی شروع کر دی۔ یزید کے لئے بیعت کی اطراف میں اس کے لئے لکھا پس مملکت کی تمام اقلیموں میں لوگوں نے

---

[1] یہ عبارت اوپر گزر چکی ہے اور ہم وہاں تنبیہ کر چکے ہیں کہ یہ سہو ہے زیاد کا سنہ وفات ۵۳ھ ہے

بیعت کرلی سوائے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ، حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ابن عباسؓ کے۔ اس پر معاویہؓ نے عمرے کے عنوان سے مکہ کا سفر کیا۔ اور مکہ سے لوٹتے ہوئے جب اُن کا گزر مدینے میں ہوا تو انھوں نے ان پانچوں میں سے ہر ایک کو الگ الگ بلایا اور ڈرایا دھمکایا۔ سوا اِن سب میں سب سے زیادہ سخت اور بےباکانہ جواب دینے والے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ تھے، اور سب سے زیادہ نرم کلام والے عبداللہ بن عمرؓ۔ پھر معاویہؓ نے ایک خطبہ دیا اور اُس وقت یہ پانچوں اُن کے منبر کے نیچے موجود تھے۔ اس خطبے کے بعد لوگوں نے یزید کی (ولی عہدی کی) بیعت کی۔ یہ پانچوں بیٹھے رہے نہ انھوں نے موافقت کی اور نہ کوئی اختلاف ظاہر کیا۔ اس لئے کہ یہ ڈرائے دھمکائے جا چکے تھے پس ساری مملکت میں یزید کی باقاعدہ بیعت ہو گئی اور تمام علاقوں سے وفود (اسکی توثیق کے لئے) یزید کے پاس پہنچے۔[1]

طبری کی روایت

طبری کی روایت میں اِس بیان کا اول و آخر نہیں ہے۔ صرف وہ مکالمہ ہے جو حضرت معاویہؓ اور ان اختلاف کرنے والے حضرات کے درمیان ہوا۔ جس کی تفصیل ابن کثیر نے نہیں دی محض حوالہ دیا ہے۔ وہ مکالمہ یہ تھا:۔

"جب معاویہؓ آئے تو انھوں نے حسین بن علیؓ کو بلوایا اور کہا کہ 'بھتیجے، سوائے اُن پانچ آدمیوں کے جن کی قیادت تم کرتے ہو اور سب لوگ اس معاملے میں متفق ہو چکے ہیں تو تم ہی کہو اس اختلاف کی تمھیں کیا ضرورت پیش آرہی ہے؟' حسینؓ نے جواب دیا کہ 'میں اُن کی قیادت کر رہا ہوں؟'

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۹

کہا "ہاں تم قیادت کر رہے ہو"۔ حسین نے کہا "اچھا تو آپ اُن کو بلا لیجئے۔ وہ اگر بیعت کر لیں تو آپ دیکھیں گے کہ میں بھی اُن میں کا ایک ہو جاؤں گا، ورنہ پھر آپ میرے بارے میں تیز نہ ہوں"۔ معاویہ نے کہا "تم ایسا کرو گے؟" کہا "ہاں بالکل" اس پر معاویہ نے اُن سے اقرار مانگا کہ وہ اس بات چیت کو کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔ حسین نے بچنے کی کوشش کی۔ مگر بالآخر قول دیدیا۔ وہ نکلے تو راستے میں ابن زبیر نے ایک آدمی بٹھا رکھا تھا۔ اُس نے کہا کہ آپ کے بھائی ابن زبیر پوچھتے ہیں کہ بڑے میاں سے کیا بات ہوئی ہے۔ حسین نے بچنا چاہا مگر اُس آدمی نے پیچھے پڑ کے کچھ نہ کچھ اُن سے نکلوا ہی لیا۔ حسین کے بعد معاویہ نے ابن زبیر کو بلوا بھیجا۔ اور ان سے بعینہٖ یہی بات ہوئی۔ جو حسین سے معاویہ نے کہا تھا وہی ابن زبیر سے کہا اور جو جواب حسین نے دیا تھا بالکل وہی ابن زبیر نے دیا۔ معاویہ نے اُن سے بھی اقرار مانگا کہ کسی کو بتاؤ گے نہیں۔ ابن زبیر نے اس پر کہا کہ امیر المؤمنین ہم آپ حرمِ الٰہی میں ہیں[1]۔ اور یہاں آپ سے اقرار گویا اللہ سے اقرار ہے۔ اور یہ بڑی بھاری بات ہے۔ یہ میں نہیں کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد وہ گئے تو عبداللہ بن عمر کو بلوایا گیا۔ اُن سے معاویہ نے ذرا نرم بات کی اور یہ کہا کہ "دیکھو میں ڈرتا ہوں کہ اپنے بعد امت محمد کو اُن بکریوں کی طرح چھوڑ جاؤں جن کا کوئی چرواہا نہ ہو" اور تمھیں معلوم ہے کہ سب لوگ بیعت کر چکے ہیں صرف وہ پانچ نفر باقی ہیں جن کی قیادت تم کرتے ہو۔ آخر تمہیں کیا ضرورت پیش آرہی ہے؟" ابن عمر نے جواب دیا کہ میں تمھیں اس مقصد کی ایسی صورت بتاؤں کہ جس سے کوئی بُرائی بھی نہ آوے اور امت میں فتنہ وفساد کا سدِّباب بھی ہو جائے۔ کہا ضرور بتاؤ۔ کہا تم مجمع میں بیٹھو میں آؤں گا اور اس بات پر تمہاری بیعت

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ کا واقعہ ہے۔

کروں گا کہ تمھارے بعد جس شخص پر بھی اُمت متفق ہو گی میں اس سے بیعت
کر لوں گا۔ اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو" معاویہ نے کہا تم ایسا کرو گے؟
کہا بے شک، اس کے بعد (حرم سے) گھر آ گئے اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو بلوایا
اور کہا کہ ابن ابی بکر تم کس بوتے پر میری مخالفت کے درپے ہو، ابن ابی بکر نے
جواب دیا۔ میں اس میں خیر دیکھتا ہوں کہا میں تمھیں قتل کر دوں گا۔ جواب ملا کہ
اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر دنیا میں اللہ کی لعنت ہو گی اور آخرت میں دوزخ
تمھارا ٹھکانہ" ابن عون کہتے ہیں نخلہ والے آدمی نے (پانچویں شخص) ابن عباس
کا کوئی ذکر اس مکالمے کے سلسلے میں نہیں کیا۔[1]

ابن اثیر کا بیان

طبری کی اس روایت کو پڑھ کر لازماً یہ سوال پیدا ہونا چاہیئے کہ عبدالرحمٰن بن
ابی بکر کی کیا خصوصیت تھی کہ اُن سے حضرت معاویہ نے بہت کڑے اور کڑوے انداز میں
بات کی، جب کہ دیگر افراد کے ساتھ اُن کا اندازِ گفتگو یہ نہیں تھا؟ اس سوال کا کچھ حل شاید
ابن اثیر کے بیان سے نکلے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب زیاد کی موت کے بعد معاویہ نے یزید کے لئے
ولی عہدی کی بیعت حاصل کرنے کا عزم کر لیا تو سب سے پہلے تو انھوں نے عبداللہ بن عمر کو
ہموار کرنے کی کوشش کی جس میں اُن کو ناکامی ہوئی۔ بعد ازاں مدینے کے گورنر:۔

"مروان بن حکم کو لکھا کہ میری عمر بہت ہو گئی ہے۔ ہڈیاں گھُل رہی ہیں۔ اور
میں ڈرتا ہوں کہ میرے بعد اُمت میں (اقتدار کے مسئلے پر) اختلاف رونما ہو،
اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے بعد کیلئے کسی آدمی کو نامزد کر جاؤں،
لیکن میں یہ نہیں پسند کرتا کہ یہ کام اُن لوگوں کے مشورے کے بغیر کروں جو

---

[1] طبری ج ۶ ص۱۷۰

تمھارے پاس ہیں (یعنی اہلِ مدینہ) پس تم میری یہ بات اُن کے سامنے رکھو، اور اُن کے جواب سے مجھے آگاہ کرو، چنانچہ مروان نے یہ مسئلہ اہل مدینہ کے سامنے رکھا اور ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہاں بالکل مناسب بات ہے۔ ہم بھی پسند کریں گے کہ وہ ہمارے لئے کسی کو نامزد کر دیں اور اس میں کوتاہی نہ کریں مروان نے یہ روداد حضرت معاویہ کو بھیجدی۔ وہاں سے جواب میں یزید کا نام آیا۔ مروان نے لوگوں کو جمع کر کے بتایا کہ امیر المؤمنین نے آپ کے لئے پوری خیر خواہی کے ساتھ اپنے فرزند یزید کو اپنے بعد کیلئے انتخاب کیا ہے، یہ سن کر عبدالرحمٰن بن ابی بکر کھڑے ہو گئے۔ اور بولے کہ مروان تم بھی جھوٹے اور معاویہ بھی جھوٹے۔ تم دونوں کی نیت اس انتخاب میں امت محمدیہ کے ساتھ بھلائی کی نہیں بلکہ تم لوگوں کی نیت یہ ہے کہ خلافت کو ہرقلیت بنا دو کہ ایک ہرقل مرا تو دوسرا ہرقل آ گیا[1]........ اسی طرح حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور ابن عمر نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی۔ اور مروان نے پھر اس کی اطلاع معاویہ کو دی[2]"۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ حضرت معاویہ کی شدت کے پس منظر میں حضرت عبدالرحمٰن کی یہ شدّت تھی جس کو ابن اثیر کا بیان نمایاں کرتا ہے جبکہ دوسروں (حضرت حسین وغیرہ) نے یہ شدّت نہیں اختیار کی تھی۔ یہ واقعہ پہلے پیش آچکا تھا۔ اسکے بعد حضرت معاویہ نے حجاز کا سفر کیا ہے۔ اسی لئے حضرت عبدالرحمٰن کے ساتھ اُن کا اندازِ گفتگو مختلف تھا۔

ابن اثیر ہی کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مروان کو جب حضرت معاویہ نے یزید کا نام اپنے ولی عہد کی حیثیت سے مدینہ بھیجا تھا کہ اس کے لئے اہلِ مدینہ کی منظوری حاصل کریں تو ساتھ میں یہ بھی ہدایت کی تھی کہ مدینے سے کوئی وفد بھی اس

---

[1] ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۵۰ [2] ایضاً

منظوری کے اظہار کے طور پر دمشق آنا چاہیئے۔ اور اسی طرح دوسرے گورنروں کو بھی اُن کے علاقوں سے متعلق لکھا تھا[1] چنانچہ یہ وفود پہنچے۔ ابن اثیر نے اُن میں سے خاص طور پر دو کا ذکر کیا ہے۔ ایک اہلِ مدینہ کا وفد جس میں سے محمد بن عمرو بن حزم کا نام دیا گیا۔ دوسرا اہلِ بصرہ کا وفد جس میں احنف بن قیس کا نام مذکور ہوا ہے۔

ابن اثیر نے ان وفود کے اجتماع کی کارروائی جس طرح دی ہے اُس سے یہ تأثر ہوتا ہے کہ اس اجتماع سے جو مقصد حضرت معاویہ کا تھا کہ یزید کی ولی عہدی پر تمام مملکت کے نمائندوں کی مہرِ اتفاق ثبت کرالی جائے یہ مقصد اس اجتماع سے تو حاصل نہیں ہوسکا۔ بلکہ ایک انتشاری کیفیت کے ساتھ اجتماع برخاست ہوا۔ البتہ بعد میں حضرت معاویہ نے لطف وعطا اور مدارات کے ذریعہ لوگوں کو ہموار کیا اور اکثریت سے یزید کی ولی عہدی پر بیعت حاصل کرلی[2] اور اسکے بعد حجاز کا سفر کیا تاکہ وہاں جو لوگ بیعت سے انکار کر رہے ہیں اُن کا انکار ختم کرایا جائے۔ انھیں سمجھایا جائے کہ اب جبکہ اور سب ہی لوگ متفق ہو چکے تو کچھ کا اختلاف جاری رہنا مناسب نہیں۔ یہی وہ سفر ہے جس کی روداد طبری کے نیز البدایہ والنہایہ کے حوالے سے اوپر پڑھی جاچکی ہے۔

ابن اثیر کے بیان پر سوالیہ (؟)

یہ بات کوئی ناممکن نہیں ہے کہ وفود کا اجتماع ناکام رہا ہو۔ اور نہ یہ کہ اس کا تدارک، حضرت معاویہ نے مدرات وعطیّات اور تالیفات سے کیا ہو۔ ایک آدمی اگر حضرت معاویہ سے حسنِ ظن رکھتا ہے تو وہ اس بارے میں بلا کسی دقّت کے یوں سوچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے نیک نیتی سے اور اچھے مقصد سے کیا تھا۔ لیکن اجتماع کی جو روداد ابن اثیر نے بیان کی ہے اُس کا منطقی تقاضہ یہ ہے کہ اجتماع اپنے مقصد کے اعتبار سے کامیاب

---

[1] ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۵۰ [2] ایضاً صفحہ ۲۵۱

رہا ہو نہ کہ ناکام جبکہ مدارات و عطیات سے کام لینے کی بات جو انھوں نے بلا کسی ثبوت، مثال اور حوالے کے صرف ایک فقرے میں بیان کر دی ہے وہ اپنے لئے کسی وزن کا تقاضہ نہیں کرتی ـــــ بلکہ داد و دہش کا جو تنہا ایک واقعہ انھوں نے اس قصے کے بالکل شروع میں بیان کیا ہے وہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ داد و دہش سے کچھ کام نہیں بنا[1]۔

اجتماع کی روداد جو ابن اثیر نے بیان کی ہے وہ یہ ہے :-

ثم ان معاویۃ قال للضحاک	پھر جب وفود جمع ہو گئے تو معاویہ
بن قیس الفہری لما اجتمع	نے ضحاک[2] بن قیس سے کہا کہ میں
الوفود عندہ : انی متکلم	اوّلاً کچھ کہوں گا۔ پھر جب میں خاموش
فاذا سکتُّ فکن انت الذی	ہوں تو تم کھڑے ہو یزید کی بیعت
تدعوا الی بیعۃ یزید وتحثی	کی تحریک کرو اور مجھے اس کے لئے
علیہا فلما جلس معاویۃ	ترغیب دو۔ پس جب معاویہ
للناس تکلم فعظم امر الاسلام	خطاب کرنے بیٹھے تو اسلام کی

---

[1] لکھا ہے کہ زیاد کی موت کے بعد یزید کی ولی عہدی کا تہیہ کیا تو حضرت عبداللہ بن عمر کو ایک لاکھ درہم بھیجے جو انھوں نے یہ شبہ ہونے کے بعد لینے سے انکار کر دیا کہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلہ میں ہیں۔ صفحہ ۲۵

[2] صغار صحابہ میں سے ہیں۔ بعض احادیث کی روایت بھی ان سے ہے۔ حضرت معاویہ کے خاص انحی ص حامیوں میں تھے ۵۶ھ کے اس اجتماع کے وقت کوفے کے گورنر تھے۔ بعد میں حضرت معاویہ نے ان کو دمشق میں انتظامیہ کی سربراہی سپرد کی۔ حضرت معاویہ کی نماز جنازہ انہی نے پڑھائی۔ یزید کے زمانے میں بھی اپنے منصب پر برقرار رہے۔ یزید کی موت کے بعد آپکی رائے تھی کہ سب لوگ عبداللہ بن زبیر کی بیعت کر لیں اور قریب تھا کہ ان کی بات چل جاتی اور اسلامی جمعیت پھر سے بحال ہو جاتی مگر ابن زیاد نے مروان کو امیدوار بنا کے کھڑا کر دیا ۶۴ھ میں مروان کے مقابلے میں عبداللہ بن زبیر کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ اصابہ ج ۲ صفحہ ۲۶۸ سیر اعلام النبلاء ج ۳ صفحہ ۲۴۵ تا ۲۴۵ ۔

وحرمة الخلافة وحقّها وما
امر الله به من طاعة ولاة
الامر ثم ذكر يزيد وفضله
وعلمه بالسياسة وعرض
بيعته فقاصه الضحاك
فحمد الله واثنى عليه ثم
قال: يا امير المؤمنين انه
لابد للنّاس من والى بعدك
وقد بلونا الجماعة والالفة
فوجدناهما احقن للدماء
واصلح للدهماء وآمن
للسبل وخيرًا فى العاقبة
والايّام عوّجٌ رواجع
والله كل يوم هو فى شأن
ويزيد بن امير المؤمنين
فى حسن هديه وقصد
سيرته على ما علمت
وهو من افضلنا علمًا
وحلمًا وابعدنا رأيًا فولّه
عهدك واجعله لنا علمًا
بعدك ومفزعًا نلجأ اليه

عظمت، خلافت کی حرمت اور
اُس کا حق اور اولو الامر کی اطاعت
کے بارے میں اللہ کے احکام بیان
کئے۔ پھر یزید اور اس کی خوبیوں کا
بالخصوص اس کے سیاسی شعور اور
آگاہی کا تذکرہ کر کے اسکی بیعت کا
مسئلہ پیش کیا۔ اس کے بعد ٹھیک اسی
انداز سے ضحاک بولے۔ حمد و ثنا کے
بعد کہا کہ امیر المؤمنین لازم ہے کہ
آپ کے بعد کے لئے صاحب امر کا تقرر
ہو جائے۔ تاکہ جماعت اور یکجہتی قائم
رہے جس کی برکتیں ہم نے آزمائی ہیں کہ
اُس میں جانوں کی حفاظت ہے
راستوں کا امن ہے اور عاقبت
کی بھلائی۔ زمانہ کی کج رفتاری ہم سب
پر روشن ہے اور اللہ کی شانِ بے نیازی
بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یزید بن امیر المؤمنین
اس کام کے لئے نہایت موزوں ہیں۔
اُن کے حسن سیرت کا حال آپ پر عیاں
ہے۔ نیز علم، حلم اور رائے میں وہ ہم
سب سے فائق ہیں۔ پس اُنکو اپنے بعد

ونسکن فی ظلہ وتکلم عمرو
بن سعید الاشدق بنحو من
ذالك ثم قام یزید بن المقنع
العذری فقال ھذا امیرالمؤمنین
واشار الی معاویۃ فان ھلك
فھذا واشار الی یزید ومن
أبی فھذا وأشار الی سیفہ
فقال معاویۃ: اجلس فانت
سید الخطباء وتکلم من
حضر من الوفود فقال
معاویۃ: لاحنف ماتقول
یا ابا بحر: فقال نخافکم

کے لئے نامزد کر کے ہمارے لئے ایک
نشان وعَلم اور پناہ گاہ کا انتظام کیجئے
کہ جس کی پناہ اور سائے میں ہم قرار
پکڑیں. پھر عمرو بن سعید الاشدق [1]
بولے اور کچھ یہی باتیں انھوں نے
بھی کہیں. اس کے بعد یزید بن مقنع
عذری [2] کھڑے ہوئے اور معاویہ
کی طرف اشارہ کر کے بولے یہ
امیرالمؤمنین ہیں. ان کو اگر کچھ
ہو جائے تو ۔ یزید کی طرف اشارہ
کر کے بولے کہ ۔ پھر یہ ہیں. اور
اسکے بعد اپنی تلوار کی طرف اشارہ

---

[1] کبار تابعین میں ہیں۔ بعض نے صحابہ میں شمار کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں (اصابہ ابن حجر) ابن کثیر ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں کان من سادات المسلمین ومن الکرماء المشھورین الخ (ج ۸ ص ۳۱۱) اور یہی اوصاف ان کے والد ماجد سعید بن العاص رضؓ کے تھے. جو حضرت عثمان کی تربیت میں رہے تھے حضرت عثمان کے زمانے میں بھی کوفے کے گورنر رہے پھر حضرت معاویہ کے زمانے میں بھی اولاً کوفے کی پھر مدینے کی گورنری پر رہے (اصابہ ج ۳) عمرو بن سعید اس اجتماع کے وقت کسی عہدے پر تھے یا نہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا. البتہ بعد میں وہ مکے اور مدینے کی گورنری پر رہے ہیں. حادثۂ کربلا کے وقت وہ پورے حجاز کے گورنر تھے. واقعہ کے بیان میں اُن کا ذکر آئے گا. غالب گمان یہ ہے کہ ۵۶ھ کے اس اجتماع کے وقت بھی وہ برسرِ عہدہ ہوں. اور جیسا کہ دستور تھا اُن کے والد سعید کے ۵۳ھ یا ۵۴ھ میں انتقال کے بعد انھیں کوئی جگہ دے دی گئی ہو۔ [2] ان صاحب کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔

ان صدقنا وتخاف الله
ان کذبنا وانت یا امیر المؤمنین
اعلم بیزید فی لیلہ ونہارہ
وسرّہ وعلانیتہ ومدخلہ
ومخرجہ فان کنت تعلمہ
للّٰہ تعالیٰ وللامّۃ رضیً
فلا تشاور فیہ وان کنت
تعلم فیہ غیر ذالک فلا تزوّدہ
الدنیا وانت صائر الی الآخرۃ
وانما علینا ان نقول
سمعنا واطعنا وقام
رجلٌ من اہل الشام
فقال ما ندری ما تقول
ھٰذہ المعدیۃ العراقیۃ
وانما عندنا سمعٌ وطاعۃ
وضرب وازدلاف
فتفرّق الناس یحکون

کیا کہ جو انکار کرے اس کے لئے یہ ہے معاویہ نے کہا کہ بس بیٹھ جاؤ تم سب سے بڑے خطیب ہو۔ اس طرح تمام وفود نے اظہار خیال کیا۔ احنف[1] نہیں بولے تھے۔ معاویہ نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا کہ ابو بحر (یہ کنیت ہے) تم بھی تو کچھ کہو۔ اس پر انھوں نے کہا کہ اگر سچ کہوں تو آپ لوگوں کا خوف ہے اور جھوٹ میں اللہ کا خوف امیر المؤمنین مختصر یہ ہے کہ آپ یزید کے لیل ونہار اور ظاہر و باطن سے واقف ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اسکے انتخاب میں اللہ اور امت کی رضا ہے تو کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایسا نہیں سمجھتے تو پھر اب جبکہ آپ کا چل چلاؤ ہے اسکی محض دنیا کا بندوبست نہ کیجئے،

---

[1] احنف بن قیس البصری تابعین میں ہیں۔ فتنے کے وقت میں حضرت علی کے خاص حامیوں میں تھے اپنی نیک سیرت، حلم و وقار، اور دانش کی وجہ سے حضرت معاویہ کے دور میں بھی محترم اور معزز رہے ابو بحر کنیت تھی۔ وہ کنیت سے کسی کو مخاطب کرنا عرب میں تعظیم کی علامت تھی۔ (ابن اثیر، اصابہ ج اول)۔

قول الاحنف[1] ... اور ویسے آپ جو بھی طے کریں گے ہمارا فرض تو سمعنا و اطعنا ہے۔ اور اس پر ایک شامی کھڑا ہوا اور بولا کہ ہم نہیں سمجھے کہ یہ عراقی زبان کہنا کیا چاہتی ہے ہم تو بس سمع و طاعت جانتے ہیں اور سیدھی سیدھی بات۔ اس پر لوگ منتشر ہو گئے اس طرح کہ احنف کا قول ان کی زبان پر تھا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ وفود کا اجتماع حضرت امیر معاویہ منعقد کر رہے ہیں۔ وفود بھیجے ہوئے اُن کے گورنروں کے ہیں۔ ماحول دمشق کا ہے۔ سب تقریریں یزید کی ولی عہدی کی حمایت میں ہو رہی ہیں۔ بعض تقریروں میں بڑی صفائی، صراحت اور سنجیدگی سے اُسے اُسی سیرت اور اُن صفات کا حامل بتایا جا رہا ہے جو منصب خلافت کو درکار ہیں۔ ایسے ماحول میں صرف ایک تقریر، نہایت مختصر حضرت احنف بن قیس کی ہوتی ہے، جو بہت محتاط اور بند بند طریقے پر کچھ مختلف رائے دیتے ہیں[2]۔ مگر ساتھ میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جو بھی فیصلہ امیر المؤمنین کر دیں گے ہم اُس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ فرمانبرداری کریں گے۔ پھر اس تقریر کے بعد ایک شامی کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ یہ کیا "نیمے دروں نیمے بروں" کا انداز ہے۔ ہم شامی صرف ایک اور سیدھی بات جانتے ہیں۔ سمع اور طاعت!

---

[1] ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۴۹-۲۵۰ [2] کچھ اسی طرح کی بات وفد مدینہ کے محمد بن عمرو بن حزم سے بھی منسوب کی گئی ہے۔ مگر سے وفود کے اجتماع کی کارروائی میں نہیں اس کارروائی سے باہر دکھایا گیا ہے۔ اجتماع میں اُن کی شرکت نہیں دکھائی گئی۔ اس لئے ہم نے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا ہے۔

کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے ماحول میں یہ اجتماع بلا کسی فیصلے کے انتشار پر ختم ہوا ہوگا؟ جیسا کہ ابن اثیر بتاتے ہیں۔ بظاہر یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے اور اس لئے وہ نتیجہ جو ابنِ اثیر بتاتے ہیں کہ:۔

استوثق لہٗ اکثر الناس وبایعہٗ۔ — لوگوں کی اکثریت نے توثیق کردی اور بیعت کرلی۔

یہ نتیجہ اسی اجتماع کا ہونا چاہیئے جو اسی مقصد کے لئے بلایا گیا تھا نہ کہ اُس (خیالی) مدارات وعطا کا جس کا کوئی ثبوت اور حوالہ دیئے بغیر ابن اثیر اس نتیجے کو اُسی کا کرشمہ ٹھیراتے ہیں

دمشق کے اس اجتماع کی کارروائی کے ذکر سے ہمارا مقصد صرف اُس کمی کو پورا کرنا تھا جو طبری کی روایت میں رہ گئی تھی: تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس روایت کے مطابق حضرت معاویہ نے حجاز کا سفر کر کے حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ سے جو یہ کہا کہ سب لوگ یزید کی ولی عہدی کے لئے بیعت کر چکے ہیں تم ہی لوگ کیوں مخالفت کر رہے ہو؟ تو اس کا پس منظر کیا تھا، کب اور لوگوں نے بیعت کر لی تھی۔ اور کس طرح یہ کارروائی ہوئی تھی؟

ابن اثیر اور حضرت معاویہؓ کا سفرِ حجاز

ابن اثیر کے بیان نے معاملہ کی ایک اچھی خاصی — یا کم از کم فی الجملہ — معقول صورت کو جس طرح خواہ مخواہ بدصورت کرنے کی کوشش کی ہے وہ ابھی ہم نے دیکھی۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جنھوں نے ہماری تاریخ کے اس باب کو قطعی یک طرفہ اور نامنصفانہ رنگ دیدیا ہے۔ اب اس کے بعد ابن اثیر کی زبانی حضرت معاویہ کے سفر حجاز کی روداد بھی سن لیجئے اس میں ابن کثیر کے اس مجمل بیان کی جو ہم اوپر دے آئے ہیں — تفصیل ہے کہ جو — چار یا پانچ — اصحاب مخالفت کر رہے تھے اُن کو حضرت معاویہ نے ڈرا دھمکا کر خاموش کیا۔ اور اسی تفصیل کے اجزاء کافی مشہور ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کے لچر پن کی انتہا

نہیں ہے۔ اور اس کے باوجود اُن کی شہرت و قبولیت کو ہم صرف اپنی روایات پرستی کی معراج کہہ سکتے ہیں[1]۔

ابن اثیر بتاتے ہیں کہ جب "لطف و عطا و مدارات" کے ذریعۂ "اکثر الناس" کی اور خصوصاً اہل عراق و شام کی بیعت یزید کی ولی عہدی کے لئے حاصل کر لی گئی تو معاویہؓ نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ حجاز کا رُخ کیا۔ چلتے چلتے مدینے کے پاس پہنچے تھے کہ اوّل آدمی جو نظر پڑا وہ حسین بن علیؓ تھے۔ معاویہ اُنھیں دیکھ کر بولے:-

لا مرحبا ولا اھلاً بدنۃ	استغفراللہ، یہ کون نظر آیا قربانی کا
یترقرق دمھا واللہ مھریقھا	بکرا ہے جس کا خون اچھل رہا ہے اور اللہ اسے بہائے گا۔

حسینؓ نے جواب دیا:-

مھلاً فانی واللہ لست	ایسی درشتی مت کیجئے۔ میں واللہ
باھل لھذہ المقالۃ۔	ایسی بات کا مستحق نہیں ہوں۔

معاویہ بولے، "اس سے بھی بڑی بات کے مستحق ہو"۔ پھر ابن زبیر ملے اُن کو دیکھ کر بولے: "مکار گوہ، جو اپنا سر بِل میں گھسا لیتی ہے اور دم سے مارا کرتی ہے، لیکن قریب ہے کہ دم سے پکڑ لی جائے گی اور کمر توڑ دی جائے گی۔ اسے مجھ سے دور کرو" چنانچہ انکی سواری کے منھ پر دو ہنٹر مار کر راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اسکے بعد عبدالرحمن بن ابی بکر ملے۔ معاویہ بولے "لا اھلاً ولا مرحبا۔ بوڑھاپے جو سٹھیا گیا اور عقل سے بیدل ہوا" یہ کہہ کر اُن کو بھی راہ سے ہٹا دیا گیا۔ اور یہی سلوک ابن عمر کے ساتھ کیا گیا۔ تب یہ لوگ معاویہ کے ساتھ ساتھ مدینے کی طرف کو چلدیئے،

---

[1] اسی روایت پرستی کا ماتم اقبال نے کیا ہے ؎

یہ امت روایات میں کھو گئی	حقیقت خرافات میں کھو گئی

درانحالیکہ وہ انکی طرف کوئی التفات نہیں کر رہے تھے[1]۔ مدینہ پہنچ کر یہ لوگ معاویہ کے پیچھے پیچھے اُنکی اقامت گاہ پر بھی پہنچے جہاں ان کا انکی حیثیت اور خواہش کے مطابق استقبال نہیں ہوا۔ تب یہ لوگ مدینہ چھوڑ کر مکے چلے گئے۔ معاویہ نے مدینے میں ایک تقریر کی جس میں خلافت کے لئے یزید کی اہلیت اور دوسروں پر اُسکی فوقیت بیان کر کے مخالفت کرنے والوں کو دھمکایا کہ اسے اب برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اسکے بعد ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے یہاں حاضری دی جہاں ام المؤمنینؓ نے اُن سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم نے حسینؓ وغیرہ کو قتل کی دھمکی دی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ام المؤمنینؓ یہ لوگ فی الواقع اس سے بالاتر ہیں لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں یزید سے بیعت کر چکا ہوں۔ اور ان لوگوں کے ماسوا سب بیعت کر چکے ہیں تو کیا اب یہ بیعت توڑ دی جائے؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ نہیں، مگر ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، مجھے امید ہے کہ جو تم چاہتے ہو وہی ہو جائے گا معاویہ بولے کہ بہت اچھا میں ایسا ہی کروں گا۔ پھر کچھ دن ٹھہر کر مکے کو روانہ ہوئے اور اب خواہش کی کہ ان چاروں (حضرت حسینؓ وغیرہ) سے ملیں — جو کہ مکے ہی میں تھے — اس خواہش کا علم ان لوگوں کو ہوا تو وہ بطن مر (مرّ الظہران[2]) میں آکر ملے۔ سب سے پہلے ملنے والے حسینؓ تھے۔ اُنھیں دیکھ کر معاویہ بولے "مرحبًا واھلًا یا ابن رسول اللہ وسید شباب المسلمین" اور حکم دیا کہ ان کے لئے سواری لائی جائے۔ پس وہ اب سوار ہو کر معاویہ کے ساتھ ساتھ چلے۔ علیٰ ہذا باقی تین کے ساتھ بھی معاملہ کیا۔ اور اب ان چاروں کے جلو میں اس طرح چلے کہ کوئی پانچواں اس زمرے میں شامل نہیں تھا۔ اور اسی شان کے ساتھ ان چاروں کو لیکر مکے میں

---

[1] یہاں ایک بار پھر نوٹ کر لیجئے کہ ابن عباسؓ کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔

[2] مکہ سے چار یا پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام۔ معجم البلدان۔ اس کو وادی فاطمہ بھی کہتے ہیں۔

داخل ہوئے۔ پھر جتنے دن رہے، ہر دن نیا اکرام اور نیا احسان تھا۔ اور دوسری کوئی بات نہیں تھی حتیٰ کہ عمرے کے ارکان ادا ہو گئے اور چل چلاؤ کا وقت آنے لگا تو اِن چاروں نے آپس میں کہا کہ کسی دھوکے میں نہ آجانا۔ یہ سب جو ہو رہا ہے ہماری محبت میں نہیں ہو رہا ہے مطلب سعدی دیگرست۔ لہٰذا جواب سوچئے کہ جب مطلب کی بات تم سے کہی جائے گی تو کیا کہنا ہے۔ پس ان لوگوں نے طے کیا کہ بڑے میاں مطلب کی بات کہیں گے تو ابن زبیرؓ ان کو جواب دینگے۔ چنانچہ وہ وقت آگیا اور معاویہ نے اُن کو طلب کر کے کہا کہ تمہارے ساتھ جو میرا رویّہ رہا ہے وہ تم جانتے ہو تم سے رشتہ داریوں کا جو پاس ولحاظ مجھے رہا ہے وہ بھی تم پر عیاں ہے۔ اور اسکے مقابلے میں جو تم لوگوں کی روش رہی ہے اُس کیلئے میرا تحمل بھی تم سے مخفی نہیں۔ اب اس وقت بات یزید کی ہے۔ وہ تمہارا بھائی ہے تمہارا ابن عم ہے میں چاہتا ہوں کہ خلافت کے عہدے کیلئے تم اُسے آگے بڑھاؤ۔ رہے خلافت کے اختیارات عزل ونصب۔ تحصیل خراج وتقسیم دولت، وہ سب تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔ یزید تمہارے آڑے نہیں آئے گا۔ یہ لوگ خاموش رہے۔ کچھ بولے نہیں۔ معاویہ نے دوبارہ کہا کہ تم کچھ جواب نہیں دیتے! پھر ابن زبیر سے مخاطب ہوئے کہ تم بولو تم ہی ان کے خطیب ہو۔ اب ابن زبیر نے جواب دیا کہ میں تین باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ اپنے بعد کیلئے ایسے چھوڑ جائیے جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے کہ کسی کا تقرر نہیں کیا۔ لوگوں نے ابوبکرؓ کو منتخب کر لیا۔

معاویہ بولے کہ آج تم میں کوئی ابوبکرؓ جیسا نہیں ہے پس اختلافات ہونگے۔

۲۔ ابن زبیرؓ نے کہا کہ اچھا پھر ابوبکرؓ کی طرح کیجئے کہ خلیفہ نامزد کیا مگر اپنی اولاد یا اپنے خاندان کا نہیں۔

۳۔ یا عمرؓ کی طرح کیجئے کہ انتخاب خلیفہ کے لئے شوریٰ نامزد کردی مگر اس میں اپنی اولاد یا خاندان کے کسی فرد کو نہیں رکھا۔

معاویہ نے کہا اور کوئی صورت تمہارے پاس پیش کرنے کو نہیں ہے!

ابن زبیرؓ بولے کہ نہیں۔ باقی لوگوں سے پوچھا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔

معاویہ نے کہا اچھا بس اب بات چیت ختم ہوئی۔ میں نے چاہا تھا کہ تم لوگوں کی رضامندی بھی حاصل کر لوں۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ نہیں ہو سکے گا پس حجت تمام ہوئی۔ اب کوئی مجھے الزام نہ دے۔ اب تک میرا معاملہ یہ تھا کہ میں تقریر کرنے کھڑا ہوتا اور تم میں سے کوئی بھی برسرِ عام میری تکذیب کرنے کھڑا ہو جاتا تو میں اسے برداشت کر لیتا اور درگزر کر جاتا تھا لیکن آج مجھے لوگوں میں کچھ کہنا ہے۔ اس موقع پر اگر تم میں سے کسی نے میری تکذیب کی تو بخدا دوسرا کلمہ نکالنے سے پہلے تلوار اُس کے سر پر پہنچ چکی ہوگی۔ یہ کہہ کر اپنے محافظ دستے کے سربراہ کو بلایا اور کہا کہ ان میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے دو آدمی شمشیر بکف مسلط کرو۔ اور ہدایت کرو کہ اگر میری تقریر کے دوران اُن میں سے کوئی کچھ بولے تو اُسکی گردن اُڑا دیں۔ اسکے بعد معاویہ اور اُنکے ساتھ یہ چاروں بھی چلے حتیٰ کہ معاویہ منبر پر پہنچے اور حمد و ثنا کے بعد کہا کہ یہ (حسینؓ، ابن زبیرؓ، ابن عمرؓ ابن ابوبکرؓ) ساداتِ مسلمین اور عمائدین ملّت ہیں۔ جن کے مشورے ہی سے تمام کام انجام پاتے ہیں انھوں نے یزید کی ولی عہدی قبول کی اور بیعت کر لی ہے' بس اب آپ سب لوگ بھی اللہ کا نام لے کر بیعت کریں۔ چنانچہ سب اہلِ مکہ نے بیعت کر لی۔ اور معاویہ نے اُسی وقت سواری کھنچوائی اور مدینہ کو روانہ ہو گئے۔ اب اہل مکہ نے ان لوگوں سے سوال کیا کہ آپ لوگ تو کہتے تھے ہم ہرگز بیعت نہیں کریں گے۔ یہ کیا ہوا؟ ان لوگوں نے کہا کہ بخدا ہم نے بیعت نہیں

کی ہے۔ لوگوں نے کہا پھر آپ نے تردید کیوں نہیں کی۔ اُس آدمی کو بولنے کیوں دیا!
بولے اس نے ہمارے ساتھ داؤں کھیلا اور ہم ڈر کے مارے نہیں بول سکے۔ اُدھر
معاویہ مدینے پہنچ گئے۔ اور مدینہ والوں نے بھی بیعت کرلی۔ یہ کام کر کے معاویہ
شام روانہ ہوگئے۔ اور بنی ہاشم کے ساتھ اپنے برتاؤ میں سختی شروع کی (یعنی
وظائف وغیرہ روک دیئے) اس پر ابن عباس دمشق پہنچے اور کہا کہ یہ کیا قصّہ
ہے؟ معاویہ نے کہا قصہ کیا ہوتا۔ وہ تمھارے حسین صاحب بیعت نہیں کر رہے
ہیں۔ اور تم لوگ اُن سے کچھ نہیں کہہ رہے۔ ابن عباسؓ نے کہا: معاویہ تم جانتے ہو کہ
میں اگر چاہوں تو بعض ساحلی علاقوں میں جاکر ڈیرا ڈال دوں اور وہاں کے
لوگوں کو تمھارے خلاف کھڑا کردوں۔ بولے: نہیں نہیں ابن عباس تمھیں
تمہارے وظائف دیئے جائیں گے تمھیں راضی رکھا جائے گا، اور بلکہ پہلے سے زیادہ
دیا جائے گا۔"[1]

ایک لمحۂ فکر

ذرا غور کیا جانا چاہیئے کہ اس پورے بیان میں سوائے اُن دو تین جملوں کے جن کا
تبادلہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان ہوا۔ اور یا پھر سوائے اُس
مختصر گفتگو کے جو حضرت ابن زبیر اور حضرت معاویہؓ کے درمیان انتخاب خلیفہ کے موضوع پر
ہوئی۔ کوئی اور بات ہے جس کا کوئی سنجیدہ آدمی یقین کرسکے؟ امیر معاویہ کے لئے تو ہر بُری
اور گری بات ہم نے رٹی ہوئی یقین فرض کر رکھی ہے۔ اس لئے اُن کے مسلّمہ اخلاق حلم، مدارات
رکھ رکھاؤ وغیرہ کے علی الرغم مان لیجیئے کہ وہ مدینے کے پاس حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ
عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے ساتھ ایسی ہی بدخلقی سے پیش آئے جیسی بدخلقی

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۲-۲۵۱

مذکورۂ بالا بیان میں دکھائی گئی ہے۔ مگر کیا یہ بھی اتنی ہی آسانی سے ماننے کی چیز ہے کہ یہ معززین مدینہ امیر معاویہ کے ہاتھوں نہ صرف اس آخری درجے کی تذلیل و تحقیر کا نشانہ بننے پر بے چون و چرا راضی ہو گئے۔ بلکہ "ھل من مزید ؟" کہتے ہوئے پھر اُنہی کے پیچھے لگے رہے اور بار بار ان کے ہاتھوں تذلیل ہی کے جام پی کر کہیں ان کی سیری ہوئی، کہ ناراض ہو کر یا شرمندہ ہو کر مکہ چلے جانے کا خیال اُن کو آیا ــــ لیکن یہ ناراضگی یا شرمندگی بھی پھر کچھ دیرپا نہ ثابت ہوئی۔ جیسے ہی مکہ کے قریب پہنچ کر امیر معاویہ نے ان کو یاد فرمایا یہ پھر دوڑ کے "مکے" سے باہر ہی ان کے استقبال کو پہنچ گئے اور پھر اُن کی عنایتوں اور عطاؤں سے سرفراز ہونے کو یہ جانتے بوجھتے تیار ہو گئے کہ یہ سب بناوٹ اور یزید کے لئے خواہش بیعت کی تمہید ہے! استغفر اللہ۔ یہ وہی ابن عمرؓ، ابن ابوبکرؓ، ابن علیؓ اور ابن زبیرؓ ہیں جن کی عظمتوں کے کلمے ہم پڑھتے ہیں؟ یا جنسِ عظمت سے عاری اُن کے ہم نام چند بونے اور یا لشئے ــــ یا کہ مسخرے؟ استغفر اللہ، یہ معاویہ دشمنی کا اندھاپن تو دیکھئے۔

اور ابھی بس کہاں ہے؟ ہم نے تو اس قصے میں یہ بھی پڑھا کہ یہ جن کے ناموں کی دھوم ہے کہ ان کا مرنا اور جینا حق کے لئے تھا۔ انسانی، روحانی اور اخلاقی رفعتوں کیلئے تھا۔

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

وہ حسین بن علیؓ جنھوں نے اپنی اور اپنی اولاد کی اور اپنے اہل خاندان کی گردنیں کربلا میں کٹوا دیں۔ مگر عبید اللہ بن زیاد کے جبر کے آگے کسی قیمت پر جھکنا گوارا نہ کیا۔ وہ ابن زبیرؓ جو شیروں کی موت مرے ذلت کی زندگی قبول نہیں کی، وہ ابن عمرؓ جنھیں حق بات کہنے سے کبھی کوئی نہیں روک سکا۔ اور ہر جابر اُن کے رعب حق پرستی کے آگے جھکا۔ اور وہ ابن ابی بکرؓ جو حسب روایات ولی عہدیٔ یزید کی مخالفت میں ہمیشہ سب سے آگے، سب سے تیز اور صاف گو رہے۔ اِن شیرانِ خدا کے بارے میں اِس روباہی کا یقین ہمیں دلایا جا رہا ہے کہ امیر معاویہ نے جو دھمکی دی کہ "خبردار جو زبان کھولی" تو ان سب کے پورے وجود پر

"... لرزہ اور سکتہ طاری ہوا کہ معاویہ خانۂ خدا میں مجمع کے سامنے، ان کی موجودگی.... میں اِن کے بارے میں یہ غلط بیانی کرتے رہے کہ یہ چاروں یزید کی بیعت کر چکے ہیں اور اِن میں سے کسی کے لب کو جنبش نہیں ہو سکی!

کیسی ناقابلِ تصور باتیں ہیں! مگر ہمارے یہاں ٹیکسالی سکّوں کی طرح چل رہی ہیں، ابن کثیر جیسا محتاط مؤرخ بھی معاویہ دشمنی کی اندھی وباء کے اِس زہر سے نہیں بچ پایا اور تفصیل سے گریز کے باوجود اتنا بہر حال لکھدیا.... جیسا کہ گزر چکا ــ کہ:

"معاویہ نے ان میں سے ہر ایک کو الگ بلا کے ڈرایا دھمکایا.......
پھر ان کی موجودگی میں منبر پہ جا کے تقریر کی جس پر لوگوں نے یزید کی بیعت کر لی اور یہ خاموش بیٹھے دیکھتے رہے۔ کیونکہ اُنھیں ڈرایا دھمکایا جا چکا تھا۔"

اسے اگر معاویہ دشمنی کا اندھا پن نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ معاویہ کا چہرہ (معاذ اللہ) سیاہ کرنے کے جوش میں اس بات کا ہوش بھی کھو یا گیا کہ اُن کے چمکدار چہروں پر بھی سیاہی پھیری جا رہی ہے جن کی خاطر معاویہ سے دشمنی ٹھیرائی ہے۔

اور ذرا یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ یہ واقعہ کس جگہ کا بیان کیا جا رہا ہے؟ ابن اثیر کے بیان کے مطابق حرم مکی (مسجد حرام) کا اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق حرم مدنی (مسجد نبوی) کا۔ کیا کسی "معاویہ" کی واقعی یہ جرأت تھی کہ ان دونوں حرموں میں سے کسی حرم کے اندر شمشیر بدست لوگوں کو اِن حضرات کے سروں پہ مسلط کر کے حکم دے کہ ولی پہ گردن اڑا دی جائے؟ سچی بات یہ ہے کہ اگر واقعہ میں یہ سب ہوا تھا۔ اور یہ حضرات، خصوصاً حسین بن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ، اس وقت جرأت دکھانے اور جان پر کھیلنے کے بجائے ڈر سہم کر بیٹھ گئے تھے، تو پھر یزید کی خلافت کے قیام کی ذمہ داری میں یہ شریک ہوئے۔ اور تین چار سال اسی خاموشی میں گزار کر سنہ ۶۰ھ میں وفات معاویہؓ کے بعد جو کھڑے ہوئے تو بے جواز بھی کھڑے ہوئے اور بے وقت بھی۔

علی ہذا، یہ اضطراب بیان کس بات کی چغلی کھا رہا ہے؟ ابن اثیر کہتے ہیں کہ واقعہ حرم مکی[۱] کے اندر پیش آیا جبکہ ابن کثیر کا بیان ہے کہ حرم مدنی میں پیش آیا؟ ایسی روایت پر کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

غرض کوئی ایک نہیں، سبھی کلیں اس روایت کی ٹیڑھی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ اسلام اور مشاہیر اسلام کا مضحکہ اُڑانے کے لئے یہ روایت بنائی گئی ہو[۱]۔ مگر ہمارے مؤرخین نے اسے ایک "تاریخی امانت" کے طور پر محفوظ رکھنا ضروری سمجھا واللہ اعلم اِن حضرات کے سامنے — جو کہ علم دین کے بھی ماہرین میں سے ہوئے ہیں — کیا چیز تھی جس نے حدیث نبوی "کَفٰی لِلْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ" آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ جو بات سنے (بلا تحقیق کئے) نقل کر دے۔ اور آیت قرآنی :-

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا.....	اے ایمان والو جب کوئی فاسق کوئی خبر تم کو پہنچائے تو ذرا اُس کی تحقیق کر لیا کرو۔

کو تاریخی واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں قابلِ اعتناء نہیں سمجھا جبکہ حدیث کی روایات کے سلسلے میں ان ہدایات کا خیال ضروری مانا گیا ہے؟

واقعہ کی قرین قیاس صورت؟

اوپر کی بحث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سرے سے کسی ایسے واقعے کے وجود ہی کا انکار

[۱] اس سلسلے میں روایت کا آخری جزو حضرت ابن عباس کی دھمکی والا بھی دیکھ لیجئے اور پھر حضرت معاویہؓ کا جواب بھی۔ کیا اسے مسخروں (CLOWNS) کی لڑائی کے سوا کچھ اور کہہ جائے گا؛ وہ بھی وہ معاویہؓ جو حجاز میں جا کر حجازیوں پر شیر ہو گئے اور اپنے پایۂ تخت دمشق میں بالکل بھیڑ! انا ستر ثم انا ستر۔

کر دیا جائے جس میں حضرت معاویہؓ نے رفعِ اختلاف کی خاطر حجاز کا کوئی سفر کیا ہو اور ان حضرات (حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ) سے ملے ہوں جن کو یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے اِبا (انکار) تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارے خیال میں تو یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ان ملاقاتوں میں کوئی تلخی ترشی ہی نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اُس طرح کے قصے ہرگز نہیں پیش آئے جو ابن اثیر کی تاریخ نے سنائے ہیں۔ واقعہ کی تمام روایات و بیانات کو دیکھتے ہوئے اور مذکورہ بالا بحث میں اُٹھائے گئے نکات و سوالات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے روایات کے جو اجزاء قابلِ قبول نظر آتے ہیں۔ اُن کی روشنی میں سارے قصے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت امیر معاویہؓ، جیسا کہ ابن کثیر کا بیان ہے، عمرے کی نیت کر کے شام سے حجاز کے لئے نکلے۔ اور عمرے سے فراغت پا کر مدینۂ منورہ میں قیام کیا۔ یہاں انھوں نے مدینے کے ان حضرات سے بات کر کے جو یزید کی ولی عہدی کے مخالف تھے اُس الجھن کو دور کرنا چاہا جو اُن کی مخالفت کی وجہ سے اس معاملے میں پڑ رہی تھی۔ یہ لوگ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین بن علیؓ۔ ان حضرات سے حضرت معاویہؓ کی گفتگو کی روداد کے سلسلے میں طبری کی روایت زیادہ قرینِ قیاس تھی جو صفحہ ۸۴ پر گزر چکی ہے۔ کیونکہ :-

(الف) یہ چاروں افراد میں سے ہر فرد کے ساتھ علیٰحدہ گفتگو دکھاتی ہے۔ اور حضرت معاویہ جیسے مدبّر اور سیاست داں سے ایسے حالات میں کہ ایک مخالفت کا محاذ انھیں توڑنا ہے۔ یہی بات قرینِ قیاس ہے کہ وہ ہر فرد سے الگ اور تنہا گفتگو کریں۔

(ب) یہ ان چار افراد کو تین خانوں میں بانٹتی ہے۔ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کا ایک خانہ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا الگ خانہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن

ابی بکرؓ کا ایک تیسرا خانہ۔ اور یہ بالکل واقعی تقسیم ہے۔ یہ چاروں حضرات اسی طرح کی تقسیم کے مستحق تھے۔ اور حضرت معاویہ جیسے صاحب نظر اور صاحب بصیرت آدمی سے یہی توقع کی جانی چاہیئے کہ وہ اِن حضرات کی اسی طرح زمرہ بندی کریں۔ اور ہر ایک سے اس کے زمرے کے مطابق گفتگو کریں۔ چنانچہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیر سے انھوں نے بالکل ایک بات کی اور دونوں نے ایک ہی جواب بھی دیا۔ اور یہی دونوں حضرات تھے جنھوں نے حضرت معاویہؓ کے بعد یزید کی خلافت اور طاقت کو چیلنج کرنیکی یکساں روش اختیار کی۔ یہ گفتگو دونوں طرف سے بالکل سیاسی انداز کی اور نہایت ناپ تول والی نظر آتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی پوری زندگی کی روشنی میں یہ اطمینان کیا جا سکتا تھا کہ وہ خود اپنے لئے خلافت کے دعویدار نہیں ہو سکتے۔ ان معاملات میں اُن کی سب سے بڑی دلچسپی امت کا اتحاد ہے۔ وہ بالآخر یزید پر راضی ہو جائیں گے، چنانچہ ان کی گفتگو بھی یہی تاثر دیتی ہے۔ اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے بات میں بھی ایک کھلا پن اور اعتماد کی کیفیت نظر آتی ہے۔ حضرت عبدالرحمن (اگر ۵۶ھ میں زندہ تھے تو) خلافت کے دعویدار نہ ہوتے ہیں تو لیکن یہ حضرت عبداللہ بن عمر ہی کے زمرے کے آدمی تھے۔ مگر یزید کی مخالفت میں سب سے زیادہ متشدد پائے جاتے تھے۔ اور اسلامی نظام خلافت میں باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی کی بظاہر کوئی گنجائش نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی گفتگو دیکھی جائے تو دونوں ایک دوسرے کے لئے ناقابل برداشت نظر آتے ہیں۔ نہ سمجھنے کی کوئی امید پائی جاتی ہے، نہ سیاسی مکالمے کی کوئی گنجائش! یہ بات کتنی ہی ناخوشگوار ہو لیکن طرفین کی پوزیشن کے پیش نظر سمجھ میں آنے والی ہے۔ طرفین دو انتہاؤں پر تھے۔

طبری کی روایت کے یہ دو پہلو (الف، و ب) ایسے ہیں جو ہمیں آ. دہ کرتے ہیں

اس رودادِ گفتگو کو بطور واقعہ تسلیم کرلیں[۱]۔ مگر روایت کی دو یا تین کمزوریوں کی وجہ سے ہم اس پر زور نہیں دے سکتے:

۱۔ روایت کا بنیادی راوی قطعی نامعلوم شخصیت ہے: "رجل" بنخلۃ' (نخلہ کا ایک آدمی) اور پیچھے جہاں روایت گزری وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ نخلہ بھی کوئی ایک متعین جگہ نہیں ہے۔ اس نام کی دو بستیوں کا ذکر معجم البلدان میں ہے۔

۲۔ یہ روایت مخالفین میں پانچ آدمیوں کا شمار کرتی ہے۔ اور پانچواں نام حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا دیتی ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر ایک جگہ بحث آچکی ہے۔ اس نام کا شمار قطعاً غلط ہے۔ اور اس کی ایک دلیل یا قرینہ ــــ خود روایت ہی میں موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ کوئی گفتگو روایت میں نہیں دکھائی گئی۔

۳۔ اس میں گفتگو کی جگہ کا نام تو نہیں لیا گیا کہ مکّہ تھا یا مدینہ، مگر حضرت عبداللہ بن زبیر کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے گئے ہیں کہ "یا امیر المؤمنین نحن فی حرم اللّٰہ عزّ وجل" (امیر المؤمنین ہم اس وقت حرمِ الٰہی میں ہیں) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات چیت کہ "مکّہ میں ہوئی تھی۔ جبکہ جن لوگوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابن ابی بکرؓ کو اس گفتگو کے وقت تک زندہ بتایا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے ــــ جیسا کہ پیچھے اس سلسلے کی بحث میں گزر چکا ــــ کہ وہ حضرت معاویہؓ کے اس سفر ہی کے دوران میں یزید کے لئے اُن کی مہم سے ناراض ہوکر مکّہ چلے گئے تھے اور اس سفر ہی میں مکّہ سے آٹھ دس میل دور رات کو سوتے میں اُن کا انتقال ہوگیا تھا۔ تب اس کا

---

[۱] جبکہ ابن اثیر کی روایت میں جو گفتگو بیان کی گئی ہے۔ اس میں مخالفین کی طرف سے حضرت ابن زبیرؓ کی گفتگو تو قرینِ قیاس ہوسکتی ہے۔ مگر حضرت معاویہؓ کی طرف سے منسوب باتیں بالکل بیگانہ اور خدمت نیں سی ہیں اتنے سخت مخالفین سے ایسی بےگانہ بھلا دینے کی باتیں حضرت معاویہ کے متعلق نہیں سوچی جاسکتیں۔

مطلب یہ ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰن کا اگر ۵۳ھ میں انتقال نہیں ہو چکا تھا (جو کہ عام طور پر اُن کا سنہ وفات مانا گیا ہے۔ اور وہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ کے اس سفر کے وقت بقید حیات تھے تو لازماً حضرت معاویہؓ سے اُن کی ملاقات کی جگہ مدینہ ہے نہ کہ مکہ۔

ان تین موٹی موٹی باتوں کی وجہ سے طبری کی روایت کے متعلق ہم یہ اطمینان تو نہیں کر سکتے کہ فی الواقع یہی گفتگو ان حضرات کے درمیان پیش آئی ہوگی۔ مگر اس کے حق میں جانے والے قرائن کو دیکھتے ہوئے۔ اور ابن اثیر وغیرہ کے بیانات کے سلسلے میں یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک طرف تو وہ قطعاً ناقابل تصور ہیں جیسا کہ تفصیلی بحث کر کے دیکھا جا چکا۔ اور دوسری طرف سرے سے کوئی سند ہی اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔ ہمیں روداد گفتگو کی حد تک طبری کا بیان بہرحال قابل ترجیح اور واقعیت سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

اور اس گفتگو کے بعد جس میں کوئی خاص امید افزا بات نہیں تھی ظاہر ہے کہ حضرت معاویہ کو اس نتیجہ پر پہنچ جانا تھا کہ یہ لوگ فی الحال بیعت کرنے والے نہیں ہیں — جبکہ اور سب جگہ بیعت ہو چکی ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بیعت اور ولی عہدی توڑ دی جائے گی کہ رکھی جائے گی؟ اسے مضبوط اور مکمل کیا جائے گا۔ یا ایک غیر منفصل اور غیر یقینی حالت میں رکھا جائے گا؟

حضرت معاویہؓ جیسے ایک مضبوط ارادے کے شخص سے ایک انتہائی ذمہ دار حیثیت کے شخص سے یہ توقع غالباً نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ایسے علاقے کے تین چار افراد کے اختلاف کی بنا پر جس کا سیاسی وزن حضرت علیؓ کے مدینہ کو چھوڑ کر کوفے کو دارالخلافہ بنا لینے کے بعد سے ختم ہو گیا تھا اپنی اب تک کی ساری کارروائی لپیٹ کر رکھ دیں گے۔ اور اپنے بارے میں ایک کمزور اور کوتاہ بیں حکمراں ہونے کا تأثر دیں گے، جبکہ وہ اپنی کارروائی کو ملت کی

ایک ناگزیر ضرورت کی نظر سے بھی دیکھ رہے تھے جیسا کہ آگے آئے گا۔

ہمارے نزدیک قرین قیاس ہے کہ انھوں نے ان حضرات کو (ان کی ذاتی حیثیتوں کے باوجود) نظر انداز کر کے دیگر اہلِ مدینہ کو خطاب کرنے اور اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ اور یہی وہ خطاب رہا ہوگا جس کا ذکر ابن اثیر کی روایت میں گزرا۔ جس کا خلاصہ اُن کے بیان کے مطابق یہ تھا:۔

وخطب معاویة بالمدینة	اور معاویہ نے مدینے میں خطاب
فذکر یزید ومدحه	کیا۔ جس میں یزید کا ذکر کر کے
وقال من احق منه	اُس کی خوبیاں بیان کیں اور
بالخلافة فی فضله وعقله	باعتبار عقل، فضل اور حیثیت
وموضعه وما اظن قومًا	اُسے خلافت کے لئے موزوں تر
بمنتهین حتّٰی تصیبهم	بتاتے ہوئے کہا کہ جو لوگ
بوائق تجتث اصولهم	مخالفت کر رہے ہیں میں سمجھتا
وقد انذرت ان اغنت	ہوں کہ وہ اپنے آپ کو تباہ کئے بغیر
النذر[1]	باز آنے والے نہیں ہیں۔

ابن اثیر کے اس بیان کی بھی ایسی کوئی سند نہیں ہے کہ اس کو رد کرنا مشکل ہو۔ بلکہ سرے سے سند ہے ہی نہیں۔ لیکن اُس وقت کے جو حالات ہمارے سامنے آرہے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ بعید نظر نہیں آتی کہ حضرت معاویہؓ اِن حضرات کے اختلاف سے تنگ آرہے ہوں اور اپنی ذمہ داری کا تقاضہ سمجھ رہے ہوں کہ سختی کا انداز اختیار کر کے اس اختلاف کو دبایا جائے۔ چنانچہ

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۱

انھوں نے اپنے اس خطاب میں اس طرح کے جملے بھی کہے ہوں. جن کی ترجمانی ابن اثیر نے مذکورہ بالا الفاظ سے کی ہے. مگر سختی کا وہ انداز کہ اُن لوگوں کو جلسے میں شریک کر کے زبان بند رکھنے کا حکم دیا جائے اور شمشیر بکف سپاہی ان کے سر پہ مسلط کئے جائیں تاکہ خوف کا عالم اُن پہ طاری رہے. یہ قطعی ناقابل یقین بات ہے. نہ حضرت معاویہ کے بیس سالہ دور میں اس جبر و ستم کی ـــــ اور خاص طور سے اِن مؤقر حضرات کے ساتھ ـــــ کوئی مثال ملتی ہے. نہ اہل مدینہ سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جبر کا یہ مظاہرہ دیکھتے ہوئے خاموش رہ جاتے. اور نہ ہی اِن بزرگوں کے متعلق تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے بزدل اور پست ہمت تھے کہ مالک بن انسؒ، احمد بن حنبلؒ اور ابو حنیفہؒ کی مثال بھی پیش کرنے کے اہل نہ ہوئے. اور مزید برآں یہ جبر بالکل بے کار تھا اگر ان حضرات کو اس کے بعد پابند نہ کیا جاتا اور اس پابندی کے لئے کوئی اطمینان بخش بند و بست نہ کیا جاتا کہ اب یہ اپنا اختلاف کسی پر ظاہر نہ کریں گے. مگر اس جبر کے قصّے ہی میں ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جیسے ہی معاویہؓ جلسہ ختم کر کے رخصت ہوئے ویسے ہی ان حضرات نے اس بات کا اظہار بھی کر دیا کہ اُن کے متعلق جھوٹ بولا گیا ورنہ انھوں نے نہ بیعت کی ہے نہ وہ اس سے راضی ہیں۔

فیصلہ کن بات

واقعہ یہ ہے کہ اس جبر و دباؤ والے قصّے کی روایتیں اتنی مختلف قسم کی ہیں کہ اوّل تو ان کا اختلاف ہی ان کو ناقابل توجہ بنا دینے کے لئے کافی ہے. اور وہ کافی نہ ہو تو جبر و دباؤ کے قصے پر جو اشکالات وارد ہوتے اور سوالات اُٹھتے ہیں اُن کی تاب یہ قصّہ کسی طرح نہیں لا سکتا. اور اس سب پہ مزید آخری درجے کی

اور نہایت واضح فیصلہ کن بات یہ ہے کہ یہ سب ہی مختلف روایتیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ جبر کا عمل کر کے بیعت حاصل کرنے کے بعد معاویہؓ فوراً ہی دمشق کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور ان مجبور حضرات کی زبانی سب اہل مدینہ کے سامنے اس جبر کا راز کھل گیا جس میں (ان حضرات پر جبر کے ساتھ) باقی اہل مدینہ سے جھوٹ اور غلط بیانی بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ :-

> کیا کوئی عقل باور کر سکتی ہے کہ اہلِ مدینہ سے جو بیعت اُن کی لاعلمی میں ایسے جبر اور جھوٹ کے بل پر لی گئی ہو اُس کے خلاف اُن کے اندر کوئی ردعمل اُس وقت نہیں ہوا ہوگا جب اُنھیں (فوراً ہی) پتہ ہوا ہوگا کہ اُن کے امیرالمؤمنین معاویہ اُن کے ساتھ کیسا فریب (معاذ اللہ) کر کے گئے ہیں ؟ کیا کوئی امکان سوچا جا سکتا ہے کہ ایسی بیعت جوں کی توں قائم رہ جائے ــــ ایک آدمی بھی نہ نکلے جو اپنی گردن سے اس دھوکے کی بیعت کو نکال کر پھینکتا ہوا بتایا جائے ؟

سب روایتیں بتاتی ہیں کہ جبر کا ماحول فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ معاویہ اپنے مسلح سواروں کو ساتھ لے کر واپس جا چکے تھے۔ لیکن ایک روایت بھی نہیں بتاتی کہ ادنیٰ شورش اور ادنیٰ ردعمل بھی مدینے کی آبادی میں اس "جبر و فریب" کے خلاف ہوا ہو۔ تب کیا یہ جبر اور جھوٹ کے قصے" سوائے جھوٹ کے کچھ اور ہو سکتے ہیں اور ان پر کان دھرنا چاہیئے ؟ مگر افسوس یہ خرافاتی باتیں آج کے تحقیق پسند دور میں بھی ٹیکسالی سکّوں کی طرح چل رہی ہیں۔ کیونکہ ہم ان باتوں کو دہرانے یا سننے کے پُشتہا پُشت سے

عادی ہو گئے ہیں۔ اور جس چیز کے ہم قدیم سے عادی چلے آرہے ہوں وہ ایک تو عادت کی وجہ سے نہیں چھوٹتی، دوسرے اُس کی قدامت جیسے ایک طرح کا تقدس اور ایک وزن اُسے بخش دیتی ہے۔

باب ششم

یزید کی ولی عہدی پر حضرت معاویہ کو اصرار کیوں؟
اور
دیگر حضرات کو اس سے اختلاف کیوں؟

اصرار

ہمارے سامنے ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر قطعی انداز میں کہا جا سکے کہ امیر معاویہ کو کیوں اصرار تھا کہ اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا جائیں۔
ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:۔

وذالك من شدة محبة الوالد	اور یہ بات اُس شدید محبت کی وجہ
لولده ولما كان يتوسم	سے تھی جو ایک باپ کو بیٹے سے ہوتی
فيه من النجابة الدنيوية	ہے۔ نیز اُس کی دنیوی شرافت
وسيما اولاد الملوك ومعرفتهم	و اصالت کی بنا پر اور خاص کروہ
بالحروب وترتيب الملك	جو بادشاہوں کی اولاد میں فنون
والقيام بأبهته وكان ظنه	جنگ اور نظم مملکت سے واقفیت
ان لا يقوم احد من ابناء	اور شاہانہ کروفر کی اہلیت ہوتی
الصحابة في هذا المعنىٰ	ہے۔ معاویہ سمجھتے تھے کہ اس معنیٰ
ولهذا قال لعبد الله بن عمر	میں صحابہ کی اولاد میں کوئی دوسرا

فیما خاطبہ بہ انی خفت ان اذر الرعیۃ من بعدی کالغنم المطیرۃ لیس لہا راع[1]۔

نہیں ہے جو کاروبار مملکت سنبھال سکے.... چنانچہ عبداللہ بن عمر سے انھوں نے کہا تھا کہ میں (اگر یزید کو نہ بناؤں) تو ڈرتا ہوں کہ رعیت کو اپنے بعد ایسے چھوڑ جاؤں گا جیسے بارش میں بکریاں کہ جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔

اسی ذیل میں ابن کثیر نے امیر معاویہ کی وہ گفتگو بھی نقل کی ہے جو انھوں نے حضرت عثمانؓ کے بیٹے سعید بن عثمان سے اس معاملے میں کی تھی۔ ابن کثیر نے تو لکھا ہے کہ سعید نے یزید کے مقابلے میں اپنا استحقاق جتایا تھا۔ اس پر امیر معاویہ نے وہ بات کہی تھی مگر طبری اور ابن اثیر کے مطابق اصل بات یہ تھی کہ اس زمانے میں جب کہ یزید کی ولی عہدی کا قصہ چھیڑا ہوا تھا سعید آئے اور خواہش کی کہ انھیں خراسان کی ولایت دیدی جائے' امیر معاویہ نے معذرت کی کہ وہ علاقہ تو ابن زیاد کی تحویل میں ہے۔ اس پر سعید بگڑ گئے اور کہا کہ تم جو کچھ ہوئے میرے باپ کی وجہ سے ہوئے اور آج تم مجھے اس طرح کا جواب دے کر ٹال رہے ہو جبکہ اپنے بیٹے کے لئے تم خلافت کا بندوبست کر رہے ہو حالانکہ میں کیا اپنی ذات سے اور کیا اپنے ماں اور باپ سے' ہر لحاظ سے یزید پر فائق ہوں' اس پر امیر معاویہؓ کا جو جواب نقل کیا گیا ہے وہ ابن کثیر نے اپنے مذکورہ بالا بیان ہی کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ امیر معاویہ نے جواب میں کہا کہ :-

"بے شک تمھارے والد کے احسانات ناقابل انکار ہیں اور تمھارے والد بے شک یزید کے باپ سے بڑھ کر بھی تھے۔ تمھاری ماں بھی یزید کی ماں سے اس بنا پر فائق کہ وہ قریشی تھیں اور یزید کی ماں بنی کلب کی۔ لیکن تم جو

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶

اپنے بارے میں کہتے ہو تو سنو کہ تمہارے جیسے اگر اتنے بھی ہوں کہ غوطۂ دمشق بھر جائے
تب بھی یزید مجھے تم سب سے محبوب تر ہوگا"[۱]

گویا ابن کثیر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگرچہ امیر معاویہ کے اس فیصلے میں محبت پدری کا بھی دخل تھا، مگر تنہا یہ بات نہیں تھی، بلکہ وہ یزید کو کاروبار مملکت کے لئے اہل تر بھی جانتے تھے۔ اسی سیاق میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ:-

وروینا عن معاویۃ انہ قال	ہم معاویہ کے سلسلے میں نقل کر چکے ہیں کہ
یومًا فی خطبتہ: اللھم ان	انھوں نے ایک دن اپنے خطبے میں کہا
کنت تعلم انی ولیتہ لانہ فیما	تھا کہ اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے
اراہ اھلٌ لذالک فتمم لہ	اس کو (یزید کو) اس کی اہلیت کی
ما ولیتہ وان کنت ولیتہ	بنا پر ولی عہد بنایا ہے تو اس ولایت
لانی احبہ فلا تتمم لہ	کو تو تکمیل تک پہنچا۔ اور اگر میرا یہ کام
ما ولیتہ۔[۲]	اس لئے ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے
	تو پھر اسے تو پورا نہ ہونے دے۔

اس دعا کے پیش نظر جو منبر پر اور مجمع میں کی گئی بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کے بعد اس بدگمانی کی گنجائش نہیں رہتی کہ یزید کی ولی عہدی بربنائے محبت تھی نہ کہ بربنائے اہلیت[۳]۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس دعا کے ثبوت میں اگر کوئی کلام نہ ہو تو پھر بدگمانی واقعی بڑے دل گردے کا کام ہے۔

الغرض ابن کثیر کے مذکورہ بالا کلام کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ کو یزید کی ولی عہدی پر اصرار اس لئے نہیں تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے بلکہ بنائے اصرار یہ تھی کہ وہ اسے کار خلافت کے لئے موزوں ترجان رہے تھے۔

---

[۱] ایضاً ص۸۰ [۲] ایضاً [۳] حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق۔ از مولانا تقی عثمانی۔

ابن خلدون نے اپنے شہرۂ آفاق "مقدمہ" میں اس مسئلہ پر بہت شرح و بسط سے کلام کیا ہے۔ آیئے دیکھیں اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"امامت و خلافت کے معنی اصل میں امت کی دینی و دنیاوی مصالح کی نگرانی اور حفاظت کے ہیں، پس امام لوگوں کی مصالح کا امین اور ان کی بہبود کا ذمہ دار ہے، اور جب وہ اپنی زندگی میں اس کا ذمہ دار ہے اور اُسے مسلمانوں کی فلاح و بہبود عزیز ہے تو قدرتی طور پر اس کی خواہش بھی ہونی چاہیئے اور اس کا اخلاقی فریضہ بھی ہے کہ اپنی موت کے بعد کے لئے بھی اُن کی بھلائی کی فکر کرے اور کسی ایسے آدمی کو قائم مقام کر جائے جو اسی کی طرح ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والا ہو اور لوگ اس سے اسی طرح مطمئن رہیں جیسے اُس کے پیشرو سے مطمئن تھے (اسی کا نام ولایت عہد ہے) اور یہ شرعًا بالکل جائز ہے کیونکہ اسکے جواز پر اور اس طرح امامت کے انعقاد پر امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کی موجودگی میں عمرؓ کو اسی طرح اپنا قائم مقام بنایا تھا، جس کو صحابہ نے جائز ٹھہرایا اور عمرؓ کی اطاعت اپنے اوپر لازم کرلی، بعد ازاں جب حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے اپنا بار عشرہ مبشرہ میں کے باقی ماندہ چھٌ اصحاب کو سونپ دیا کہ وہ مشورہ کر کے خلافت کسی ایک کے سپرد کر دیں، پھر ان سب نے بھی بعض بعض پر فیصلہ چھوڑتے چلے گئے، یہاں تک کہ عبد الرحمٰن بن عوفؓ کو اختیار کلی دیدیا گیا پس انھوں نے بہتر سے بہتر کوشش کی اور تمام مسلمانوں کے خیالات کا جائزہ لیا تو عثمانؓ اور علیؓ پر سب کو متفق پایا، اب ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا تو انھوں نے عثمانؓ کی بیعت کو ترجیح دی کیونکہ وہ نہایت سختی کے ساتھ شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) کی اقتدا پسند کرتے تھے اور اس باب میں عبد الرحمٰن کے ہم خیال تھے کہ ہر ایک موقع پر اپنی رائے کے بجائے شیخین کی اقتدا

کرنی چاہیئے چنانچہ عثمانؓ کی خلافت منعقد ہو گئی اور سب نے ان کی اطاعت
اپنے اوپر لازم کر لی ــــــ ان دونوں موقعوں پر صحابہ کرام کی کافی تعداد
موجود تھی مگر کسی ایک نے بھی اس بات پر انکار و اعتراض نہیں کیا، پس
اس سے ثابت ہوا کہ تمام صحابہ کرام ولی عہدی کے جواز پر متفق تھے، اور
اجماع جیسا کہ معلوم ہے حجت شرعی ہے، پس امام اس معاملہ میں متہم نہیں ہو سکتا
اگرچہ وہ یہ کارروائی اپنے باپ یا بیٹے ہی کے حق میں کیوں نہ کرے اس لئے کہ جب
اس کی خیر اندیشی پر اس کی زندگی میں اعتماد ہے تو موت کے بعد تو بدرجہ اولیٰ
اس پر کوئی الزام نہیں آنا چاہیئے (کیونکہ جو زندگی بھر اپنے آپ کو خیر خواہ ثابت
کرے گا مرتے وقت وہ بدخواہی کا الزام اپنے سر لے کر جانا کبھی گوارا نہ کرے گا)
بعض لوگوں کی رائے ہے کہ باپ اور بیٹے کو ولی عہد بنانے میں امام کی نیت پر شبہ
کیا جا سکتا ہے اور بعض صرف بیٹے کے حق میں یہ رائے رکھتے ہیں مگر ہمیں ان دونوں
سے اختلاف ہے۔ ہماری رائے میں کسی صورت میں بھی امام سے بدگمانی کی کوئی وجہ
نہیں ہے اور خاص کر ایسے مواقع پر کہ جہاں ضرورت اسی کی داعی ہو، مثلاً کسی
مصلحت کا تحفظ یا کسی مفسدہ کا ازالہ اس میں مضمر ہو، تب تو کسی طرح کے سوءِ ظن
کی کوئی وجہ ہی نہیں، جیسے کہ معاویہؓ کا اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا واقعہ ہے تو
اولاً تو معاویہؓ کا لوگوں کے عمومی اتفاق کے ساتھ ایسا کرنا اس باب میں بجائے خود
ایک حجت ہے، اور پھر انھیں متہم یوں بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے پیش نظر یزید کو
ترجیح دینے سے بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ امت میں اتفاق و اتحاد قائم رہے
اور اس کے لئے ضروری تھا کہ اہل حل و عقد میں اتفاق ہو اور اہل حل و عقد
صرف یزید ہی کو ولی عہد بنانے پر متفق ہو سکتے تھے کیونکہ وہ عموماً بنی امیہ میں سے
تھے، اور بنی امیہ اس وقت اپنے میں سے باہر کسی کی خلافت پر راضی نہیں ہو سکتے تھے!

(اور ان کی ناراضمندی سخت افتراق وانتشار کا باعث ہوتی) کیونکہ وہ قریش بلکہ پوری ملت کا سب سے بڑا بااثر اور طاقتور گروہ تھا، ان نزاکتوں کے پیش نظر معاویہؓ نے یزید کو ولی عہدی کے لئے ان حضرات پر ترجیح دی جو اس کے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے اور افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا تاکہ مسلمانوں میں جمعیت اور اتفاق باقی رہے جس کی شارع کے نزدیک بیحد اہمیت ہے۔[۱]

مزید لکھتے ہیں کہ :-

"خلفاء اربعہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے دور میں اور معاویہؓ کے دور میں ایک بہت بڑا فرق ہو گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ خلفاء اربعہ کے دور میں (بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شیخین کے دور میں) مسلمانوں کی طبیعتوں پر دین کی گرفت بہت سخت تھی، ان کی پسند و ناپسند اور رضا و عدم رضا کا معیار صرف دین تھا اور ان کا دینی ضمیر ہر اُس بات سے باز رکھنے کیلئے کافی تھا جو دینی نقطۂ نظر سے نامناسب تھی اور ہر اُس بات پر آمادہ کر دیتا تھا جس میں دینی بھلائی ہوتی، پس ان حضرات میں سے جس نے اپنے بعد کیلئے امر خلافت کے لئے کسی کو منتخب کیا تو ایسے کو منتخب کیا جو دینی نقطۂ نظر سے منتخب ہونا چاہیئے تھی اس کے علاوہ اور کوئی وجہ ترجیح ان کے یہاں نہیں تھی بس یہی کچھ دیکھ کر وہ اپنا بار امانت کسی کو سونپ دیتے اور پھر اُس شخص کو اس کے دینی ضمیر کے سپرد کر دیتے (جو اس وقت بہت ہی حساس اور قابل اعتماد تھا) لیکن اُن کے بعد حالت یہ نہ رہی، بلکہ معاویہ کا دور جب سے شروع ہوا تو دو تغیر جو تدریجی طور پر آرہے تھے اس وقت پوری طرح ظاہر ہو گئے تھے، ایک تو وہ عصبیت جو دین کے تقاضوں میں دب گئی تھی بلکہ دینی عصبیت میں تبدیل ہو گئی تھی اس دباؤ سے نکل کر پھر طبعی، تنہا یعنی ملوکیت پر پہونچ گئی اور دوسرے دینی ضمیر کی

۱؎ مقدمہ ابن خلدون ولی عہدی کا بیان صفحہ ۱۷۴، ۱۷۵ مطبوعہ مصر۔

روک ٹوک کمزور پڑ گئی لہذا اب (امت کی شیرازہ بندی اور جماعت و طاعت کی بقا کے لئے) شخصی حکومت اور عصبیت کا سہارا لینا ضروری ہو گیا (یعنی یہ کہ سارا اقتدار ایک ایسے فردِ واحد کے ہاتھ میں دیدیا جائے جس کو وقت کی سب سے بڑی عصبی طاقت کی پشت پناہی حاصل ہو) پس اگر معاویہؓ کسی ایسے شخص کو اپنا جانشین بنا جاتے جس کو (بنو امیہ کی) عصبیت نہ چاہتی ہوتی (خواہ دین اُسے کتنا ہی پسند کرتا) تو ان کی یہ کارروائی یقیناً اُلٹ دی جاتی، نظم خلافت درہم برہم ہو جاتا اور امت کا شیرازہ بکھر جاتا...... تم نہیں دیکھتے کہ مامون الرشید (عباسی خلیفہ) نے زمانے کی تبدیلی کا یہ حکم نظر انداز کر کے علی بن موسیٰ بن جعفر الصادقؒ کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا تھا تو کیا نتیجہ ہوا عباسی خاندان نے پورے معنی میں بغاوت کر دی۔ نظامِ خلافت درہم برہم ہونے لگا اور مامون کو خراسان سے بغداد پہنچ کر معاملات کو قابو میں کرنا پڑا۔[1]"

ابن خلدون کے کلام سے معلوم ہوا کہ انکی نظر میں معاملہ کی نوعیت یہ تھی کہ ملت کے جس دور میں یزید کیلئے ولی عہدی کا فیصلہ کیا جا رہا تھا اس دور میں ملت کے اتحاد و رابطہ اجتماعیت کی بقاء کے نقطۂ نظر سے اس کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اس دور میں دینی ضمیر اصل اجتماعی طاقت نہیں رہا تھا بلکہ قبائلی عصبیت نے پھر سے اصل اجتماعی طاقت کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ اور حالات کے اس نقشے میں بنی امیہ کی عصبیت سب سے بڑی عصبی طاقت تھی اور یزید ہی یہ کہ وہ فرد جس کے بارے میں سب سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا تھا کہ یہ عصبی طاقت اسکی اطاعت گزار ہو کر ادارۂ خلافت کی پشتی بان ثابت ہوگی۔

تمدنی و عمرانی معاملات میں ابن خلدون کے تجزیوں اور فیصلوں کو جو اہمیت حاصل ہے اُس سے انکار کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اس شان کا یہ تجزیہ کسی خوش عقیدگی کی

[1] [illegible]

بنا پر نہیں بلکہ سنجیدگی کی بنا پر لائق اعتناء ہونا چاہئے کہ یزید کی ولی عہدی کے پیچھے کوئی اور چیز نہیں بلکہ صرف اس اجتماعی مصلحت کا شعور کام کر رہا تھا کہ اس کے انتخاب کے ذریعہ خلافت کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ سے بچ جائے گا۔ اور اس تجزیہ کی روشنی میں ہمیں پورے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھنے کی گنجائش ہے کہ حضرت معاویہ کو جو اپنی تجویز پر اصرار تھا اس کی اصل وجہ ملت کی مصلحت ہی تھی ــــ لیکن یہ سمجھنا کہ یہ مصلحت اندیشی بالکل بجا بھی تھی اور اس میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ بظاہر ابن خلدون کا نقطۂ نظر ہے سو یہ صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم ابن خلدون کا یہ بیان بھی تسلیم کر لیں کہ یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والی صرف ایک شخصیت عبداللہ بن زبیر کی تھی۔[1]

بے شک اگر واقعہ میں ایک عبداللہ بن زبیر کے سوا کوئی قابل ذکر شخصیت نہ تھی جس کو یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے اختلاف ہو رہا ہو تو پھر ابن خلدون کی اس رائے سے اتفاق ہی کرنا پڑے گا کہ "ایک آدھ آدمی کے اختلاف سے بھلا کہاں بچا جا سکتا ہے۔ اور کیونکر اسے کوئی بڑی اہمیت دی جا سکتی ہے"[2]، مگر ابن خلدون کا یہ بیان تو بالکل ایک نادر بیان ہے۔ چار اہم شخصیتیں (عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، اور حسین بن علی رضی اللہ عنہم) تو ہر تاریخی بیان کے مطابق اس سلسلے میں مخالفت کرنے والی رہی ہیں حتیٰ کہ ابن خلدون نے خود اپنی تاریخ میں ان چاروں کا نام دیا ہے، اور واقعہ کی اس صورت میں کہ یہ چار شخصیتیں بہت صاف اور نمایاں طور پر مخالف تھیں۔ یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جو کچھ ازراہ مصلحت اندیشی کیا تھا۔ وہ واقعہ میں بھی پوری طرح مصلحت اندیشانہ بات تھی، کیونکہ ان چار آدمیوں کا اختلاف ہوتے ہوئے یہ بات ماننا مشکل ہے کہ یزید کی ولی عہدی کے ذریعہ ملت کو شقاق و انتشار سے بچانے کا اطمینان کیا جا سکتا تھا۔

یہ کیسے چار آدمی تھے؟ عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر تو اس مرتبے کے لوگ تھے کہ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون بیان ولیت عہد ص ۲۶ [2] ایضًا

جب حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان "تحکیم" کا قصہ پیش آیا کہ دو حکم بیٹھ کر قرآن کی رو سے فیصلہ کریں کہ اس اختلاف کا حل کس طرح ہونا چاہیئے؟ اور ان دو حکموں (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ) کا اجلاس اس فیصلے کے لئے منعقد ہوا تو اس کی غیر معمولی اہمیت کی بناء پر اور اس بناء پر کہ بظاہر اسباب اُس کے نتیجہ خیز ہونے پر امت کی فلاح وبقا کا انحصار تھا، جن اہم لوگوں کو حکمین نے اس موقع پر بلوانے کی اور اُن سے درخواست کرنے کی ضرورت سمجھی کہ وہ ضرور اس موقع پر موجود ہوں تو ان میں یہی دو (عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ) تھے جن کا نام کے ساتھ تاریخ ذکر کرتی ہے۔

فلما اجتمع الحکمان باذرح	جب حکمین اَذْرُح کے مقام پر جمع ہوئے
وافاھم المغیرۃ بن شعبۃ	تو بہت سے لوگ وہاں پہنچے جن میں
فیمن حضر من الناس فارسل	مغیرہ بن شعبہ بھی تھے نیز ان حکمین
الحکمان الی عبداللہ بن عمر	نے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر
بن الخطاب وعبداللہ بن الزبیر	کے پاس بلاوا بھیجا کہ وہ اس موقع پر
فی اقبالھم فی رجال کثیر[1]	ضرور آجائیں۔

طبری کی روایت کے یہ الفاظ ذرا اُلجھے ہوئے ہیں، مصنف عبدالرزاق[2] میں عبارت بہت صاف ہے لہذا ہم اُسے بھی نقل کرتے ہیں۔

فلما حکم الحکمان فاجتمعا	پس جب دو آدمی حکم بنادئے گئے
باذرح وافاھما المغیرۃ بن	اور وہ اَذرح میں جمع ہوئے تو مغیرہ
شعبۃ وارسل الحکمان الی	بن شعبہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ اور ان حکمین نے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۳۹ [2] یہ امام ابوبکر عبدالرزاق الصنعانی (م ۲۱۱ھ) کا مرتب کردہ مجموعۂ احادیث وآثار ہے۔ امام عبدالرزاق امام بخاری کے استاذ ہیں۔ اس کتاب کے نسخے اب تک قلمی تھے ۱۹۷۲ء میں پہلی بار یہ مطبوعہ شکل میں سامنے آئی ہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم نے اس کو ایڈٹ کیا ہے۔ گیارہ جلدوں میں تمام ہوئی ہے۔

عبد الله بن عمرو الی عبد الله بن الزبیر و وافا رجال کثیر من قریش ...۱؎

عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو (بطور خاص) بلا بھیجا اور انکے علاوہ قریش کے بہت سے لوگ پہنچے۔

حضرت عبداللہ بن عمر کی مزید برآں ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس موقع پر حکمین کے درمیان ایک متبادل شخصیت کی تلاش میں سب سے پہلا نام عبداللہ بن عمرؓ ہی کا آیا کہ علیؓ اور معاویہ دونوں کو چھوڑ کر ان کو خلیفۂ اسلام مان لیا جائے:۔

فان عمرو یا ابا موسی أ أنت
علی ان نسمی رجلا یلی امر هذه
الامة فسمه لی فان قدر علی
ان اتابعک فلک علی ان اتابعک
والا فلی علیک ان تتابعنی
قال ابو موسی اسمی لک
عبد الله بن عمر و کان ابن عمر
فیمن اعتزل ۲؎

عمرو بن عاص نے دوسرے حکم ابو موسیٰ اشعری سے (جبکہ وہ دونوں تنہائی میں گفتگو کر بیٹھے) کہا کہ ابو موسیٰ کیا تم پسند کرتے ہو کہ ہم امت کی سربراہی کیلئے کسی ایک شخص کو نامزد کر دیں۔ اگر پسند کرتے ہو تو نامزد کرو میرے لئے اگر ممکن ہوا کہ تمہارا دیا نام قبول کروں تو میں فوراً اسے قبول کر لوں گا، ورنہ پھر میں جو نام دوں تم اس پر راضی ہو جانا، ابو موسیٰ اشعری نے کہا میں عبداللہ بن عمر کا نام تجویز کرتا ہوں ..... اور ابن عمر ان لوگوں میں تھے جو اس دور کے فتنوں سے الگ رہے تھے۔

۱؎ [illegible] - مزید برآں صحیح بخاری میں بھی ایک روایت ہے جس سے حضرت عبداللہ بن عمر کا اس موقع پر بلایا جانا معلوم ہوتا ہے یہ کتاب المغازی باب غزوۂ خندق کی پانچویں حدیث [illegible]

[illegible]

الغرض جن افراد کا یہ مقام ہو کہ مسئلۂ خلافت کی پیچیدہ گتھی سلجھائے جانے میں انکی موجودگی بطورِ خاص ضروری سمجھی جا رہی ہو۔ دونوں طرف کے حکم ان کا انتظار کر رہے ہوں

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ) یہ دکھانے کیلئے نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان کشمکش کی صورت ختم کرنے کیلئے حکمین نے جب یہ طے کیا کہ خلافت کیلئے کسی اور آدمی کا انتخاب کر لیا جائے تو اس کیلئے سب سے پہلے نام حضرت عبد اللہ بن عمر ہی کا لیا گیا لیکن یہ روایت اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ "تحکیم" کے سلسلے میں واقعہ کی شکل اب تک یہ بتائی جاتی رہی ہے کہ حکمین (حضرت ابو موسیٰ اور حضرت عمرو بن العاص) کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ نہ علی کی خلافت نہ معاویہ کی، بلکہ مسلمان کسی تیسرے آدمی کا انتخاب کرلیں چنانچہ ان دونوں نے اپنی تنہائی کی اس قرارداد کے مطابق یہ طے کیا کہ مجمع کے سامنے آکر علی اور معاویہ کی معزولی کا اعلان کر دیا جائے، اور یہ اعلان پہلے حضرت ابو موسیٰ نے کیا۔ اسکے بعد حضرت عمرو بن العاص کھڑے ہوئے تو انھوں نے کہا کہ علی کی حد تک میں بھی ابو موسیٰ کے اعلان سے متفق ہوں لیکن معاویہ کو معزول نہیں کرتا ہوں جس پر دونوں میں بڑی تلخ کلامی ہوئی اور جھگڑا بڑھ گیا۔ یہ روایت بھی طبری ہی میں ہے (جلد ۶ صفحہ ۳۹) لیکن جو روایت اوپر نقل کی گئی اس کی رو سے واقعہ کی شکل بالکل مختلف ہو جاتی ہے اور وہ سند کے لحاظ سے زیادہ قابلِ قبول بھی ہے کیونکہ اول تو اس میں حضرت معاویہ کو "معزول کرنے" کی بے تکی بات نہیں پائی جاتی حضرت معاویہ کو خلافت کا دعویٰ نہیں تھا کہ ان کو "معزول" کیا جاتا۔ خلافت کا دعویٰ حضرت علی کو تھا حضرت معاویہ کو ان کی خلافت اس وقت تک تسلیم کرنے سے انکار تھا جب تک کہ وہ خونِ عثمانؓ کا قصاص نہ دلا دیں۔ اس لئے معزولی صرف حضرت علی کی ہو سکتی تھی۔ نہ کہ حضرت معاویہ کی۔ دوسرے واقعہ کی یہ شکل (جو طبری ج ۶ صفحہ ۳۹ والی روایت کی رو سے سامنے آتی ہے) اُس میں اسلامی تاریخ کے ایک جلیل القدر صحابیِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم (حضرت عمرو بن العاص) کے دامن پر دھوکہ دہی کا وہ دھبہ بھی لگتا ہے جو نہایت شرمناک ہے، اور کسی طرح بھی آسانی سے قابلِ قبول نہیں کہ ایک بات تنہائی کی مجلس میں طے کی اور مجمع عام میں اس کے خلاف کیا۔

اوپر جو واقعہ کی شکل بیان ہوئی ہے اُسکی رو سے حضرت ابو موسیٰ نے خلافت کیلئے متبادل نام کے طور پر حضرت عبد اللہ بن عمر کا نام پیش کیا۔ اس کے آگے کا حصہ روایت میں یوں ہے کہ:۔

وقال عمرو اني سميت معاوية بن ابي سفيان۔

عمرو بن العاص نے (ابو موسیٰ کا پیش کردہ نام نہ قبول کرتے ہوئے) کہا کہ میں معاویہ بن ابی سفیان کا نام تجویز کرتا ہوں۔

اس کے بعد جیسا کہ واقعہ کی دوسری روایت میں جو کہ مشہور ہے آتا ہے دونوں حضرات میں تلخ کلامی ہوئی اور حضرت ابو موسیٰ اپنی مغلوبیت کے احساس سے الجھن ہو کر بجائے حضرت علی کے پاس جانے کے مکے چلے گئے۔

اس روایت کی رو سے حضرت عمرو بن العاص پر کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کی بنا پر ان پر تنقید کی [illegible]

اور مزید برآں اُن میں سے ایک کا یہ درجہ بھی ہو کہ اس کی ذات میں مسئلۂ خلافت کی پیچیدگی کا حل دیکھا جا رہا ہو۔ ایسے اشخاص کے اختلاف کے ساتھ کیسے امید کی جا سکتی تھی کہ یزید کے

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) اُنھیں بدعہدی اور دھوکہ بازی کا وہ الزام دیا جا سکے جو مشہور روایت کی بنا پر عائد ہوتا ہے، انھوں نے حضرت ابوموسیٰ سے کہا تھا کہ آپ نام پیش کریں، اگر میرے لئے قابل قبول ہوا تو ان کا قبول کروں گا ورنہ میرا دیا ہوا نام آپ قبول کریں گے۔ اس قرارداد کے بعد حضرت عمرو پر ذمہ داری نہیں آتی تھی کہ وہ حضرت ابوموسیٰ کا دیا ہوا نام قبول ہی کرلیں۔ البتہ حضرت ابوموسیٰ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ روایت کے ظاہری الفاظ کے لحاظ سے ان پر ذمہ داری آتی تھی کہ حضرت عمرو کا دیا نام قبول کرلیں گے کیونکہ انھوں نے حضرت عمرو بن العاص سے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ میں بھی تمہارے دیئے ہوئے نام کو قبول کرنے کا پابند نہیں بلکہ اُن کی یہ بات سن کر کہ "ورنہ پھر میں جو نام دوں گا آپ اسے قبول کریں گے" فوراً ایک نام پیش کر دیا۔ اگر روایت کا یہ مطلب لینا صحیح ہے تو ہم حضرت ابوموسیٰ کی صفائی میں کہہ سکتے ہیں کہ "تحکیم" کے خاص ماحول میں انھیں یہ گمان نہیں تھا کہ عمرو بن العاص، معاویہ بن ابی سفیانؓ کا نام بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں شاید یہ مناسب نہیں تھا...... اس لئے انھوں نے باوجود قول دینے کے اپنے آپ کو اس نام کے قبول کرنے کا پابند نہیں جانا، مگر صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبارت کا بالکل لفظی مطلب نہ لیا جائے اور سمجھا جائے کہ حضرت ابوموسیٰ بھی حضرت عمرو کی طرح آزاد تھے کہ حضرت عمرو کی تجویز مانیں یا نہ مانیں۔ رہا یہ خیال، جیسا کہ شاید حضرت ابوموسیٰ کا تھا کہ عمرو بن العاص نے ایک ایسی بات کی جس کی قول و قرار کے الفاظ کے اعتبار سے اگرچہ پوری گنجائش تھی مگر معاملات کے جس خاص ماحول میں حکمین کو اپنی ذمہ داری ادا کرنا تھی اُس ماحول کے اعتبار سے یہ بات مناسب نہ تھی تو یہ ایک نقطۂ نظر ہو سکتا ہے، جبکہ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے۔ اور بظاہر وہی حضرت عمرو بن العاص کا تھا کہ عملی اعتبار سے امت کے مفاد میں اس وقت اس سے بہتر کوئی دوسری شکل دستیاب نہ تھی کہ خلافت — یا کہئے اسلامی اجتماعیت کی ذمہ داری — معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ نظریات کی ترازو میں یہ بات سخت نارو انظر آنے والی ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کی موجودگی میں معاویہ بن ابی سفیان کو امت کی باگ ڈور سونپ دینے میں امت کی بھلائی سمجھی جائے۔ مگر جب ان حقائق پر نظر ڈالی جائے جو حضرت عمرو بن العاص کے سامنے پھیلے ہوئے تھے کہ مثلاً علی مرتضیٰ کو اپنی خلافت میں اتنا اختیار بھی حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی طرف سے حَکَم بھی اپنی مرضی کے مطابق مقرر کر سکیں۔ ابوموسیٰ اشعری کے تقرر کے حق میں وہ بیک منٹ کے لئے نہیں تھے۔ ہر ممکن کوشش کی کہ ایسا نہ ہو انکے بجائے حضرت عبداللہ بن عباس کو مقرر کیا جائے کیونکہ ابوموسیٰ اس ڈپلومیٹک کام کے لئے، اول تو موزوں نہیں تھے دوسرے حضرت علی کے کیمپ میں ہوتے ہوئے وہ حضرت علی کی جنگ پالیسی کے قطعی خلاف تھے اور لوگوں کو جنگ میں شرکت سے روکتے تھے جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں آ بھی چکا ہے۔ مگر بغاوت پر آمادہ رفیقوں نے مجبور کیا کہ ابوموسیٰ ہی جائیں گے۔

حضرت علی کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ کے تقرر پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو (باقی آئندہ صفحہ پر)

ماتحت نظم خلافت استوار رہ سکے گا؟ پھر یہ دو ہی نہیں، حضرت حسین بن علی بھی اختلاف کے لئے حتمی طور پر موجود تھے۔ اور تنہا انہی کا اختلاف اس بات کا اندیشہ رکھنے کیلئے کافی تھا کہ یزید کیلئے خلافت کا کاروبار آسان نہیں ہو سکے گا۔ اور اگر عبدالرحمٰن بن ابی بکر بھی ولی عہدی کی کارروائی کے دنوں میں بقیدِ حیات تھے تو وہ تو بالکل ہی شمشیرِ بے نیام تھے۔ خود حضرت معاویہ کا جو وصیت نامہ یزید کیلئے نقل کیا گیا ہے وہ اگرچہ بعض وجوہ سے مشکوک ہے تاہم اُس میں بھی

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) ابن اثیر کے محقق حاشیہ نگار نے کیا ہے کہ "علی اگر اپنے معاملے کی نمائندگی کو معاویہ کے ہاتھ میں دیدیتے تو بھی انہیں اتنا نقصان شاید نہ پہنچتا جتنا ابو موسیٰ کے ہاتھ میں معاملہ جانے سے پہنچا"۔ (ج ۳ ص ۱۶۹) بہر حال حضرت علی اپنی تمام عظمتوں کے باوجود جن کے آگے سر نیاز جھکے بغیر نہیں رہ سکتا اپنے دائرۂ اختیار میں... روز بروز زیادہ بے اختیار، و عاجز و درماندہ ہوتے جا رہے تھے، اُن کے ساتھی اُن کی کوئی بات چلنے نہیں دیتے تھے حتیٰ کہ وہ تحکیم میں اپنی مرضی کا نمائندہ تک نہیں رکھ سکے تھے، اسکے برعکس معاویہ ابن ابی سفیان نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی ذات سے معاملات پر پورا قابو رکھتے ہیں بلکہ انہیں جو قوم اور اعوان و انصار ملے ہیں وہ سب اس معاملے میں انکی دل و جان سے مدد کرتے ہیں، ایسی حالت میں حضرت عمرو بن العاص کو یہ بات سوچنے کا پورا حق تھا کہ کم سے کم فلاح و بہبود جو خون میں نہائی ہوئی اور عافیت کیلئے سرگرداں اس اُمت کے لئے حاصل کی جا سکتی ہے وہ اب صرف اس صورت میں حاصل کی جا سکتی ہے کہ معاملات کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ جو وہ حد آدمی ہے کہ حالات کو قابو میں کر سکتا ہے... جیسا کہ ثابت بھی ہوا۔ دوسرا نام حضرت عبداللہ بن عمر کا سامنے آیا تھا بر واقف کار جانتا ہے کہ اپنی تمام بزرگیوں کے باوجود وہ اس میدان کے سرے سے آدمی ہی نہ تھے۔ اس وقت تو ایک زبردست انتظامی اور قائدانہ صلاحیت رکھنے والے آدمی کی ضرورت تھی، نہ کہ صرف نیک نفس کی یعنی ٹھیک وہی بات جس کا فیصلہ حضرت عمر نے اپنے آخری دور میں کیا اور اوپر باب سوم میں اس کا ذکر آ چکا ہے کہ اجتماعی ذمہ داری اور نظم و نسق کیلئے ایک کم معیاری مگر مضبوط (اور بقول حضرت عمرو بن العاص ڈاڑھ دانت والے) مسلمان کو ترجیح دی جانی چاہیئے اعلیٰ درجہ کے مگر کمزور اور کم موزوں مسلمان کو نہیں۔

طبری کی اس روایت میں جو تحکیم کے قصے میں عام طور پر مشہور ہے اور اُس روایت میں جو ہم نے اوپر (طبری ج ۶ ص ۳۹) سے نقل کی سند کے وزن کے اعتبار سے بھی بڑا فرق ہے مشہور روایت کی سند ایک منقطع اور ناقص سند ہے، اور جو کُل دو راوی "ابو مخنف اور ابو جناب کلبی" امام ابن جریر طبری نے اپنے سے اوپر ذکر کئے ہیں۔ اُن دونوں پر متقدمین فن کو کلام ہے (ملاحظہ ہو لسان المیزان ج ۴ ص ۴۹۲ طبع بیروت اور تقریب التہذیب ج ۲ ص ۳۳۳) اسکے برعکس جو روایت ہم نے اوپر طبری ج ۶ ص ۳۲ کے حوالے سے نیز مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے درج ہے اسکی سند نہایت صاف اور مکمل ہے۔

حدثنی عبداللہ بن احمد (ابن حنبل) قال حدثنی ابی قال حدثنی (باقی آئندہ صفحہ پر)

یزید کو ان چار آدمیوں کے اختلاف سے آگاہی اور مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔

بہرحال یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اُس وقت کے حالات میں یزید کے۔ تحت دارۂ خلافت کو کم سے کم خطرہ ہو سکتا تھا لیکن وہ بات جو ابن خلدون نے کہی ہے کہ یزید کی ولی عہدی کے ذریعہ ادارۂ خلافت کو گویا خطرات سے تحفظ عطا کر دیا گیا، یہ کچھ زائد ہی بات ہے۔ بے شک عبد اللہ بن عمر نے اپنی رائے کے اختلاف کو عملی شکل دینا پسند نہیں کیا جیسا کہ اُن کا مزاج تھا۔ اور جیسا کہ ان کے بارے میں حضرت معاویہؓ کا اندازہ تھا۔ اور بے شک حضرت حسینؓ کے معاملے میں بھی حضرت معاویہ کا اندازہ صحیح ہوا کہ اگرچہ کوفی انھیں حرکت میں لائے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ مگر وہی تقدیری (یزید کی) طرف سے اُن کیلئے کافی بھی ہو جائیں گے۔ جیسا کہ اُن کی پرانی عادت رہی ہے۔ مگر عبد اللہ بن زبیر کی سرگرمی اور یہ زور محاذ آرائی جس سے حضرت معاویہ کو سچ مچ خطرہ تھا حضرت حسین کی شہادت کے اثرات سے مل کر بالآخر یزیدی خلافت کے لئے موت کا پیام بن ہی گئی۔ ایسی موت کہ پھر اس گھرانے میں سے خلافت نکل گئی اس لئے اگرچہ یہ تسلیم کہ حضرت معاویہ کا یزید کو ولی عہد بنانا مصلحت اندیشی ہی کے ماتحت تھا نہ کہ جذبہ پدری کے ماتحت مگر یہ تسلیم کرنا مشکل کہ ایسے اہم افراد کے اختلاف کے ساتھ یہ تجویز مصلحت اندیشی کا بہترین نمونہ بھی تھی۔

اہلِ اختلاف کے اختلاف کی بنیاد

یزید کی ولی عہدی سے جن حضرات نے نمایاں اختلاف کیا اور آخر تک اختلاف جاری رکھا یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن زبیر، عبد الرحمن بن ابی بکر اور

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) [illegible]

[illegible]

حضرت حسین بن علیؓ ان کے اختلاف کے سلسلے میں یہ بات بری طرح مشہور ہوگئی ہے کہ یزید یک فاسق وفاجر انسان تھا۔ اس لئے اِن حضرات کو یہ بات قبول نہیں تھی کہ اُسے اسلامی خلافت جیسا مقدس اور محترم منصب دیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کی زبان سے جو حضرت معاویہ کی زندگی میں سرگرم اختلاف فرما رہے تھے ہمیں کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے اس شہرت عام کی تصدیق ہوسکتی ہو۔ ان حضرات کا صرف ایک اختلاف ریکارڈ پر ہے کہ یہ اسلام میں قیصریت وکسرویت کی بنا ڈالی جارہی ہے کہ باپ مرے تو بیٹا حکومت سنبھال لے۔ خلفائے راشدین کے انتخاب کے طرز سے اسکی تائید نہیں ہوتی۔ باب ۵ میں وہ گفتگوئیں طبری اور ابن اثیر وغیرہ کے حوالے سے گزر چکی ہیں جن میں ان اختلاف کرنے والے حضرات نے حضرت معاویہ اور انکے نمائندوں مروان بن الحکم وغیرہ سے اپنے اختلاف کی بنیاد بیان کی ہے۔ ان گفتگوؤں اور بیانات میں اس بنائے اختلاف کے سوا کوئی دوسری بات نہیں۔ مگر جن لوگوں کے طفیل یہ بے بنیاد اور بے اصل بات پھیلی اور بالکل ایک تاریخی واقعہ بن گئی ہے کہ حضرت حسینؓ اور ابن زبیر وغیرہ کے اختلاف کی بنیاد یہ تھی کہ یزید ایک زبردست فاسق وفاجر تھا انکی جرأتوں کا عالم تو یہ ہے کہ جو افسانہ چاہیں تراشیں اور پروپیگنڈے کے فن سے حقیقت بنادیں کیونکہ صحابہ کرام کو مطعون کرنا اُنکا دین وایمان ہے اور اس کام کا بہت آسان راستہ حضرت معاویہ کی ذات میں ملتا ہے کہ یزید کو ابتدائے عمر ہی سے فاسق وفاجر بنا کر یہ خیال مسلمانوں کے دلوں میں ڈالا جائے کہ ایسی نالائق اولاد کو اس شخص نے جسکو صحابیٔ رسول کہا جاتا ہے تخت خلافت پر بٹھایا اور اس وقت موجود کتنے ہی اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بجز دو چار کے سوا کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اسکی مخالفت کرے۔ جناب علی نقی صاحب قبلہ لکھنوی کی کتاب "شہید انسانیت" کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے۔ ایک افسوسناک غلط بیانی کی مثال وہاں دی گئی تھی، اسی طرح کی یک دوسری مثال اس باب کی ملاحظہ فرمایئے۔ باب ۵ میں ابن اثیر کے حوالے سے یہ روایت گزر چکی ہے کہ گورنر مدینہ مروان بن الحکم نے حضرت معاویہ کی ہدایت پر اہل مدینہ کے سامنے

یزید کی ولی عہدی کی تجویز منظوری کیلئے رکھی جس کو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے نہایت سختی سے رد کرتے ہوئے کہا کہ کیا یہ کسرویت و قیصریت کی بنا ڈالی جا رہی ہے؟ اس تجویز میں ہرگز دین و ملت کا مفاد ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ حضرت عبدالرحمٰن کا کوئی تبصرہ نہیں تھا۔ یزید کے کسی فسق و فجور کا ذکر نہیں تھا۔ مگر جناب علی نقی صاحب قبلہ نے اسی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت عبدالرحمٰن کے منہ میں یہ الفاظ بھی ڈالے ہیں کہ:۔

"ہم ہرگز اس شرابی و زانی کی بیعت نہ کریں گے" (ص۱۵۶)

بھلا کون یہ سمجھے گا کہ قبلہ اپنی طرف سے ایک جھوٹ کا اضافہ کر رہے ہیں؟ مگر واقعہ یہی ہے کہ بالکل خالص جھوٹ ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔

کچھ سنی سنائی بنیادوں پر اپنا خواہ مخواہ ایک گمان تھا کہ قبلہ علی نقی صاحب ایک علمی شخصیت ہیں (اب یہ قصۂ ماضی ہے انتقال ہو چکا ہے) اس گمان میں مزید اضافہ لندن کے "مدرسۂ سید خوئی" کی لائبریری کے لائبریرین جناب کلب عباس نے کیا جن کے پاس میں کچھ کتابوں کی تلاش میں پہنچا تھا۔ لائبریرین صاحب جن کا میں ممنون ہوں کہ چند کتابیں انھوں نے مجھے چند ہفتے کے لئے مستعار دیں۔ انھوں نے مجھے کچھ زیادہ ہی اصرار سے یہ مشورہ بھی دیا کہ اس موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے میں مولانا سید علی نقی صاحب کی "شہید انسانیت" ضرور دیکھ لوں، یہ مشورہ چونکہ جناب کلب عباس صاحب کے اس خوف و خطر کے پس منظر میں صادر ہوا تھا کہ پتہ نہیں یہ شخص (راقم) کیا "ستم" ڈھانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس لئے مجھے قدرتی طور پر گمان ہوا کہ "شہید انسانیت" ضرور شیعی نقطۂ نظر کے سلسلہ میں کوئی علمی وزن کی کتاب ہوگی۔ اس لئے بطور خاص اس کو پاکستان سے منگانے کا اہتمام کیا گیا۔ مگر اس کا جو حال نکلا وہ اس کتاب سے دی گئی ان مثالوں سے ظاہر ہے۔

بہرحال پروپیگنڈے کے فن سے کام لے کر یہ بالکل بے اصل بات ایک واقعی حقیقت بن دی گئی ہے کہ حضرت حسینؓ وغیرہ نے یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار اس کے فسق و فجور

کی وجہ سے تھا۔ حالانکہ تاریخ کے بیانات میں اس کا دور دور بھی کہیں پتہ نہیں ہے۔ بلکہ جب کہ اپنے موقع پہ آئے گا ولی عہدی کی بیعت کے چار سال بعد (۶۰ھ میں) جب حضرت معاویہ کے انتقال پر یزید نے خلافت سنبھالی اور حضرت حسین نے اسکے خلاف کھڑے ہونے کا فیصلہ فرمایا۔ تب بھی یزید کے ذاتی فسق و فجور کی بات آپ کی زبان پر کبھی نہیں آئی حتیٰ کہ کوفہ کا سفر اور شہادت، ساری منزلیں گزر گئیں کہیں یہ بات "زانی ہے، شرابی ہے" آپ کی زبان پر نہیں آئی۔ بات صرف اتنی ہی تھی کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی ولی عہدی اِن حضرات کے نزدیک اسلامی اصول خلافت کی رو سے صحیح نہیں تھی، یا مصلحت نہیں تھی۔ مزید برآں اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو وہ یہ ہے (جسکے واضح شواہد و قرائن موجود ہیں) کہ یہ سب حضرات وہ تھے جو دراصل حضرت معاویہ ہی کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ اور حالات کی پیدا کردہ ایک مجبوری کے طور پر انھیں گوارا کرتے رہے تھے[1]۔ بلکہ صاف کہا جائے تو ان میں سے شاید ہر ایک اپنے آپ کو اُن (حضرت معاویہ) کے مقابلے میں فیما بینہ وبین اللہ بہتر سمجھتا تھا۔ حد یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر جن کے ورع و تقویٰ اور کسی بھی منافست سے دوری کی بنا پر یہ سمجھنا مشکل ہوسکتا ہے کہ وہ بھی اس معاملے میں بہتری اور برتری کا احساس رکھتے ہوں اُن کے بارے میں بھی خود اُن کا اپنا بیان بخاری شریف کی اُس روایت میں موجود ہے جس کا ذکر ابھی چند صفحات پہلے ایک حاشیہ میں "العواصم والقواصم" کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ اس روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر نے حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان "تحکیم" کے موقع پر حکمین کے مجلس میں اپنے جانے کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

---

[1] یہ بات کہ یہ حضرات حضرت معاویہ کی داد و دہش سے استفادہ کرتے اور ان کے ماتحت جہاد کرتے رہے ہیں اس بین کے خلاف نہیں جانی چاہئے۔ جہاد تو امام فاجر کے تحت بھی کیا جائے گا۔ اور داد و دہش انکی ذاتی نہ تھی مملکت کے مال اور جہاد کے غنائم سے تھی۔

فلما تفرق الناس خطب معاوية:
قال من كان يريد ان يتكلم في
هذا الامر فليطلع لنا قرنه
فلنحن احق به منه ومن ابيه
قال حبيب بن مسلمة فهلا
اجبته، قال عبد الله فحللت
حبوتي وهممت ان اقول احق لهذا
الامر منك من قاتلك واباك
على الاسلام فخشيت ان اقول
كلمة تفرق بين الجمع وتسفك
الدم ويحمل عني غير ذلك
فذكرت ما اعد الله في الجنان.
(كتاب المغازي. باب غزوة الخندق)

اور جب لوگ منتشر ہو گئے (یعنی تحکیم کا قصہ
ختم ہو گیا[1]۔ اور خاص طور سے حضرت علی
کے لوگ چلے گئے) تو (ایک وقت میں) معاویہ
نے (باقی لوگوں سے) خطاب کیا اور کہا کہ
اگر کسی کو اس معاملۂ خلافت میں دعویٰ
ہو تو اپنا دعویٰ سامنے لائے ہم ہر دعویدار
سے اور اسکے باپ سے زیادہ حقدار نکلیں گے
(میرا یہ بیان سنکر حضرت معاویہ کے ایک
طرفدار) حبیب بن مسلمہ بولے: تم نے کچھ
جواب نہ دیا؟ میں نے کہا کہ: ہاں میں نے
اپنی نشست بدلی تھی اور چاہا تھا کہ
کہوں کہ "تم سے زیادہ حقدار وہ ہے جس نے
تم سے اور تمھارے باپ سے اسلام کیلئے جنگ
کی" لیکن مجھے فوراً خیال ہوا کہ یہ بات اس وقت
کی اجتماعیت میں تفرقہ ڈال سکتی ہے خونریزی
کی آگ بھڑکا سکتی ہے اور خود میرے بارے
میں غلط فہمی پھیلا سکتی ہے اور اسکے بعد مجھے
اللہ کے وہ انعام و اکرام یاد آئے جن کا ایسی
باتوں سے گریز پر جنت میں دئیے جانے کا وعدہ ہے۔

---

[1] مصنف عبد الرزاق میں "تفرق" کی جگہ "تحکم" ہے۔ اور یہی تعبیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے جیسا کہ خود مصنف نے بھی بیان فرمایا ہے میں مصنف کے نسخہ کا سہارا لیا ہے۔

[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحکیم کا معاملہ کسی صورت پر ختم ہو گیا تھا جس سے تمام جماعت کے لوگ ... [illegible]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو جواب دینا چاہا تھا مگر پھر روک لیا اُس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو بھی اسلام میں سابقیت اور اسکے لئے قربانیوں کا فخر حاصل ہے وہ منصب خلافت کے زیادہ حقدار ہیں جن میں خود حضرت عبداللہ بن عمر بھی داخل ہوتے تھے، لیکن اسی واقعہ کی ایک دوسری روایت بحوالہ طبرانی کے بارے میں حافظ ابن حجر شارح بخاری بتاتے ہیں کہ اس میں حضرت عبداللہ بن عمر کے یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں کہ :-

فما حدثت نفسی بالدنیا قبل یومئذٍ (فتح الباری ج، حدیث ۴۱۰۸)

یہ پہلا دن تھا کہ میرے دل میں دنیا طلبی کی بات آئی (یعنی حکومت کے حق کا دعویٰ پیدا ہوا)

ان الفاظ کی رو سے حضرت معاویہ کے مقابلے میں حضرت ابن عمر کے دل میں آنے والی یہ بات (اس وقت) تنہا انکی اپنی ہی ذات سے متعلق ہو جاتی ہے۔ اور حضرت حسینؓ جیسے خیالات حضرت معاویہؓ کے بارے میں رکھتے تھے وہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات ہی نہیں ہے۔ باب دوم میں اُن کا ایک خط خود حضرت معاویہ ہی کے نام گزر چکا ہے جو صاف الفاظ میں بتاتا ہے کہ وہ انکی حکومت کو کیا سمجھتے تھے۔

بہرحال یہ بات کوئی راز نہیں ہے کہ ان حضرات نے اگرچہ حضرت معاویہ سے بیعت کر لی تھی، مگر ایک مجبوری کے درجے میں کی تھی، پوری طرح اہل سمجھ کر نہیں کی تھی۔ اور بنیادی وجہ وہی تھی جس کا اظہار حضرت ابن عمر کے مذکورہ بالا بیان سے ہوتا ہے کہ وہ سابقین اور سابقین اوّلین کے ہوتے ہوئے متاخرین کیلئے خلافت اسلامی کا حق نہیں مانتے تھے، اِلّا یہ کہ دوسری مصالح کی وجہ سے انکو مجبوراً قبول کر لیا جائے پس کیا گنجائش تھی کہ وہ یزید کو اپنی اور اپنے جیسوں کی موجودگی میں خلیفۂ اسلام ماننے کیلئے تیار ہو جاتے؟ لہٰذا علاوہ ان حضرات کے اس صریح موقف کے کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی (اور گویا خلافت بطور وراثت) ایک غیر اسلامی طریقہ ہے یہ بات بھی تقریباً یقینی ہے کہ وہ یزید کو اس بنا پر بھی منصب خلافت کیلئے ناقابلِ قبول سمجھتے تھے کہ وہ اپنے والد معاویہ سے بھی قطعی طور پر مفضول تر شخص تھا، لیکن یہ بات قطعی جھوٹ اور افتراء ہے کہ یزید کے بارے میں کسی فسق وفجور کا مسئلہ بھی اٹھایا جاتا تھا، یہ مسئلہ اگر اٹھا ہے

تو حضرت حسینؓ کی شہادت کے تین سال بعد کچھ اہلِ مدینہ کی طرف سے اٹھا ہے۔ اور اُسے رد کرنے والے اُسی مدینے میں حضرت حسنؓ و حسینؓ کے بھائی حضرت محمد بن حنفیہ بن حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسے حضرات بھی تھے جن کے ردّ کا وزن نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت معاویہ کی وفات کے وقت تک یزید کے مزاج و کردار کا ایک اچھا آئینہ ہمارے خیال میں اُس کا وہ مختصر سا خطبہ ہے جو اہل تاریخ کے بیان کے مطابق اُس نے اپنے والد حضرت معاویہ کی وفات کے بعد دیا تھا۔ اس خطبے کے آئینے میں اُسکی شخصیت ایک سنجیدہ باوقار اور ذی علم جوان کی نظر آتی ہے نہ کہ شراب و کباب، رقص و سرود اور لہو و لعب کے ایک رسیا کی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "معاویہ کا انتقال ہوا تو یزید حوارین[1] میں تھا ضحاک بن قیس (کوتوال شہر) نے اطلاع کرائی تو وہ آیا ضحاک نے شہر سے باہر اُس کا استقبال کیا، یزید نے وہاں سے اندرون شہر میں جانے کے بجائے قبرستان کا رُخ کیا۔ والد کی قبر پر نماز جنازہ ادا کی یہاں سے فارغ ہو کر شہر میں آیا حکم دیا کہ "الصلاۃ جامعۃ" کی نداء کرا دی جائے۔ پھر اپنی اقامت گاہ خضراء میں داخل ہو کر غسل کیا۔ لباس بدلا۔

ثم خرج فخطب الناس اوّل خطبة	پھر باہر آیا اور بحیثیت امیر المؤمنین لوگوں سے
وهو امير المؤمنين فقال بعد	پہلا خطاب کرتے ہوئے حمد و ثنا کے بعد کہا کہ لوگو!
حمد الله والثناء عليه: ايها الناس!	معاویہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے تھے، اللہ
انّ معاوية كان عبداً من عبيد الله	نے انکو اپنی نعمتوں سے نوازا، پھر اپنے حضور
انعم الله عليه ثمّ قبضه اليه	میں بلا لیا وہ اپنے بعد والوں سے بہتر اور پیشرووں سے
وهو خير ممن بعده ودون من	کمتر تھے لیکن میں اللہ کے سامنے ان کا تزکیہ کرنے
قبله، ولا ازكيه على الله عزّ وجل	(بھلائی کی سند دینے) کیلئے نہیں کہتا، اس لئے کہ
فانه اعلم به، ان عفى عنه فبرحمته	وہ انکو زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اگر اُن سے درگزر
وان عاقبه فبذنبه وقد وليت الامر	فرمائے تو یہ اُسکی رحمت سے ہوگا۔ اور اگر گرفت فرمائے

[1] یہ مقام حلب (شام) کے قریب ہے۔

من بعدہا ......[1] تو یہ اُن کے گناہوں کی وجہ سے ہوگا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اُن کے بعد خلافت کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس خطبے کی عبارت، اس کا مضمون اور اس کا لہجہ ہر چیز اُس شخص (یزید) کے بارے میں اُس عام خیال کی تردید کرتی ہے جو کسی واقعی بنیاد کے بغیر صرف اس لئے پھیلنے میں کامیاب ہوگیا ہے کہ اس شخص کی حکومت کے زمانے میں اسی کے حکام اور لشکریوں کے ہاتھوں ریحانۂ رسولؐ، جگر گوشہ بتولؓ، حضرت حسینؓ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا۔ اور اس نے اپنے حکام سے کوئی باز پرس نہ کی، اس لئے ایسے آدمی کے متعلق جو بھی برائی کسی نے سنا دی وہ قابلِ یقین ہوگئی۔ مگر یہ ہے یقیناً اسلامی انصاف کے خلاف بات کہ کسی کے ایک جرم کی سزا میں، اس جرم سے پہلے کی اسکی زندگی کو بھی خواہ مخواہ بدنام کیا جائے، ہاں جن لوگوں کے نزدیک جھوٹ سچ ہر طریقے سے صحابۂ کرام کو بدنام کرنا ایک کارِ ثواب ہے اُن کے لئے بالکل ٹھیک ہے کہ وہ پروپیگنڈے کا یہ تیر بھی جو بہت موقع کا ہے صحابہ کرام ہی کو نشانہ بنانے کی نیت سے چلائیں۔

یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ اسکے حق میں بالکل سیدھی اور معقول بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، اسلئے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ مذکورۂ بالا خطبہ سے ہم صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بندروں، ریچھوں کے ساتھ کھیلنے والا، شراب و کباب میں غرق لہو ولعب میں مست اور زنا و قمار کا رسیا نہیں نظر آتا جیسا کہ بتایا جاتا ہے، کیونکہ اس قماش کے لوگ ایسی محتاط دانشورانہ اور دین و دنیا کی نزاکتوں پر حاوی زبان نہیں بولا کرتے، رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی پرہیزگار ہو یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جا سکتا نہ یہی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ وہ جس نسل اور جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کے بارے میں قرنِ اول کی نسل اور اصحاب کرام کے طبقے والے اتقاء و پرہیزگاری کی توقع کبھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۴۳

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:۔

وقد کان یزید فیہ خصال محمودۃ	یزید میں بعض بڑی عمدہ خصلتیں تھیں مثلاً
من الکرم والحلم والفصاحۃ و	حلم وکرم شعر وفصاحت شجاعت اور امورِ
الشعر والشجاعۃ وحسن الرأی	سلطنت میں حسنِ رائے۔ اسی کے ساتھ اس میں
فی الملک وکان فیہ ایضًا اقبال	خواہشات نفس کی طرف ایک گونہ میلان
علی الشھوات وترک بعض الصلوٰۃ	اور بعض اوقات ترک صلاۃ کا عیب بھی تھا
فی بعض الاوقات واماتتھا فی	اور نمازوں کے بارے میں بے اہتمامی تو
غالب الاوقات[1]۔	اُس سے عمومًا صادر ہوتی تھی۔

اس عبارت میں آخری دو باتیں (کبھی کبھی ترک نماز اور کثر نمازوں کے سلسلہ میں بے اہتمامی) کے سوا اور جو کمزوریاں بیان کی گئیں ہیں وہ ہمارے نزدیک بالکل بعید نہیں بنسبتہ تاریخ کے مطابق ان کمزوریوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اور ایسی روایتیں ملتی ہیں جو ذمہ دارانہ جرح وتنقید کے عمل سے گزرنے کے بعد اس طرح کی کمزوری کا یزید کے بارے میں گمان قابلِ قبول بنا دیتی ہیں، البتہ آخری دونوں باتیں ایسی ہیں جن کے لئے باقاعدہ ثبوت کی ضرورت ہے جو ابن کثیر نے فراہم نہیں کیا، علاوہ ازیں یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ دو اتنے سنگین عیب یزید میں پائے جاتے اور اس کی ولی عہدی سے شدید اختلاف کرنے والے حضرات ان کی طرف اشارہ نہ کرتے جبکہ یہ کوئی چھپے رہنے والے عیب نہیں تھے۔ اور نہ ہی حقیقت میں یہ ہو سکتا تھا کہ حضرتِ معاویہ ایسے فرزند کو جو ترک نماز اور اماتت صلوٰۃ کا عادی ہو اس امت پر خلیفہ بنا کر مسلط کریں جس کی سب سے بڑی پہچان "اقامت صلوٰۃ" ہے بہر حال وہ بڑا متقی نہ سہی لیکن اُن عیبوں کی نسبت اسکی طرف بڑی زیادتی ہے جو مشہور کر دیئے گئے ہیں اور خاص کر یہ تو بالکل ہی بے بنیاد بات ہے کہ اختلاف کرنے والے حضرات اسکے کچھ عیبوں کو بھی اختلاف کی وجہ بتاتے تھے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۲۳

بابِ ہفتم

حضرت معاویہؓ کی وفات عہدِ یزید کا آغاز حضرت حسینؓ کی ہجرت

سنہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے فارغ ہونے کے بعد حضرت معاویہ چار سال زندہ رہے۔ رجب سنہ ۶۰ھ میں آپ نے اس حال میں وفات پائی کہ جن حضرات نے سنہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار کیا تھا وہ اپنے اسی انکار پر قائم تھے۔

یزید کو حضرت معاویہ کی وصیت

بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے موت کے وقت اس سلسلے میں کچھ وصیت بھی یزید کو کی تھی۔ اس وصیت کی روایتیں مختلف ہیں۔ اور وصیت کی روایتوں کے اختلاف سے پہلے اس معاملے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ وصیت بالمشافہہ تھی یعنی یزید اس وقت آپ کے پاس موجود تھا۔ یا وہ اُس وقت موجود نہ تھا۔ اور وصیت قلمبند کرا کے اس کیلئے چھوڑی گئی۔ ابن اثیر نے صراحت کے ساتھ اُسکی عدم موجودگی کی روایت کو ترجیح دی ہے[1]۔ اور ابن کثیر کا بھی رجحان یہی معلوم ہوتا ہے، اگرچہ صریح الفاظ میں یہ بات انھوں نے نہیں کہی ہے۔ موقع کی تفصیلات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی فیصلہ اور رجحان صحیح ہے۔ وصیت کی روایتوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس میں کچھ اختلاف

---

[1] الکامل ج ۳ ص ۲۶۰

ایسا بھی ہے جو سچ اور جھوٹ کی نوعیت کا حامل ہے مثلاً سب سے پہلی روایت جو یزید کو موجود اور بالمشافہہ مخاطب بناتی ہے اس کے مطابق حضرت معاویہ نے کہا کہ:-

"بیٹے میں نے تمہاری طرف سے پوری دوڑ بھاگ کرلی ہے۔ ہر چیز ہموار کردی ہے دشمنوں کو زیر کردیا ہے، کُل عرب کی گردنیں تیرے لئے جھکا دی ہیں اور اب سوائے قریش کے چار آدمیوں کے مجھے کسی کی طرف سے اندیشہ نہیں ہے کہ امر خلافت میں تجھ سے نزاع کرے، یہ چار ہیں حسین بن علی۔ عبداللہؓ بن عمر عبداللہؓ بن زبیر۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر۔۔ پس عبداللہؓ بن عمر کی بات تو یہ ہے کہ کثرت عبادت نے انھیں اب کسی کام کا نہیں رکھا ہے جب دیکھیں گے کہ اور سب نے بیعت کرلی تو وہ بھی کرلیں گے۔ رہے حسین بن علی تو عراق والے انھیں تیرے مقابلے پر نکالے بغیر چھوڑیں گے نہیں۔ اگر ایسا ہی ہوا اور وہ خروج کر بیٹھیں اور تم ان پر قابو پاؤ تو درگزر کرنا اس لئے کہ بہت قریبی رشتہ ہے اور بڑا حق ہے تیسرے ابن ابی بکر ہیں وہ بس اپنے ساتھیوں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اُن کی حوصلہ مندیوں کا میدان تو بس عورتیں اور ویسی ہی دوسری لذتیں ہیں۔ ہاں وہ شخص جو تجھ پر شیر کی طرح گھات لگائے گا اور لومڑی والی وہ چالیں چلے گا کہ ذرا تو اُسے موقع دے تو وہ تجھ پر جست لگا دے، وہ عبداللہؓ بن زبیر ہے۔ اگر وہ ایسا کرے اور تجھے اس پر قابو مل جائے تو ٹکڑے ٹکڑے ہی کر ڈالنا"[1]

اس وصیت میں جھوٹ کی آمیزش کا کھلا نشان حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا تذکرہ ہے، اُن کے بارے میں بہت تفصیل سے بحث گزر چکی ہے جس کی رو سے اُنکی زیادہ سے زیادہ زندگی ۵۳ھ تک مانی جاسکتی ہے حضرت معاویہ ۶۰ھ میں انکی بابت کوئی وصیت کریں۔ یہ صرف ایک جھوٹ اور جعل ہو سکتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ بعد کے زمانے کے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۱

کسی ایسے آدمی کی جعل سازی ہے۔ جو اس تاریخی حقیقت سے بے خبر تھا، نیز اس حقیقت سے بھی بے خبر تھا کہ حضرت معاویہ کی وفات کے وقت یزید کی موجودگی ثابت کرنا مشکل ہے۔ اس کے مقابلے میں طبری ہی نے اگلی سطروں میں جو وصیت نامہ درج کیا ہے جو یزید کی غیر موجودگی میں دو اہم اشخاص کے سپرد کیا گیا تھا کہ یزید کو دیا جائے اور جو عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے بے محل اور بے حقیقت تذکرے سے بھی پاک ہے اُس کا مزاج مذکورہ بالا وصیت سے بہت مختلف اور حضرت معاویہ کے دور اندیشانہ فراخدلانہ صلہ رحمانہ اور رعایا پرورانہ مزاج سے پوری طرح جوڑ کھاتا ہے۔ اس لئے اُسکے بارے میں یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ فی الواقع حضرت معاویہ ہی کا ہوگا۔ اس وصیت نامہ کی روایت کے مطابق۔

"جب معاویہ کا وقت ۶۰ھ میں آخر ہوا، اور یزید اس وقت موجود نہ تھا، تو انھوں نے ضحاک بن قیس فہری کو جو اُن کا پولیس افسر تھا، اور مسلم بن عقبہ المرّی کو بلایا اور ان سے کہا کہ میری وصیت یزید کو پہنچا دینا کہ اہل حجاز کا خیال رکھو جو تمہاری اصل ہیں۔ اُن میں سے جو کوئی تمھارے پاس آوے اس کا اکرام کرو اور جو نہیں آتا ہو اُسکی خبر رکھو، اور عراق والوں کا بھی خیال رہے کہ وہ اگر تم سے روز ایک عامل (حاکم) معزول کرنے کا مطالبہ کریں تو اُن کا مطالبہ پورا کر دو۔ اس لئے کہ ایک عامل کی معزولی اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایک لاکھ تلواریں تمھارے خلاف حرکت میں آویں۔ اور اہل شام کا بھی خیال رہے کہ انہی کو تمھارے رازداروں کا مرتبہ ملنا چاہیئے۔ کبھی دشمن کی طرف سے کوئی چیلنج آئے تو ان کی مدد حاصل کرو۔ اور جب مہم تمام ہو جائے تو انھیں اُن کے ملک کو واپس کر دو۔ اگر وہ غیر ملک میں زیادہ ٹھیرے تو وہاں کی خصلتیں اختیار کرلیں گے اور (آخری بات یہ ہے کہ) مجھے قریش میں بس تین آدمیوں کی طرف سے (تمھاری مزاحمت کا) اندیشہ ہے حسین بن علی عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر

—عبداللہ بن عمر کا جہاں تک سوال ہے تو دین (کی شدت نے) اُنھیں بالکل توڑ ڈالا ہے وہ (اپنی ذات سے) تمھارے مقابل کسی شئے کے خواہاں نہیں ہوں گے۔ رہے حسین بن علی تو وہ ذرا ہلکے آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے اُنکے باپ کو قتل کیا اور اُنکے بھائی کو بے سہارا چھوڑا انھیں کے ذریعہ اللہ تمھاری طرف سے بھی اُن کو کافی ہو جائے گا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ اُن کا بہت قریبی رشتہ ہے، بہت بڑا حق ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی قرابت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اہلِ عراق انھیں میدان میں لائے بغیر چھوڑ دیں گے۔ اگر ایسا ہوا اور تم اُن پر قدرت پاؤ تو درگزر کرنا کیونکہ اگر میرے اور اُنکے درمیان ایسی صورت پیش آتی تو میں درگزر ہی کرتا اور رہا وہ جو ابن زبیر ہے وہ زبردست داؤں باز ہے۔ وہ سامنے آجائے تو کسر نہ چھوڑو۔ ہاں اگر صلح چاہے تو ضرور صلح کر لینا اور اپنی قوم (قریش) کا خون جہاں تک تم سے ہو سکے اسکو بہنے سے بچانا۔[1]

بہرحال ان اختلاف کرنے والے تین حضرات کے بارے میں جو حضرت معاویہ کی وفات تک زندہ تھے تاریخی روایات کے مطابق حضرت معاویہ نے یزید کو کچھ وصیت کی تھی اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔[2]

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۱ [2] "خلافت معاویہ ویزید" کے مصنف جناب محمود احمد عباسی مرحوم نے ایسی کسی وصیت سے انکار کرتے ہوئے ایک دوسرا وصیت نامہ اپنی کتاب میں درج کیا ہے جس میں یزید کی خلافت سے کسی کے اختلاف یا اختلاف کرنے والے حضرات کا کوئی ذکر نہیں ہے ہمارے نزدیک یہ مرحوم کے محض اس غلو کا نتیجہ ہے جو انکی تصنیف پر چھایا ہوا ہے، وجس کے نتیجے میں وہ بعض قطعی طور پر ناقابل انکار باتوں سے بھی انکار کی کوشش کر جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں ماننا چاہتے کہ یزید کی ولی عہدی کے مسئلے میں جو حضرات اختلاف کر رہے تھے انکی کچھ اہمیت تھی۔ اس لئے اختلاف سے متعلق جو باتیں بدیہی طور سے ناقابل قبول تھے اور ہم نے بھی انکو رد کیا تو انکی تردید مرحوم نے اس انداز سے کی کہ اختلاف کی کمیں کہانی ہی اُس تردید میں سمٹ جائے۔ اور پھر جہاں حضرت معاویہ کی وصیت سے اختلاف کی کہانی میں زہر گھولنے ڈانڈی وہاں مرحوم نے اسکی تردید کر دی کہ وصیت کے اس مضمون کو بغیر کسی ثبوت بحث و قرینے کے جعلی بتا کر ایک دوسرا وصیت نامہ البدایہ والنہایہ کے حوالے سے درج کر دیا۔ اس وصیت نامہ پر مضمون ہم (باقی صفحہ) ...

---

[1] ضعیف سہ ماہی کراچی جون ۱۹۶۲ء۔ البدایہ والنہایہ کو مصنف کی سی حیثیت کی کتاب میں ۱۲۱۔ ۲۲۔ ۲۲ نمبر ۲۲۴۔۲۲۹۔

بیعت کا مطالبہ

والد کے انتقال کی خبر پاکر یزید کے دمشق پہنچنے کا ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے، اس خطبہ سے فراغت کے بعد جو بطور امیر المؤمنین اُس نے دمشق پہنچ کر دیا[1] مؤرخین کے بیان کے مطابق اُس کا پہلا کام یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینے کے گورنر ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو حضرت معاویہؓ کی وفات کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی یہ حکم بھی کہ عبداللہ بن عمر عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی سے بیعت لی جائے لیکن دو مختلف قسم کی روایتیں اس بارے میں ہیں ایک روایت کہتی ہے۔

أما بعد فخذ حسيناً وعبد الله	کہتا یہ ہے کہ حسین، عبداللہ بن عمر اور
بن عمر وعبد الله بن الزبير	عبداللہ بن زبیر کو بیعت کیلئے پکڑ و
بالبيعة أخذاً شديداً ليست	اس سختی کے ساتھ کہ اُس میں کوئی
فيه رخصة حتى يبايعوا والسلام[2]	رخصت نہیں حتیٰ کہ بیعت کریں۔

لیکن اس سخت ہدایت کے برخلاف ولید کا برتاؤ اسقدر نرم دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے سے پیشتر کے اور جہاندیدہ گورنر مروان بن الحکم کو اس حکم کی تعمیل میں مشورے کے لئے بلاتا ہے اور یہ مشورہ پاتا ہے کہ عبداللہ بن عمر کی بات تو کچھ ایسی نہیں ہے۔ البتہ باقی دو کو اسی وقت بلاؤ اور بیعت نہ کریں تو گردن اُڑا دو۔ اور جب تک بیعت نہ کرلیں یہ بھی مت بتاؤ کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ ورنہ ان کا حوصلہ بڑھ جائے گا[3]۔ یزید کے سخت حکم اور مروان کے سخت تر مشورے کے باوجود روایت یہ کہتی ہے کہ ولید نے کوئی سختی نہیں کی عبداللہ بن زبیر تو اُس وقت آئے نہیں تھے۔ مگر حضرت حسین آگئے اور حضرت معاویہ کی وفات پر تعزیتی کلمات کہہ کر مطالبہ بیعت کے سلسلے میں یہ عذر کیا کہ:-

---

گزشتہ صفحہ بقیہ) خطبہ سے بسی کوئی بات نہیں ہے کہ اُس سے اختلاف کرنے کی ضرورت سمجھی جائے مگر جس بیعت کا ابن جعبری کی روایت ہے در یدیہ و لنہ یہ میں بھی منقول ہے، عباسی صاحب انکار کرنا چاہتے ہیں۔ اسکے انکار کی کوئی معقول وجہ جب تک نہ ہو اس وقت تک انکار کا کوئی وزن تو نہیں ہو سکتا۔

[1] یہ بھی گزشتہ باب میں نقل ہو چکا ہے [2] طبری ج ۶ صفحہ ۱۸۸ [3] ایضاً صفحہ ۱۸۹

فان مثلی لا یعطی بیعتہ	میرا جیسا آدمی خفیہ بیعت تو نہیں کیا کرتا
سرًّا ولا اراک تجتزیٔ بہا منّی	اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسے سے سرّی
سرا دون ان نظہرہا علی	بیعت کو تم کافی سمجھو گے ، ضرورت ہے کہ
رؤس الناس علانیۃً فاذا	یہ علانیہ سب لوگوں کے سامنے ہو پس
خرجت الی الناس فدعوتہم	جب تم سب لوگوں کے واسطے بیعت کو
الی البیعۃ دعوتنا مع الناس	باہر نکل کر بیٹھو گے ہم کو بلوا لینا۔ اس
فکان امرًا واحدًا۔[1]	طرح سب کام ساتھ ہو جائے گا۔

اور یہ عذر ولید نے بلا حیل وحجت قبول کر لیا۔

فقال لہ الولید وکان یحب	پس ولید جو عافیت پسند تھا اس نے
العافیۃ ، فانصرف علی اسم اللہ	کہا ٹھیک ہے۔ اللہ کے نام پر آپ جائیے
حتیٰ تاتینا مع جماعۃ الناس۔[2]	اور پھر لوگوں کے ساتھ آجائیے گا۔

اسی واقعہ کی دوسری روایت

طبری کی اس روایت کے برعکس ابن کثیر نے محمد بن سعد کے حوالے سے روایت درج کی ہے کہ :۔

"۱۵ رجب ۶۰ھ کی شب میں معاویہ کا انتقال ہوا۔ اور لوگوں نے یزید سے بیعت کی۔ اسکے بعد یزید نے عبد اللہ بن ادریس عامری کے ذریعہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان گورنر مدینہ کو مراسلہ بھیجا کہ اپنے وہاں کے لوگوں سے بیعت لیں اور اندرون عزیزین قریش سے کہیں ان میں بھی خاص کر حسین بن علی کو مقدم رکھیں کہ مرحوم امیر المؤمنین نے مجھے ان کے بارے میں خصوصی طور پر نرمی اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۹ [2] ایضاً

صلح جوئی کی وصیت کی ہے پس ولید نے آدھی رات ہی میں جبکہ یہ پیغام اسے ملا حسین اور عبداللہ بن زبیر کے پاس آدمی بھیجا اور یہ بتاتے ہوئے کہ معاویہ کی وفات ہوگئی ہے ان سے کہا کہ امیر المؤمنین یزید کے لئے آپ سے بیعت بھی مطلوب ہے۔ ان حضرات نے کہا کہ اس کو صبح پر رکھئے تاکہ اور تمام اہل مدینہ کا رویّہ بھی ہمارے سامنے آجائے۔ اور یہ کہہ کر حسین اُٹھ پڑے اور ابن زبیر بھی ان کے ساتھ نکلے[۱] اور کہا اُس یزید کو ہم جانتے ہیں نہ اُس میں عزم ہے نہ مروّت"

وقد كان الوليد اغلظ للحسين	اور ہوا یہ تھا کہ ولید نے حسین کے ساتھ
فشتمه الحسين واخذ بعمامته	سخت کلامی کی تھی پس حسین نے بھی
فنزعها من رأسه فقال الوليد	اسکو سخت سست کہا اور اُس کے
ان هجنا بابي عبد الله إلا أسدًا	سر سے عمامہ کھینچ لیا۔۔۔۔۔۔۔
فقال له مروان ـ او بعض	۔۔۔۔ اس پر مروان یا کوئی مصاحب
جلسائه اُقتله فقال إن ذالك	بولا کہ گردن ماردینی چاہئے۔ ولید
لدم مضنون به مصون في	نے کہا نہیں بنی عبد مناف کا یہ خون
بني عبد مناف[۲]۔	بڑا قیمتی اور قطعی محفوظ ہے۔

اس روایت میں معاملہ برعکس نظر آتا ہے کہ یزید کی طرف سے نرمی کی خصوصی ہدایت ہوچکی ہے، مگر ولید ترش کلامی سے پیش آرہا ہے لیکن آخر میں یہ بھی ہے کہ اُس کی پگڑی کھینچ لئے جانے کا واقعہ بھی حضرت حسین کے ہاتھوں پیش آگیا اور اس پر مروان یا کسی ہم جلیس نے تلوار اُٹھانے کو کہا بھی تو اس نے بالکل وہ جواب دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے نہ صرف یزید کی ہدایت کا لحاظ تھا بلکہ وہ خود بھی حضرت حسین کے لئے اعلیٰ درجہ کا احترام دل میں

---

[۱] اس روایت کے مطابق دونوں حضرات ولید کے پاس آگئے تھے۔ مگر طبری کی روایت کے مطابق صرف حضرت حسین آئے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ [۲] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳

رکھتا تھا۔ اور یہی بات بعد کے واقعات بھی اس کے لئے ثابت کرتے ہیں ـــــ جو آگے آ رہے ہیں[1]۔ ـــــ پس حضرت معاویہ کی وصیت کی روشنی میں، ابن سعد کی روایت کی روشنی میں ـــــ جو یزید کی طرف سے نرمی کی ہدایت دکھاتی ہے ـــــ اور ولید کے اس رویّہ کی روشنی میں جس کی گواہی طبری کی پوری روایت دیتی ہے اور ابن سعد کی روایت کا آخری حصہ دے رہا ہے۔ ہمارے لئے انصاف پسندی کی رو سے مناسب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ طبری کی روایت میں یزید کی

---

[1] طبری کی جس روایت کا اوپر حوالہ دیا گیا اُس میں یہ بات کہ مدینہ کا اموی گورنر اور یزید کا عمزاد ولید بن عتبہ بن ابی سفیان حضرت حسین کے لئے نہایت گہرا احترام دل میں رکھتا تھا۔ اور زیادہ کھل کر آئی ہے۔ اُس میں ہے کہ ولید نے جب حضرت حسین کے عذر پر کہا کہ درست ہے آپ تشریف لے جائیں کل ہی کو سب لوگوں کے ساتھ زحمت دی جائے گی تب مروان نے فوراً ہی کہا کہ "کیا غضب کرتے ہو۔ یہ اگر اس وقت نکل گئے تو بہت بڑے کشت و خون کے بغیر بیعت کا سوال نہیں پیدا ہوتا" اور اس پر بھی جب ولید نے اپنا رویہ نہ بدلا اور حضرت حسین کو جانے ہی دیا۔ تب مروان نے پھر ولید سے اپنی بات دہرائی کہ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے اب یہ قابو میں آنے والے نہیں۔ تب ولید کے الفاظ طبری نے جواب میں یہ نقل کئے ہیں۔

ویحَ غیرک یا مروان انک قد	برا بھلا ہو مروان تو نے میرے لئے وہ بات پسند کی
اخترت لی التی فیها هلاک دینی	جس میں میرے دین کی بربادی ہے۔ بخدا پوری
واللہ ما احب ان لی ما طلعت	دنیا جس پر سورج طلوع و غروب ہوتا ہے اگر
علیه الشمس وغربت عنه من	ملک و مال بھی مجھے ملتا ہو تو قتل حسین کے بدلے
مال الدنیا وملکها وانی قتلت	میں مجھے یہ پسند نہ ہوگا۔ سبحان اللہ میں حسین کو
حسینا سبحان اللہ اقتل حسینا	بس اس بات پر قتل کردوں کہ وہ بیعت نہیں
ان قال لا ابایع واللہ انی لاظن	کرتے ہیں۔ واللہ میرا خیال ہے کہ جس کسی
امرأ یحاسب بدم حسین لخفیف	شخص کو خون حسین کا حساب دینا پڑے گا
المیزان عند اللہ یوم القیامة	قیامت میں اس کی میزان وزن میں ہلکی ہوگی۔

طرف سے جو سختی کی ہدایت پائی جاتی ہے اور ابن سعد کی روایت میں ولید کی طرف جو سخت کلامی منسوب کی گئی ہے ان دونوں باتوں کو الحاقی کارروائی سمجھا جائے۔ رجب ۶۰ھ سے لے کر محرم ۶۱ھ تک جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سانحہ شہادت پیش آیا۔ ہمیں طبری کی اس ایک موقع کی روایت کے سوا کوئی دوسری روایت نہیں ملتی جو حضرت حسین کے بارے میں یزید کے سخت رویہ کی شہادت دیتی ہو، حالانکہ اس دوران میں وہ یزید کی بیعت سے بچ کر مدینے سے مکے چلے گئے، پھر مکے میں چار پانچ مہینے مقیم رہے جس میں کوفے جانے کی تیاری ہوتی رہی حتیٰ کہ پھر کوفے کا سفر بھی شروع ہوگیا۔ مگر سمجھانے بجھانے کی کوشش کا ذکر تو یزید اور اسکے حکام کے بارے میں ملتا ہے، سختی یا داروگیر کا قطعاً نہیں ملتا جب کہ اسکے برعکس حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ اسی دن سے جس دن سے وہ حضرت حسین کی طرح مدینے سے مکے کے لئے نکلے ہر طرح کی سختی کی ہدایتیں یزید کی طرف سے چلتی رہیں۔ اور اس کے حکام کی طرف سے داروگیر کی کوششیں مسلسل ہوتی رہیں۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔

امام باقرؒ کی روایت

اور کسی کی نہیں خود امام باقر کی روایت بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ یزید کی بیعت کے سلسلے میں حضرت حسین پر کوئی سختی روا نہیں رکھی گئی۔ ابن جریر طبری اپنی سند بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :-

... قال حدثنا عمار الدهنی	.... ہم سے عمار دُہنی نے بیان کیا کہ
قال قلت لابی جعفر حدثنی	میں نے ابوجعفر (امام باقر) سے عرض کی
بمقتل الحسین کأنی حضرتہ	کہ مجھے قتل حسین کا قصہ اس طرح سنا دیجئے
قال مات معاویۃ والولید بن	کہ جیسے میں وہاں موجود تھا۔ اس پر آپ نے
عتبۃ بن ابی سفیان علی المدینۃ	فرمایا معاویہ کا انتقال ہوا اور ولید بن

فارسل الی الحسین بن علی لیأخذ بیعتہٗ فقال لہٗ اخّرنی وارفق فأخرہٗ فخرج الی مکۃ۔[1]	عتبہ بن ابی سفیان اُس وقت حاکم مدینہ تھے پس اُس نے یزید کی بیعت کیلئے حسین کو بلا بھیجا۔ آپ نے کہا کہ ذرا مؤخر کردو اور نرمی برتو اُس نے مؤخر کردیا تب آپ مکہ کیلئے نکل گئے۔

مکّہ کو روانگی

بہر حال حضرت حسین کی فرمائش پر کہ بیعت کا معاملہ مؤخر کردیا جائے (کیونکہ ان کا جیسا آدمی تنہائی میں بیعت کرے یہ کوئی مناسب بات نہیں۔ بلکہ جب تمامی اہلِ مدینہ بیعت کے لئے بلائے جائیں اُسی وقت وہ بھی آجائیں گے۔ اور سب کام ساتھ ہی ہو جائے گا) ولید نے آپ کو رخصت کی اجازت دیدی۔ اور آپ نے جیسا کہ ابھی حضرت امام باقر کی روایت سے گزرا مکہ کی راہ لے لی۔ مکہ کو آپ کی یہ روانگی ۲۷ یا ۲۸ رجب ۶۰ھ یکشنبہ کی رات میں ہوئی۔[2]

اوپر طبری کے حوالے سے ذکر آچکا ہے کہ ولید نے حضرت عبداللہ بن عمر کو تو چھوڑ دیا تھا۔ مگر حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس بیک وقت آدمی بھیجا تھا۔ جس پر حضرت حسین نے تو اسی وقت ولید سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور تشریف لے گئے۔ مگر حضرت ابن زبیر نے اس کو مصلحت نہ جانا اور پھر بار بار تقاضوں کے باوجود معاملے کو ٹالتے ہوئے رات ہی میں مکہ کیلئے نکل گئے۔ پھر اگلی رات میں حضرت حسین نے بھی مکے کی راہ لی۔[3] طبری میں ہے کہ

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۰ [2] ایضاً صفحہ ۱۹۱ [3] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۰ ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۶۳ ابن اثیر نے طبری کی مذکورہ روایت کو جن الفاظ میں درج کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملنے کا واقعہ دن میں پیش آیا تھا اور ابن زبیر اُسی رات کے آخری حصے میں مکے کے لئے نکل گئے۔ ابن کثیر کی روایت جو اوپر باقی مندہ صفحہ پر

ابن زبیر کے نکل جانے کی وجہ سے حکومت کی تمام تر توجہ چونکہ ابن زبیر کی تلاش پر مرکوز رہی اس لئے اس صبح کو وہ حضرت حسینؓ کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے، اور شام کو جب توجہ کی تو آپ نے فرمادیا کہ اب تو رات ہو رہی ہے صبح کو دیکھیں گے اور پھر اسی رات آپ بھی مکے کیلئے نکل گئے۔[۱]

پورے کنبے کے ساتھ

بتایا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ نے اپنے پورے گھرانے کو ساتھ لیا۔

خرج ببنیہ واخوتہ وبنی	آپ نکلے اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں کے
اخیہ وجُلّ اھل بیتہ	ساتھ اور گویا تمام ہی کنبہ ساتھ تھا
اِلّا محمد بن الحنفیۃ۔[۲]	سوائے بھائی محمد بن حنفیہ کے۔

جبکہ حضرت عبداللہ بن زبیر (غالباً وقت کی تنگی اور اندیشوں کی زیادتی کی وجہ سے) نے صرف ایک بھائی جعفر بن زبیر کو ساتھ لیکر سفر کیا۔ اُن کے بارے میں یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ "طریق اعظم" (شاہراہ) سے بچ کر ایک ذیلی راستے (طریق الفرع) سے سفر کیا تھا۔ اور یہ کہ جیسے ہی یہ پتہ چلا کہ وہ مدینے سے نکل گئے ہیں اور اندازہ کیا گیا کہ سوائے مکّے کے اور کہیں نہیں جا سکتے تو تقریباً اسّی سواروں کے ایک دستے کے ذریعہ اُن کی تلاش اور تعاقب کیا گیا۔ مگر چونکہ وہ عام راستے سے نہیں بلکہ غیر معروف راستے سے گئے تھے اس لئے تعاقب ناکام رہا۔[۳]

شاہراہ سے سفر

حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں مقابلانہ انداز سے کی گئی اس تصریح سے کہ

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) درج کی گئی اسکی رو سے بلاوا آدھی رات کو ہوا تھا۔ اور پھر اگلی رات کو ابن زبیر مدینے سے نکلے۔ چونکہ یہ مسلّم ہے کہ حضرت حسینؓ اُن سے ایک رات بعد نکلے ہیں اسلئے گویا حضرت نے بلاوے کے بعد دو دن اور ایک رات مدینے میں گذاری طبری کے۔ خانہ صاف نہیں ہیں۔ اس لئے ہماری نظر میں ترجیح ابن اثیر کے بیان کو ہے۔

[۱] ایضاً [۲] ایضاً [۳] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۰

انھوں نے مکہ اور مدینہ کی شاہراہ (طریق اعظم) سے بچ کر کسی ذیلی اور اجنبی راہ کو اپنایا۔ از خود بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے بچ بچا کر جانے کے بجائے عام راستے سے سفر کیا، مزید برآں چند صفحوں کے بعد طبری کی ایک روایت میں اسکی تصریح بھی آگئی ہے کہ آپ کے اہل بیت نے مشورہ دیا تھا کہ شاہراہ سے بچ کر سفر کیا جائے جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر نے کیا۔ مگر آپ نے اسے منظور نہ فرمایا اور کھلی شاہراہ سے ہی سفر کیا۔[1] آپ کے سفر کے سلسلے میں کسی تعاقب کا ذکر نہیں ہے۔ ۴ر شعبان ۶۰ھ شب جمعہ میں آپ بخیر و عافیت پورے قافلے کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچ گئے۔[2]

خیر خواہوں اور عقیدت مندوں کے مشورے

۱۔ اوپر ذکر آیا کہ حضرت حسینؓ کے قافلے میں آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ ساتھ نہیں تھے۔ اس روایت میں وہیں اُن کی زبان سے یہ بھی کہلوایا گیا ہے کہ:۔

"اے جان برادر، آپ مجھے دنیا میں سب سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ آپ سے زیادہ اور کوئی نہیں ہے جس کے لئے خیر خواہی بچا کر رکھوں۔ میری گزارش ہے کہ آپ جاتو رہے ہیں مگر ایک دم سے کسی شہر کا ارادہ مت کیجئے گا۔ بلکہ شہروں سے دور رہتے ہوئے اپنے آدمی مختلف علاقوں میں بھیجئے۔ اور اپنی بیعت کی دعوت دیجئے۔ اگر لوگ قبول کرلیں تو اللہ کا شکر کریں نہ قبول کریں اور آپکے بجائے کسی دوسرے پر اتفاق کرلیں تو اس سے نہ آپ کے دین کو کوئی بٹہ لگے گا نہ عقل کو اور نہ آپ کی شان اور منزلت میں کوئی فرق آئے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ بڑا دآپ بڑے شہروں ہی سے کسی شہر کا رُخ کرلیں اور پھر وہاں کے لوگوں میں دو گروہ ہو جائیں اور جنگ برپا ہو جس کا پہلا نشانہ خود آپ ہی بن جائیں ......

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۶ [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۰

کسی شہر میں اگر جانا ہے تو بس مکے کا رُخ کریں وہاں حالات اگر آپ کے لئے
اچھے ہیں تو فبہا ورنہ پھر سفر اور صحرا نوردی کیلئے کمر باندھ لیجئے۔ شہروں سے
دور رہتے ہوئے علاقہ در علاقہ گھومئے حتیٰ کہ پتہ چلے کہ حالات کیا ہیں لوگ
کیا سوچ رہے ہیں۔ اسکے بعد جو رائے قائم ہوگی وہی صحیح رائے ہوگی صحیح اور
دانشمندانہ رائے وہی ہوتی ہے جو حالات کی چھان بین کے بعد قائم کی جائے
اسکے برعکس جو رائے حالات کی طرف پشت کرتے ہوئے قائم کی جائے اس سے
زیادہ باعث پریشانی کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔"[1]

یہ روایت اگر صحیح ہے تو ایک طرف پختہ کاری اور دانشمندی کا اعلیٰ نمونہ ہے دوسری طرف ایک چھوٹے بھائی کی طرف سے مشاورت اور اظہار رائے میں حُسن ادب اور لطافتِ بیان کا بھی بہترین نمونہ۔ حضرت محمد بن حنفیہ حضرت حسن و حسین کے تیسرے بھائی ہیں، شجاعت اور جسمانی طاقت میں اپنے والد ماجد کے خلف تھے حضرات حسنین کے لئے بیحد محبت اور خلوص رکھتے تھے جنگ جمل اور جنگ صفین میں یہاں تینوں بھائی حضرت علی کے دوش بدوش ہوتے تھے۔ وہاں حضرت علی نے جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دونوں پھولوں (ریحانتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی حفاظت پر نظر رکھتے تھے وہاں محمد بن حنفیہ کو بھی ہدایت فرماتے کہ ان کو اپنے سے جدا اور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ حالانکہ وہ عمر میں چھوٹے تھے۔ مگر جسمانی طاقت اور قد و قامت میں غیر معمولی، جسکے بعض یادگار قصے ہیں۔ مذکورہ بالا عبارت میں حسن ادب اور لطافتِ بیان کے پردے میں صاف جھلک رہا ہے کہ وہ حضرت حسین کے اندر خیالات کے طوفان کو سمجھ رہے ہیں۔ اور اس طوفان کے اندر کوفے کی سمت سفر بھی انہیں نظر آ رہی ہے جبکہ وہ دونوں باتوں کے حق میں نہیں ہیں۔ مگر اس انداز سے حق خلوص اور امانت مشورہ ادا کرتے ہیں کہ ادب اور لطافت بلائیں لیں۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۱ — ۱۹۰ (قدرے اختصار کے ساتھ)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد بن حنفیہؒ حضرت حسنؓ کے ہم رائے تھے، اور پختگی کے ساتھ رائے قائم کر چکے تھے کہ اُن کے والد کی شہادت حالات کے جس دھارے میں ہوئی ہے، اُسکو سامنے سے بدلنے کی کوشش میں نقصانات ہیں فائدہ کوئی نہیں[1] چنانچہ آپ نہ صرف یہ کہ خود حضرت حسین کے ساتھ نہیں نکلے بلکہ اپنی اولاد میں سے بھی کسی کا نکلنا پسند نہیں کیا[2]، اور اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ جب شہادت حسینؓ کے تین سال بعد تقریباً پورا مدینہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے زیر اثر یزید کے خلاف بغاوت کا علم اُٹھا کے کھڑا ہو گیا تب بھی حضرت محمد بن حنفیہ ہی اہل مدینہ میں سے وہ دوسرے بزرگ تھے جن کا نام حضرت عبداللہ بن عمر کے ساتھ آتا ہے کہ وہ صاف طور پر اس بغاوت کے مخالف رہے[3]۔

ایک اور روایت

البدایہ والنہایہ میں مزید برآں ایک روایت اور ہے کہ مکے پہنچنے کے بعد حضرت حسینؓ نے کسی کو مدینے بھیجا، کہ بنی عبد المطلب میں سے جو افراد اُن کے ساتھ آنے سے

۱؎ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو حجرؓ بن عدیؓ کے قتل کی خبر پہنچائی گئی (جو حضرت معاویہ پر کیے جانے والے اعتراضات میں سے ایک بہت نمایاں اعتراض ہے) آپ کو اس خبر سے بہت صدمہ ہوا، مگر ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے جس بات کو بھی روکنے اور بدلنے کی کوشش کی نتیجہ میں اُس سے بھی بڑی برائی پیدا ہو گئی تو حجر کے قتل پر بھی ہم کچھ کیے بغیر نہ رہتے۔ لولا انا لم نغیر شیئاً الا صارت بنا الامور الی ما ھو اشد منہ لغیرنا قتل حجر (ابن اثیر ج ۳ ص ۲۶۲) اغلب یہی نقطۂ نظر حضرت حسن اور حضرت محمد بن حنفیہ کا تھا۔ حجر بن عدی کے قتل پر حضرت عائشہؓ کا مذکورہ تاثر ذہن میں تازہ رکھنے کے ساتھ یہ یاد کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس قتل کے سبب میں حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہ کو یہ عذر پیش کیا ہے کہ حجر کی زندگی سے جس فتنہ و فساد کا اندیشہ تھا اس کا سدباب ایک جان کے ختم ہو جانے میں زیادہ قرین عقل تھا (حوالہ سابق) ۲؎ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۵ ۳؎ ایک تیسرا نام حضرت زین العابدین علی بن الحسینؓ کا بھی اس فہرست میں ہے۔ دیکھئے ۶۳ھ کے واقعات کا بیان البدایہ ج ۸ ص ۲۱۸

رہ گئے ہیں۔ وہ بھی آجائیں چنانچہ جن کو آنا تھا وہ آئے اور بعد ازاں حضرت محمد بن حنفیہ بھی مکہ تشریف لائے۔[1]

فأدرك حسينا بمكة فاعلمه ان الخروج ليس له برأيٍ يومه هذا فابى الحسين ان يقبل، فحبس محمد بن الحنفية ولده فلم يبعث احدًا منهم حتى وجد الحسين في نفسه على محمد وقال ترغب بولدك عن موضع أُصاب فيه، فقال وما حاجتي الى ان تُصاب ويُصابون معك وإن كانت مصيبتك اعظم عندنا منهم۔[2]

اور وہاں حسین کو موجود پایا تو اُن سے کہا کہ اُن کی رائے میں اس وقت خروج کا خیال بالکل مناسب نہیں ہے (یعنی یزید کے خلاف اقدام کے خیال سے کوفے کا ارادہ) حسین نے یہ رائے قبول نہیں کی۔ اور محمد بن حنفیہ نے اپنی اولاد میں سے کسی کو انکے ساتھ نہیں بھیجا جس پر حسین کو اُن سے رنج ہوا اور کہا کہ تم اپنی اولاد کو میری جان سے زیادہ عزیز رکھ رہے ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں تو تم اور کیوں وہ تمھارے ساتھ مصیبت میں پڑیں اگرچہ یہ اپنی جگہ واقعہ ہے کہ تمھاری مصیبت میرے لئے انکی مصیبت سے بڑھ کر ہے۔

دونوں روایتوں کے لہجے کا فرق

طبری کی روایت میں جو لطافتِ اظہار اور حسن ادب ہم نے محسوس کیا تھا۔

---

[1] غالباً حج کے موقع پر [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص۱۶۵

البدایہ والنہایہ کی اس روایت کا لہجہ اس سے بالکل مختلف ہے، ہو سکتا ہے اس میں کچھ دخل کسی راوی کی بے احتیاطی کا ہو لیکن فی نفسہٖ لہجے کے فرق کی وجہ سمجھنا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے؛ پہلی روایت کا لہجہ اُس وقت کا ہے جب حضرت حسینؓ کا مدینہ چھوڑنا اُن کی سلامتی کیلئے ضروری یا کم از کم مناسب سمجھا جا سکتا تھا۔ اور مکہ سے بہتر کوئی جگہ اس کے لئے نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ حضرت محمد بن حنفیہ نے مکے ہی کا مشورہ دیا تھا۔ کوفے کے ارادہ کی بات حضرت محمد بن حنفیہ کے لئے اس وقت بس ایک اندیشے اور امکان کے درجے کی تھی چنانچہ آپ نے کافی سمجھا کہ اشاروں کنایوں کے لطیف انداز میں اُسکے خلاف رائے دیدی جائے مگر اس دوسری روایت والی گفتگو کا وقت وہ ہے جب حضرت محمد بن حنفیہ دیکھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ ان کے بیحد مخلصانہ محبّانہ اور دور اندیشانہ مشورے کو نظر انداز کر کے نہ صرف خود کوفے کا عزم کر چکے ہیں بلکہ خاندان کے چھوٹے بڑے اور عورت مرد ہر فرد کو ساتھ لئے جا رہے ہیں — جو اُن کے نزدیک موت کے منہ میں جانے والی بات تھی — تو اُن کی شدّتِ خلوص کا تقاضہ اب یہ ہو کہ لہجے کی ادبی لطافتیں ہٹا کر اُس بے لوچ صراحت سے کام لیا جائے جو شدید کام کر جائے؛ محبت کرنے والا چھوٹا اگر بڑے کو موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھے گا تو ذرا بعید نہیں کہ وہ اس انجام کو روکنے کیلئے بے ادب صاف گوئی کی جرأت بھی کر جائے۔ بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ بڑے ہونے کے باوجود حضرت حسن و حسینؓ کے نسبی احترام میں چھوٹے بن رہا کرتے تھے۔ مگر آگے آئے گا کہ جب دیکھا کہ حضرت حسینؓ اُن کی سنتے ہی نہیں ہیں اور ۔۔۔ عورتوں بچوں کو چھوڑنے کے مشورے پر بھی توجہ نہیں کرتے تو حضرت ابن عباسؓ کے خلوص اور نصح خواہی کا لہجہ بھی ایسا ہی تیز اور تیکھا ہو گیا تھا — بہرحال یہ تو قطعی واقعہ ہے کہ حضرت ابن حنفیہ کی اولاد میں سے کوئی فرد حضرت حسینؓ کے قافلہ میں شامل نہیں تھا۔ اور یہ خود ایک سخت موقف کی دلیل ہے۔

۲۔ طبری کے سلسلۂ روایات میں دوسرا نام عبداللہ بن مطیع کا آتا ہے۔ یہ اُن کے نام

"صحابہ" میں ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سن تمیز کو نہیں پہنچ پائے تھے، یعنی حضرت حسین سے کچھ چھوٹے تھے۔ واقعہ کربلا (سنہ ۶۱ھ) کے بعد سنہ ۶۳ھ میں جو واقعۂ حرہ پیش آیا ہے جو یزید کے خلاف اہلِ مدینہ کی بغاوت اور معرکہ آرائی کا نام ہے اسکے دو نمایاں قائدوں میں سے ایک یہی عبداللہ بن مطیع تھے۔ اور پھر اس معرکے کی ناکامی کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس مکے چلے گئے اور وہاں آپ ہی کے ساتھ حجاج سے مقابلہ میں شہید ہوئے[۱] ان عبداللہ بن مطیع کے بارے میں آتا ہے کہ جب حسینی قافلہ مدینے سے مکے جا رہا تھا تو یہ کہیں سے (شاید مکہ ہی سے) آتے ہوئے ملے اور سفر کا قصہ جاننے کے بعد بصد ادب و الحاح گزارش کی کہ کوفے کا قصد ہرگز نہ فرمایئے گا۔ ان لوگوں کے کردار کو بھول نہ جایئے گا[۲]۔

۳۔ ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر ایک ہی رات میں مدینۂ منورہ سے مکہ معظمہ کیلئے نکلے تھے۔ اس روایت کے حوالے سے ابن کثیر نقل کرتے ہیں کہ اثنائے راہ میں حضرت عبداللہ بن عمر بھی عمرہ سے واپس آتے ہوئے ملے اور ان دونوں صاحبان سے کہا کہ۔

اذکرکما اللہ الا رجعتما فدخلتما	میں اللہ کا واسطہ دے کر تم دونوں سے
فی صالح ما یدخل فیہ	کہتا ہوں کہ لوٹ چلو۔ کہ جو مناسب بات
الناس وتنظرا فان اجتمع	اور لوگ اختیار کریں تم بھی اسکو اختیار
الناس علیہ فلم تشذا وان	کرلو۔ پھر دیکھو اگر لوگ پوری طرح ایک
افترق علیہ کان الذی	بات پر متفق ہو گئے تو تم انحراف کرنے والوں
تریدان[۳]۔	میں سے نہیں ہوگے، اور اگر اختلاف ہوا تو
	تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔

نیز خاص طور سے حضرت حسین سے کہا کہ:۔

"اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا تھا کہ دنیا اور

---

۱ [illegible] ۲ [illegible] ص ۶۵-۶۶ ۳ طبری ج ۶ ص ۱۹۲ ۴ [illegible] ص ۱۶۲

آخرت میں سے جس ایک کو چاہیں پسند کر لیں، آپ نے آخرت پسند فرمائی۔ اور
تم آپؐ ہی کا ٹکڑا اور آپؐ کی ذات کا حصہ ہو۔ اس لئے تمھیں دنیا نہ مل سکے گی بس
یہ ارادۂ خروج چھوڑ دو"۔ یہ کہہ کر آپ نے حضرت حسینؓ کو گلے سے لگایا اور رو پڑے[1]۔
اس سلسلۂ بیان میں آگے بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ (رنج و قلق کے ساتھ) فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"غلبنا حسین بن علی بالخروج" حسین بن علی نے کوفے کے قصد کے
معاملے میں ہماری بات مان کر نہ دی۔ حالانکہ انھوں نے اپنے باپ اور بھائی کا
عبرت انگیز حال دیکھا تھا کہ کیسے فتنے اٹھائے گئے تھے اور بیچ میدان میں اُن کا
ساتھ دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ انھیں تو عمر بھر بھی کسی خروج کا نام نہ لینا تھا۔
اور لوگوں کے عمومی فیصلے میں شامل ہو جانا تھا۔ اس لئے کہ جماعت میں خیر ہے[2]"۔

---
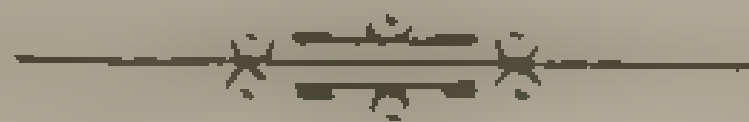
[1] ایضاً ص ۱۶۳ طبری میں یہ واقعہ اس وقت کا بتایا گیا ہے جب حضرت حسینؓ مکہ سے کوفے کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ حج پر آئے تھے انھیں بعد فراغت حج یہ اطلاع ملی تو آپ تیزی سے اُن کے پیچھے روانہ ہوئے اور راہ میں مل کر یہ بات کی۔ طبری ج ۶ ص ۱۶۳

[2] بدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳

باب ہشتم

مکہ میں ورود — اہل کوفہ کے خطوط — اور وفود
مسلم بن عقیل کا مشن

بہرحال حضرت حسینؓ شعبان ۶۰ھ کی ۴ تاریخ کو مکے پہنچ گئے اور دارِ عباسؓ میں قیام کیا۔[1] جیسا کہ ہونا ہی چاہئے تھا آپ کے پاس لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی، ان میں اہلِ مکہ بھی تھے، اور عمرہ وغیرہ کیلئے آنے والے بیرونی لوگ بھی۔ خبر کوفے بھی پہنچ گئی۔ اور رمضان میں وہاں سے شیعانِ علیؓ کے خطوط لے کر اُن کے قاصد پہنچنا شروع ہو گئے۔ ایک کے بعد ایک چار پانچ کھیپوں میں کم سے کم کوئی ڈیڑھ سو خطوط پہنچے جو نمایاں لوگوں کے تھے، یہ خطوط دعوتی تھے کہ آپ یہاں تشریف لے آیئے جاں نثار چشم براہ ہیں۔ پہلے خط کا مضمون جو طبری نے دیا ہے اس طرح ہے :-

"سلیمان بن صرد، مسیّب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر اور جملہ شیعانِ کوفہ کی جانب سے حسین بن علی کے نام۔ بعد از سلام، خدا کا دکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے آپ کے دشمنِ جابر کا[2] قصہ پاک کیا جس نے ناحق حکومت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اب اس وقت ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ تشریف لے آیئے کہ شاید اللہ آپ کے ذریعہ ہم سب کو حق پر جمع کر دے، یہاں جو اموی گورنر نعمان بن بشیر ہیں۔ ہم اُن کے پیچھے جمعہ اور عید تک

---

[1] بدایہ و نہایہ ج ۸ صـ ۱۶۲ [2] حضرت معاویہ کے، انتقال کی طرف اشارہ ہے۔

نہیں پڑھتے۔ اور اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ادھر کیلئے روانہ ہو گئے ہیں تو ہم انشاء اللہ اُن کا بستر باندھ کر انھیں شام بھیج دیں گے"۔

اس طرح کے خطوط کی جو بارش ہوئی اور طبری کے بیان[1] کے مطابق ہر دو دن کے فصل سے ایک کھیپ روانہ ہوئی۔ تو حضرت محمد بن حنفیہ کا ڈھکا ہوا اور عبداللہ بن مطیع کا کھُلا ہوا نہایت اخلاص اور الحاح کے ساتھ مشورہ کہ کوفے کا رُخ ہرگز نہ کیجئے گا[2] بے اثر ہو گیا۔ اور اِن حضرات نے جس قدر زور دے کر یہ بات کہی تھی اس سے لگتا ہے کہ ان کو خطرہ بہت تھا۔ کوفے والے بلائیں گے اور حسین اپنے آپ کو روک نہ پائیں گے۔ بہرحال اِن بلاووں کا اثر ہوا اور تاریخ کے بیان کے مطابق آپ نے طے کیا کہ اپنا ایک آدمی کوفہ بھیج کر اطمینان کریں کہ کیا واقعی یہ لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ قابل اعتماد ہے؟

مسلم بن عقیل کی روانگی

اس مقصد کے لئے آپ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کا نام طے کیا۔ اور کوفے کے جو لوگ خطوط لے کر آئے ہوئے تھے اُن کو اس مضمون کا جواب لکھ کر روانہ کر دیا کہ "میں اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو آپ لوگوں کے پاس بھیج رہا ہوں کہ یہ میرے قائم مقام بن کر حالات کو دیکھیں۔ اور مجھے اطلاع دیں۔ پس اگر انھوں نے اطمینان ظاہر کیا اور لکھا کہ آپ لوگ جو کچھ مجھے لکھ رہے ہیں اس پر آپ کے تمام معززین اور اہلِ رسوخ و اہلِ رائے کا اتفاق ہے تو میں بلا تاخیر چلا آؤں گا۔ اس لئے کہ قسم میری جان کی امام تو وہی ہے جو کتاب اللہ پر عامل، انصاف کا خوگر، حق کا تابع اور اپنے آپ کو ذاتِ حق سے وابستہ رکھنے والا ہو۔ والسلام"۔ اور فوراً ہی پھر مسلم بن عقیل کو دو کوفیوں کے ساتھ ان کے مشن پر روانہ کر دیا۔

---

[1] ج ۶ ص ۱۹۷ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۸

والئ کوفہ حضرت نعمان بن بشیرؓ کا انتباہ

مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے تو اُن کی آمد زیادہ دن مخفی نہیں رہ سکی۔ نہ اُن کی سرگرمیاں مخفی رہیں۔ جو وہ حضرت حسین کے واسطے لوگوں سے بیعت امامت لینے کے سلسلے میں کر رہے تھے، حضرت نعمان بن بشیرؓ جو انصار مدینہ میں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تھے، وہ حضرت معاویہ کے وقت سے کوفے کے گورنر چلے آرہے تھے۔ اُن کو اطلاع ملی تو مسجد میں لوگوں کو جمع کر دیا اور تقریر کی کہ :-

"اے لوگو فتنہ آرائی اور تفرقہ انگیزی میں مت پڑو۔ اس میں ناحق جانیں جاتی ہیں، خون بہتا ہے اور مال چھنتے ہیں۔ میری پالیسی اس معاملے میں سن لو کہ جب تک مجھ پر حملہ نہیں ہوگا میں کسی پر حملہ نہیں کروں گا۔ نہ تمہیں برا بھلا کہوں گا۔ نہ شبہے اور تہمت میں پکڑوں گا، لیکن تم نے اگر اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنایا، بیعت توڑی اور امام (یزید) کے خلاف کھڑے ہوئے تو قسم ہے خدائے پاک کی میں تم پر تلوار چلاؤں گا۔ جب تک بھی میرا ہاتھ اسکے قبضے پر رہے گا، چاہے تم میں سے کوئی بھی میرا ساتھ دینے والا نہو، ویسے مجھے امید یہ ہے کہ تم میں وہ لوگ زیادہ ہوں گے جو حق کا حق پہچانتے ہیں، بہ نسبت اُن لوگوں کے جو باطل کے لئے حق کا نام لیتے ہیں"[1]

یزید کو شکایت

عبداللہ بن مسلم حضرمی نامی ایک شخص جو بنی اُمیہ کے حلیفوں میں سے تھا اُس نے گورنر کی یہ تقریر سن کر کہا کہ یہ تو مناسب پالیسی نہیں ہے۔ یہ تو نہایت کمزور پالیسی ہے جو فتنہ انگیزوں کو شیر کردے گی۔ نعمان بن بشیر اسکے باوجود بھی اپنی اس پالیسی میں تبدیلی کرنے کو تیار نہ ہوئے۔

۱۔ تاریخ طبری ج ۶ ص ۱۹۹

بنی امیہ کے ہوا خواہ نے یہ صورت حال یزید کو لکھ کر بھیجی اور لکھا کہ اگر تمھیں کوفہ پر حکومت رکھنے کی ضرورت ہے تو فوراً کسی مضبوط آدمی کو یہاں بھیجو، نعمان کمزور آدمی ہیں یا دانستہ کمزوری دکھا رہے ہیں۔ اور بھی چند لوگوں نے اسی مضمون کے خط یزید کو لکھے۔

عبیداللہ بن زیاد کا تقرر

یزید نے اپنے اہلِ مشورہ کی رائے کے مطابق حضرت نعمان بن بشیر کی جگہ عبیداللہ بن زیاد کا تقرر کیا۔ اس سے پہلے وہ بصرہ کا حاکم تھا۔ اب بصرے کے ساتھ کوفہ کی حکومت بھی اس کے سپرد کی گئی۔ اور ہدایت دی گئی کہ فوراً پہنچ کر مسلم بن عقیل کی گرفتاری کا بندوبست کرے۔ وہ ایک جوان اور اپنے باپ کی طرح سخت گیر منتظم تھا۔ بصرے والوں کو دھمکا گیا کہ کوئی شخص کسی مخالفانہ حرکت کا مرتکب نہ ہو۔ وہ سیدھا کوفے پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی کہ :-

کوفے میں تقریر

"امیر المؤمنین نے تمھارے شہر اور اس کے متعلقات کا انتظام میرے سپرد کیا ہے۔ مجھے حکم دیا ہے کہ مظلوم کے ساتھ انصاف کروں محروم کو اس کا حق دوں اطاعت گزاروں کے ساتھ بھلائی کروں اور فتنہ پردازوں کے ساتھ سختی۔ اور سن لو کہ میں ٹھیک ٹھیک ان کے حکم کے مطابق کروں گا۔ نیکوکاروں کے لئے میں مہربان باپ کی طرح ہوں گا۔ اور فرمانبرداروں کے لئے ہمدرد بھائی۔ میری تلوار اور میرا کوڑا صرف اس کے لئے ہے جو میرے حکم کی خلاف ورزی کرے گا۔ بس ہر آدمی اپنا بھلا بُرا سمجھ لے"[1]

[1] الکامل فی التاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۲ مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۹۶۵ء

عملی کارروائی

اس تقریر کے بعد اُس نے تمام لوگوں اور بالخصوص قبائل کے ذمہ داروں (چودھریوں) کو حکم دیا کہ کسی کے ہاں کوئی پردیسی ٹھہرا ہوا ہو، امیرالمؤمنین کا اشتہاری مجرم ہو یا کوئی خارجی اور مخالفِ حکومت خیالات پھیلانے والا تو لازم ہے کہ ایسے لوگوں کے ناموں سے تحریری طور پر مطلع کیا جائے۔ جو کوئی ایسا کرے گا وہ ان لوگوں کے اعمال کی ذمہ داری سے بری ہو گا۔ جو ایسا نہ کرے وہ اس بات کی تحریری ذمہ داری دے کہ اُس کے حلقے اور اس کی جماعت سے حکومت کے خلاف کسی طرح کی کوئی شورش نہیں ہوگی جو کوئی ایسا نہیں کرے گا اُس سے ہم بری الذمہ ہوں گے اُس کا مال اور اُسکی جان حلال ہوگی جس عریف (چودھری) کے حلقے میں امیرالمؤمنین کی حکومت کا کوئی ایسا مطلوبہ مجرم پایا گیا جس کی رپورٹ نہیں کی گئی تو اُس عریف کے دروازے ہی پر اُسے پھانسی دی جائے گی۔ اُسکے حلقے کا وظیفہ ختم کردیا جائے گا اور عریف کو شہر بدری کی سزا دی جائے گی۔

مسلم کی تبدیلیٔ مکان

مسلم کوفہ پہنچے تھے تو مختار بن ابی عُبید کے گھر پر اُترے تھے۔ جب ابن زیاد کوفے پہنچا اور اُسکی یہ سخت آگاہی حضرت مسلم کے کان تک پہنچی تو آپ نے جائے قیام تبدیل کردی اور ہانی بن عُروہ نامی شخص کے مکان میں آگئے۔

ایک معمّہ

ہماری جو تاریخ کی کتابیں ہیں وہ صرف روایات اور بیانات کا مجموعہ ہیں۔ اِن روایات میں بہت سے پہلو ایسے آجاتے ہیں جن پر کچھ گفتگو یا توضیح و توجیہہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چیز اِن کتابوں میں کہیں مشکل ہی سے اور وہ بھی بس نام کو ملتی ہے مختار ابن ابی عبید

ہماری تاریخ کے اُس دور کا جس میں واقعۂ کربلا پیش آیا بڑا معروف نام اور ایک پُراسرار کردار ہے۔ یہ شخص واقعۂ کربلا کے پانچ سال بعد ایک بجلی کے کڑکے کی طرح مسلم خانہ جنگی کے میدان میں آیا۔ اور بس سال بھر میں ایک قیامت مچا کے گزر گیا۔ یہ خونِ حسین کے انتقام کے نام پر اُٹھا تھا۔ اور واقعی کُشتوں کے پُشتے لگا دیئے۔ ابن زیاد اور عمرو بن سعد وغیرہ تمام قاتلینِ حسین اسی کے حصے میں آئے۔ اور اس کا تعلق بھی کوفہ ہی سے تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر خیال ہوتا ہے کہ یہ مختار بن ابی عُبید جس کے گھر پر مسلم بن عقیل ٹھیرے تھے یہ وہی مختار تو نہیں ہے؟ لیکن پھر خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی مختار کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے تو حضرات حسنینؓ کے ساتھ بڑے ہی خراب کردار کا ثبوت دیا تھا جبکہ حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ جانشین ہوئے تھے، حضرت علی کی شہادت سے وقت پیش آئی جبکہ آپ نے حضرت امیر معاویہ سے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی ہوئی تھی۔ اس چالیس ہزار کی فوج کو لے کر جو حضرت علی نے تیار کی تھی حضرت حسنؓ روانہ ہوئے تو مدائن کے مقام پر پڑاؤ تھا کہ لشکر کے کچھ مُفسد حضرت حسن کے خیمے ہی پر ٹوٹ پڑے۔ لوٹ مار مچائی زخمی کر دیا۔ مدائن میں حضرت علی کی طرف سے حاکم اس مختار کے چچا سعد بن مسعود ثقفی تھے۔ یہ واقعہ پیش آنے کے بعد حضرت حسن مدائن میں اُن کی قیام گاہ پر آگئے تو جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے۔ مختار نے خالص "کوفی" روایت کے مطابق چچا سے کہا کہ "چچا اگر دولت اور عزت کی ضرورت ہو تو انھیں باندھو اور معاویہ کے پاس پہنچا دو"۔ چچا شریف تھے، انھوں نے کہا کہ تجھ پر خدا کی لعنت۔ ابنِ بنت رسول اللہ کے ساتھ میں یہ حرکت کروں گا؟[1]

ایک اور معمہ

اس قصے کے علاوہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جن لوگوں نے حضرت حسین کو خطوط

---

[1] طبری ج ۶ ص ۹۲

بھیجے تھے، جن کے نتیجے میں مسلم بن عقیل بھیجے گئے، انکے ناموں میں کوئی نام مختار ابن ابی عبید نہیں ہے۔ قاعدے سے تو مسلم کا قیام اُنہی لوگوں میں سے کسی کے گھر ہونا چاہئے تھا[1] اور پھر اسی طرح ہانی بن عروہ کا نام بھی اُن ناموں میں نہیں ہے۔ تو مختار کے گھر سے منتقل ہوئے تب بھی ایک اُسی جیسے کے گھر پہنچے، یہ آخر قصہ کیا ہے؟ اُن آٹھ دس آدمیوں میں سے کسی کے گھر میں کیوں جگہ نہیں تھی جنھوں نے دعوتی خطوط لکھے تھے۔؟

مزید برآں

اور پھر بات اتنی ہی نہیں، ہانی ابن عروہ کے گھر وہ بالکل تن تنہا اور ایک قطعی ناخواندہ مہمان کی طرح پہنچتے ہیں۔ ابن جریر (طبری) ہوں یا ابن اثیر یا ابن خلدون سبھی لکھتے ہیں کہ:۔

"مسلم کے کان تک جب ابن زیاد کی تقریر پہنچی تو وہ مختار کے مکان سے نکل کر ہانی بن عروہ کے گھر پہنچے، ہانی نکل کر آئے اور مسلم کو دروازے پر دیکھ تو بڑا بُرا منہ بنایا۔ مسلم نے کہا بھائی میں تمہارے پاس پناہ کیلئے آیا ہوں۔ تمہارا مہمان ہونا چاہتا ہوں۔ ہانی نے جواب دیا "تم نے تو مجھے بڑی ہی مصیبت میں ڈال دیا ہے، اگر میرے احاطے کے اندر نہ آگئے ہوتے تو میں کہتا کہ مجھے معاف کرو لیکن اب تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آجاؤ۔"[2]

مسلم بن عقیل جیسا معزز مہمان، جو حضرت حسینؓ کا قاصد ہی نہیں اُن کا بھائی بھی ہے جس کے آتے ہی شیعان علیؓ و حسینؓ کی سرگرم آمد و رفت اسکے پاس شروع ہو گئی تھی، اٹھارہ ہزار آدمی اُس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ وہ ابن زیاد کی دھمکی سن کر اختیاطاً اپنی جائے قیام

---

[1] ایک دوسری روایت ... یہ بھی ملی ہے کہ ان کا قیام مسلم بن عوسجہ کے یہاں ہوا تھا۔ طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۴ مگر روایت مختار ہی ہے کہ قیام مختار کے یہاں فرمایا۔ "شہید انسانیت" کے مصنف جناب علی نقی صاحب نے بھی اسی روایت کو اختیار فرمایا ہے۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۰۳، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۶۹ دار الفکر بیروت۔

بدلنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس فیصلے میں کوئی مقامی آدمی اُس کا شریک تک نہیں نظر آتا، ایک غریب الدّیار بے یار و مددگار کی طرح خود ہی منہ اُٹھا کر کہیں کو چلدیتا ہے اور ایسے ناروا سلوک سے دوچار ہوتا ہے!

یہ چند در چند سوالات ہیں جن کا کوئی جواب ہمیں اپنی ان تاریخی کتابوں میں نہیں ملتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان روایات کی صحت میں شبہ کریں، ان روایتوں کا تعلق کسی ایسی بات سے نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی راوی کے متعلق جھوٹ کا گمان کیا جائے۔ البتہ یہ خیال ہوتا ہے کہ مختار کے گھر سے اُن کا بے یار و مددگار حال میں ہانی کے گھر پہنچنا اور ہانی کے یہاں "ایک آفت و مصیبت" کہہ کر اُن کا استقبال کیا جانا۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی اس کے لئے کافی تھی کہ کوفیوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جاتا کہ یہ ہرگز ہرگز قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ اور اسی وقت کوفے سے نکل جانے کی کوئی تدبیر سوچی جاتی یا کم از کم حضرت حسین کو یہ صورت حال بتا دینے کی سعی کی جاتی جن کو اس سے پہلے بالکل مختلف صورت حال کی اطلاع کی جا چکی تھی۔

لیکن قضا و قدر کے فیصلے کون بدل سکتا ہے؟ جناب مسلم نے اِن حالات میں بھی ہانی بن عروہ کے گھر میں پناہ گیری ہی قبول نہیں کر لی بلکہ بظاہر اپنے مشن کے بارے میں بھی انکی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ حضرت حسین کو خط بھیج چکے تھے کہ فوراً آجائیے۔ یہاں حالات بالکل سازگار ہیں، بس آپ کے آنے کی دیر ہے۔ اپنی اس رائے میں تبدیلی انھوں نے اس وقت کی جب کہ وہ دشمن کے پنجے میں گرفتار ہو گئے۔[1] اور یہ ٹھیک وہ دن تھا جس دن حضرت حسین ان کے خط پر مکّہ سے روانہ ہو رہے تھے یعنی ۸ ذی الحجہ ۶۰ھ جو تاریخی روایتوں میں مکہ سے حضرت حسین کی کوفے کو روانگی کا دن بتایا گیا ہے۔[2]

---

[1] طبری ج ۶ ص۲۱۱ [2] ایضاً۔

جنابِ مسلم کا انجام

کوفے کے ایسے ناوفادار اور طوطا چشم ماحول میں عبید اللہ بن زیاد جیسا چست چالاک اور سخت گیر منتظم پہنچ جائے تو مسلم بن عقیل جیسے ایک سادہ مزاج پردیسی اور اجنبی کی کہاں خیر۔ اس نے ان کا پتہ نکال لیا کہ ہانی بن عروہ کے گھر پر مقیم ہیں۔ ہانی کے والد عُروہ پر عبید اللہ کے والد زیاد کا بڑا احسان تھا۔ زیاد نے ۵۰ھ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کے بعد کوفے کی گورنری سنبھالی تھی تو حضرت علی کے حامی سرداروں کو سختی سے دبایا تھا لیکن عُروہ کو جانے کیوں اُس نے اپنے احسان و کرم کا نشانہ بنایا[۱]۔ عروہ کے بیٹے ہانی کے ساتھ بھی اُس نے یہی معاملہ رکھا اور اُسی کے مطابق اپنے باپ کے بعد ابن زیاد نے معاملات رکھے۔ اس لئے اُسکو اس انکشاف سے بڑی چوٹ لگی کہ مسلم جو اسکے آقا یزید بن معاویہ کا تختہ الٹنے کی مہم پر آئے ہیں۔ ہانی کے گھر میں مقیم ہیں۔ اور وہی گھر انکی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اُس نے ہانی کو بلوایا جو بڑی مشکل سے آنے کو تیار ہوئے۔ انکو دراصل ابن زیاد کے کوفہ پہنچنے پر اور بحیثیت گورنر پہنچنے پر از خود ہی اسکے پاس آنا چاہئے تھا لیکن جناب مسلم کے قیام کی شرم ہی بظاہر دامن گیر تھی جو وہ ملنے نہیں آئے۔ اس چیز سے ابن زیاد کو اس اطلاع پر اور زیادہ بھروسہ ہوا ہوگا کہ مسلم بن عقیل ہانی کے گھر پر مقیم ہیں اور وہیں سے حضرت حسین کی خدمت کیلئے بیعت کا سلسلہ چلایا جا رہا ہے۔ اور اسی سے اس روایت کو تقویت ملتی ہے جس میں بتایا گیا کہ جناب مسلم جب مختار کے گھر سے نکل کر ہانی کے گھر پناہ لینے پہنچے تو ہانی انکو دیکھ کر اتنے پریشان ہوئے کہ اپنی پریشانی بے حجابانہ ظاہر کر ڈالی و عربوں کی روایتِ مہمان نوازی بھی بھلا بیٹھے۔

بہر حال ہانی کسی طرح آئے تو ابن زیاد نے بہت ہی آڑے ہاتھوں لیا اور اپنے باپ کے احسانات یاد دلا کر کہا کہ تمھارے گھر میں امیر المؤمنین کی حکومت و جماعۃ المسلمین کے امن و امان کے خلاف فتنہ و فساد کی یہ کھچڑی؟ ہانی نے انکار کرنا چاہا مگر نہ چلا تو ایک بہر انھوں نے وہی کمزوری دکھائی جو جناب مسلم کو پناہ دینے پر پا کر دکھائی تھی۔ کہا کہ واللہ میرا یقین کرو، میں انکو اپنے گھر نہیں لایا تھا

---

[۱] اسی سلوک کے سبب دوسرا نام حجر بن عدی کا بھی عروہ کے نام بتایا گیا ہے جن کا قصہ بعد میں کچھ اور ہوا۔

ہاں وہ میرے دروازے پر آ کھڑے ہوئے تو میں انھیں دُھتکار نہ سکا تم مجھے موقع دو میں ابھی جا کر انھیں رخصت کرتا ہوں کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ ابن زیاد نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ تم اس کام کے لئے جا سکتے ہو کہ انھیں میرے پاس لے کر آؤ۔

شکر ہے کہ ہانی کو اس مرحلہ پر اپنے مہمان اور پناہ گیر کا حق یاد آ گیا اور وہ ابن زیاد کی یہ فرمائش پوری کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ نتیجۃً اُنکے ساتھ سختی کا معاملہ ہوا۔ اور اسکی خبر کچھ مبالغہ کے ساتھ جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے، ہانی کے گھر پہنچی تو عورتوں کی آہ و فغاں نے مسلم بن عقیل کو مجبور کیا کہ وہ اپنے محسن کو ابن زیاد کے پنجے سے نکالنے کی تدبیر کریں۔ اُنکی سمجھ میں جو تدبیر آئی وہ یہ تھی کہ جن لوگوں سے انھوں نے حضرت حسین کیلئے جاں نثاری کی بیعت لی تھی جن کی تعداد عام طور پر اٹھارہ ہزار بتائی گئی ہے، انکی طلبی کیلئے مقررہ نعرہ — یا شعار — بلند کریں اور انہیں لیکر دارالامارۃ — گورنر ہاؤس — پر حملہ کر دیں۔ اس نعرہ پر عام روایتوں کے مطابق چار ہزار آدمی اُسی وقت جمع ہو گئے۔ اور جناب مسلم کی سرکردگی میں دارالامارہ پر جا پہنچے۔

حملے کی پسپائی اور مسلم بن عقیل کی بے کسی

مگر یہ چار ہزار بہرحال کوفی ہی تھے، ابن زیاد نے صرف حسن تدبیر سے یہ ساری جمعیت منتشر کر دی سرداران قبائل جو خواستہ یا ناخواستہ گورنر کے دباؤ میں رہتے تھے کچھ اس "فوج" کے سامنے آ گئے کہ خود سمجھائیں، کچھ اپنے قبیلوں میں چلے گئے کہ ان لوگوں کی ماؤں بہنوں کو باہر بھیجیں جو انھیں سمجھا کر لے جائیں۔ بہرحال تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹ گئی۔ اور جو کچھ رہ گئے تھے وہ بھی رات کے اندھیرے میں اتفاقیہ کے ساتھ کم ہوتے ہوتے جناب مسلم کو بالکل ہی اکیلا چھوڑ گئے کہ وہ خود ہی اپنے لئے جو کچھ کر سکتے ہوں کریں۔ رات کو تو روایت کے مطابق کہیں پناہ مل گئی مگر دن کا اجالا ہونے پر اُن کا پتہ نشان ابن زیاد تک پہنچ گیا اور اُس نے اُنھیں ایک فتنہ جو اور مُفسد قرار دے کر سر قلم کرا دیا اور پھر یہی انجام ہانی بن عروہ کا بھی کرایا۔ یہ واقعہ ۹ ذی الحجہ کا بتایا گیا ہے۔

لہ جناب مسلم اور ہانی کا یہ پورا قصہ کچھ اور زیادہ تفصیلات کے ساتھ طبری ج ۶ میں ۲۰۵ سے ۲۱۲ تک بیان ہوا ہے

باب نہم ۹

قافلۂ حسین اپنی آخری منزل کی طرف

مسلم بن عقیل جب ۸ ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ کی صبح گرفتار کئے گئے تو جو صاحب ان کی گرفتاری کیلئے فورس (FORCE) لے کر آئے تھے[۱] یہ محمد بن اشعث کہلاتے تھے۔ اور یہ جناب مسلم کے گھرانے کیلئے اجنبی نہ تھے، ان کے والد اشعث بن قیس حضرت علی کے بہت نمایاں ساتھیوں میں تھے، لیکن جنگ صفّین کی خونریزی دیکھ کر حضرت علی کے بہت سے ساتھیوں میں جو ایک برگشتگی آئی یہ اس میں بہت نمایاں ہوئے، اور تحکیم کیلئے حضرت علی کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی نامزدگی زیادہ تر انہی کے دباؤ کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ حضرت ابو موسیٰ کے بارے میں یہ یقینی تھا کہ وہ ہر قیمت پر آئندہ جنگ کا سدِّباب ہی کریں گے۔ یہ محمد بن اشعث اُس مجلس خواص کے شرکاء میں بتائے گئے ہیں جو مسلم بن عقیل کی کوفے میں آمد پر دارِ مختار میں پہلے دن ہوئی، لیکن ان کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جبکہ اور شرکاء تن من دھن سے جناب مسلم کے مشن میں تعاون کی پرجوش یقین دہانی کر رہے تھے یہ بالکل خاموش رہے تھے، اور پوچھے جانے پر کہا تھا کہ میں دل سے آپ لوگوں کی تمناؤں میں شریک ہوں مگر قتل و قتال کا معاملہ ہو تو اس میں شرکت کا روادار نہیں۔[۲]

بہر حال جب ابن زیاد کے صریح اور محکم عزم کے آگے وہ لوگ بھی اپنا قبلہ بدلنے پر مجبور ہو گئے جنھوں نے حضرت حسین کو کوفے کی دعوت بھیجی تھی[۳] تو محمد بن اشعث تو پہلے ہی کنارے پر کھڑے تھے۔ انھیں حکم ہوا تو مسلم بن عقیل کی گرفتاری کا فریضہ طوعاً یا کرہاً انھیں ادا کرنا

---

[۱] مشہور روایت کے مطابق اس گرفتاری کے لئے بڑی فورس بھیجی گئی تھی اور بڑا معرکہ ہوا، مگر طبری کی ص ۲۲۱ کی ایک روایت کے مطابق ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ [۲] طبری ج ۶ ص ۱۹۹

[۳] شبث ابن ربعی اور حجار بن ابجر عجلی۔ ملاحظہ ہو طبری ج ۶ ص ۱۹۷ و ص ۲۰۸۔

کیوں کچھ زیادہ مشکل ہوتا؟

روایت میں ہے کہ گرفتاری کے بعد بے جائے جا رہے تھے تو رونے لگے، محمد بن اشعث کو تعجب ہوا کہ اتنے بڑے مشن کا آدمی روئے دے رہا ہے! جواب دیا کہ رونا اپنے لئے نہیں ہے حسین اور اُن کے قافلے کیلئے ہے جو آج ہی میرے خط کی بنا پر مکے سے چل رہا ہوگا۔ تم اگر احسان کر سکو تو اتنا کر دینا کہ انھیں میرے واقعہ کی اطلاع کرا دو تاکہ وہ اب ادھر کا ارادہ ختم کر دیں۔ روایت کے مطابق محمد بن اشعث نے اس کا وعدہ کر لیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس پیغام کو پہنچنے میں تو ابھی کافی وقت لگنا تھا۔[1]

حج سے ایک دن پہلے روانگی

سیدنا حسین جیسا کہ قرائن کی روشنی میں بظاہر کوفے ہی کا خیال لے کر مدینے سے نکلے تھے۔ وسط رمضان میں مسلم بن عقیل (چچیرے بھائی) کو کوفہ بھیجنے کے بعد منتظر تھے کہ وہاں سے مناسب حالات کی خبر آئے تو اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں تا آنکہ ذوالقعدہ میں یہ خبر آ گئی۔[2] آپ نے تیاری کی اور ٹھیک حج سے ایک دن پہلے یعنی ۸ ذی الحجہ کو جو کہ "یوم الترویہ" کہلاتا ہے۔ اور حجاج کے قافلے اس دن مکے سے منیٰ کو روانہ ہوتے ہیں۔ آپ

---

[1] یہ خط حضرت حسین کو رستے میں آخر ذی الحجہ یا شروع محرم میں ملا جبکہ کوفہ قریب آ رہا تھا۔

[2] اس خط کے پہنچنے کی [illegible] تاریخ بتانے والا کوئی بیان ہماری نظر سے سوائے البدایہ والنہایہ کے نہیں گزرا ۸ [illegible] وکان [illegible] قتل [illegible] قبل ان یقتل بسبع وعشرین لیلۃ لیکن [illegible] قتل سے ستائیس دن پہلے پہنچنے کی بات کہی جا رہی ہے۔ ورنہ بر عبارت قتل سے قتل [illegible] ۳ ذی الحجہ کو [illegible] روانگی کی روایت ۸ ذی الحجہ کی ہے اور [illegible] روانگی ہوئی تھی۔ البتہ قتل سے قتل مسلم والے [illegible] تو کسی درجہ میں بات بن جائے گی۔

اپنے قافلے کے ساتھ کوفے کی سمت میں روانہ ہو گئے۔ اور جیسا کہ ابھی گزرا یہ وہی دن تھا جب کوفے میں مسلم بن عقیل اہلِ کوفہ کی روایتی غداری کا شکار ہو کر ابن زیاد کے ہاتھوں گرفتار ہو رہے تھے۔

خیر خواہ ایک بار پھر روکتے ہیں

حضرت محمد بن حنفیہ، عبداللہ بن مطیع اور عبداللہ بن عمر کی کوشش کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ ہر ایک نے کوفے کے ارادے سے باز رہنے کی ہر ممکن فہمائش اور درخواست کی مگر جیسے کہ تقدیرِ الٰہی میں ایک بات طے ہو چکی ہو کسی کی بات مؤثر نہ ہوئی۔ آپ نے اہلِ کوفہ کی دعوت کو مشروط طور سے قبول کر کے مسلم بن عقیل کو حالت کی تصدیق کے لئے وہاں بھیجا۔ اور اُن کی تصدیق آتے ہی روانگی کا عزم کر لیا۔ اس عزم کی اطلاع دوسرے لوگوں کو کس طرح ہوئی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ شاید سفر کی تیاریاں اور کچھ دوسری علامات قرینہ بن گئیں۔

۱ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

حضرت عبداللہ بن عباس بزرگ خاندان تھے۔ اُنھیں کے آبائی مکان میں آپ ٹھیرے ہوئے بھی تھے۔ اُنھیں ارادۂ سفر کی اطلاع نہ ہونے کا سوال ہی کیا۔ علاوہ ازیں ایک روایت یہ بھی ہے کہ یزید نے حضرت حسین کے مکّہ آجانے پر حضرت ابن عباس کو بزرگ خاندان کی حیثیت سے لکھا بھی تھا کہ آپ اُنھیں سمجھائیں کہ وہ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ مناسب نہیں ہے۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۸ میں صفحہ ۱۶۴ پر اس خط کا اور اس کے جواب کا تذکرہ خاصے مضمون کے ساتھ ہے[1]۔ جواب کا خلاصہ یہ دیا گیا ہے کہ:۔

---

[1] دونوں کا تفصیلی متن "حیاۃ الامام حسین بن علی" از باقر شریف القرشی جلد ثانی میں ہمارے سامنے ہے۔

اِنّی لارجوان لایکون خروج	مجھے امید ہے کہ حسین کا (مدینے سے)
الحسین لامرٍ تکرھہ ولست	نکلنا کسی ایسی بات کے قصد سے نہیں
اَدع النصیحۃ لہٗ فی کل ماتجتمع	ہوگا جو تمہارے لئے باعث تکلیف ہو لو
بہ الاُلفۃ وتطفی بہ النائرۃ۔	میں (پھر بھی) کوئی دقیقہ انھیں اس بات
	کے سمجھانے میں نہیں چھوڑوں گا جس سے
	ہم لوگوں کی اُلفت باہمی برقرار رہے
	اور فتنہ دبے۔[1]

اس خلاصۂ جواب کے بعد بتایا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس حضرت حسین کے پاس آئے اور بڑی دیر تک گفتگو کی جس میں آپ نے کہا کہ "خدا کیلئے عراق کا ارادہ نہ کرو اور اپنی جان کھونے کو وہاں نہ جاؤ۔ اور نہیں تو کم از کم اتنی بات مانو کہ موسم حج گزر جانے دو۔ حج میں آنے والے لوگوں سے مل کر وہاں کے حالات کا اندازہ کرو۔ اور پھر جو کرو جو کچھ طے کرنا ہو۔"[2] اسکے آگے کا جملہ ہے کہ "یہ واقعہ عشرۂ ذی الحجہ کا ہے"۔

حضرت ابن عباس کی مذکورہ گفتگو کو اگر ہم یزید کی اور آپ کی خط وکتابت کا نتیجہ سمجھیں، جیسا کہ البدایہ کے طرز تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یزید نے حضرت ابن عباس کو بالکل آخری مرحلے میں لکھا جبکہ ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہوچکا تھا اور حضرت حسین روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یہ گفتگو گرچہ البدایہ والنہایہ میں اس طرح درج کی گئی ہے جیسے اوپر کی خط وکتابت کا نتیجہ ہو۔ لیکن واقعہ میں یہ گفتگو اس سے الگ بالکل آخری مرحلے کی ہو جبکہ یزید کا خط بظاہر اس مرحلے میں آیا ہوگا جب حضرت حسین کے مکے آنے کے بعد وہاں کوفیوں کی آمد شروع ہوئی اور مسلم بن عقیل کوفے پہنچ گئے۔ ہمارے نزدیک قرین قیاس یہی بات ہے۔ ہوسکتا ہے اس وقت

---

[1] اس جواب ہی سے یزید کے خط اور اس کی سپرٹ کا اندازہ بھی ہوجاتا ہے یعنی یہ کہ ... خود اس کا [illegible] [2] بدترین وقت

جو گفتگو حضرت ابن عباس اور حضرت حسین کے درمیان ہوئی ہو۔ وہ ریکارڈ میں نہ آئی ہو۔ البتہ جب حضرت حسین کوفے کے قصد پر مُصر رہ کر پابہ رکابی کے مرحلے میں داخل ہو گئے ہوں تب حضرت ابن عباس نے ایک بار پھر اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی ہو اور وہ روایت ہو کر ابن کثیر تک پہنچی ہو۔ بہر حال آگے روایت کا بیان یہ ہے کہ حضرت حسین نے حضرت ابن عباس کا مشورہ قبول نہیں فرمایا۔ "فابی الحسین الآن یمضی الی العراق"۔ (حسین عراق جانے کے ارادے پر مُصر ہی رہے)۔ فقال لہ ابن عباس اس پر حضرت ابن عباس نے اُن سے فرمایا:

واللہ انی لاظنک ستقتل	واللہ مجھے لگتا ہے کہ تم کل اپنی عورتوں
غداً بین نسائک وبناتک	اور بیٹیوں کے درمیان اُسی طرح قتل
کما قتل عثمان بین نسائہ	کئے جاؤ جیسے عثمان اپنی عورتوں اور
وبناتہ واللہ انی لاخاف	بیٹیوں کے درمیان قتل ہوئے تھے۔
ان تکون انت الذی یقاد بہ	واللہ مجھے تو یہ بھی خوف ہے کہ تم قصاص
عثمان فانا للہ وانا الیہ	عثمان میں قتل کئے جانے والے بنو بس (تم
راجعون۔	نہیں مانتے تو) انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لیکن حضرت حسین کے لئے یہ مکرر تفہیم بھی کچھ مؤثر نہ ہو سکی۔ بلکہ جیسا کہ آگے روایت میں ہے آپ نے اس انداز تفہیم پر ایک گونہ ناگواری کا اظہار فرمایا۔

۲۔ ابو بکر[1] بن عبد الرحمن :۔ یہ مدینے کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے تھے، ان کے والد عبد الرحمن بن الحرث بن الہشام بن المغیرہ المخزومی القرشی خود بڑے صاحب فضائل تھے۔ غالباً حج کو آئے ہوئے تھے کہ حضرت حسین کے قصد کوفہ کا چرچا سنا تو از راہ خلوص و محبت حاضر خدمت ہوئے۔ اور حسب روایت طبری ج ۶ ص ۲۱۶ میں عرض کیا کہ:۔

---

[1] ان کا نام مؤرخ مسعودی کے ماسوا دو لوگوں نے عمر بن عبد الرحمن نے لکھا ہے۔ مگر صحیح نام ابو بکر ہی معلوم ہوتا ہے۔ جس سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو، اصابہ ابن حجر ج ۵ ص ۶۶۔

"آپ ایک ایسے ملک کا ارادہ فرما رہے ہیں جو خالی نہیں پڑا ہوا ہے بلکہ وہاں اسکے امراء و حکام موجود ہیں۔ جن کے ہاتھ میں خزانے ہیں، اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ روپے پیسے کے بندے ہیں۔ بس وہی لوگ جنھوں نے آپ کی مدد کا وعدہ کیا ہے وہ آپ کے خلاف لڑنے کو آجائیں گے" الخ

مسعودی کی روایت میں اُن کا پیرائیہ بیان کچھ اور زیادہ مؤثر ہے۔ فرمایا کہ:-

"دیکھیۓ آپ کے والد ماجد آپ سے زیادہ حوصلہ اور طاقت رکھتے تھے۔ لوگ ان کی بات سننے بھی زیادہ تھے، اہل شام کو چھوڑ کر باقی سب اُن کی شخصیت پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان کو لے کر معاویہ کے مقابلے پر چلے۔ معاویہ کی اُن کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہ تھی۔ مگر پھر بھی لوگ دنیا اور دنیوی زندگی کی محبت میں اُن کا حق بھول گئے۔ انھیں خون رُلایا حتیٰ کہ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے پھر جو کچھ ان لوگوں نے آپ کے بھائی کے ساتھ کیا وہ سب بھی آپ جانتے ہیں۔ اور پھر ان ہی غدّاروں کا بھروسہ کر کے آپ اُن لوگوں سے لڑنے جا رہے ہیں جو آپ کے مقابلے میں زیادہ قوی اور تیار ہیں۔ لوگ اُن سے امیدیں بھی زیادہ کر سکتے ہیں اور ڈرتے بھی زیادہ ہیں"[1]

۳۔ کئی اور مخلصین :- اسی طرح اور کئی نام آتے ہیں جن کا تعلق مخلصین کے زمرے سے تھا کہ انھوں نے یا اس عنوان سے کوفے کے قصد کی مخالفت کی کہ کوفی بالکل ناقابلِ اعتبار ہیں اور حالات ناسازگار، یا اس عنوان سے کی کہ اس خروج کا کوئی جواز نہیں ہے ابن کثیر نے یک ہی جگہ یہ نام اور اُن کے اقوال جمع کر دیئے ہیں[2] حضرت ابوسعید الخدری۔ جابر بن عبداللہ۔ ابوواقد لیثی اور مسور بن مخرمہ جو سب اصحاب رسول صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ..... سب مخلصین حضرت علی ہی سے تھے۔ حضرت ابوسعید خدری کے متعلق ہو گیا ہے

---

[1] مروج الذہب (دار اندلس، بیروت)، جلد ۳ صفحہ ۵۶ [2] البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۱۶۳

آپ نے فرمایا:۔

"اپنی جان کے بارے میں اللہ سے ڈریئے۔ اپنے گھر ہی میں رہیئے اور اپنے امام پر خروج مت کیجئے۔"

حضرت جابر ابن عبداللہؓ نے فرمایا:۔

"اللہ سے ڈریئے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مت ٹکرایئے......"

ابو واقد اللیثیؓ نے فرمایا کہ:۔

"آپ کا خروج بجا نہیں ہے آپ صرف اپنی جان دینے جا رہے ہیں۔ اس سے باز رہیئے۔"

مسور بن مخرمہؓ نے لکھا کہ:۔

"اہل عراق کے خطوط سے دھوکے میں نہ آیئے اور نہ ابن زبیر کے اس قول سے کہ وہ لوگ آپ کی مدد کریں گے۔"

لیکن سب ہی کی خواہشیں، منتیں اور دلیلیں ناکام ہوگئیں۔ اور حضرت حسینؓ ۸ ذی الحجہ کو دوپہر کے وقت جبکہ حجاج منیٰ کیلئے روانہ ہوئے عمرہ کے ارکان ادا کر کے کوفے کی سمت روانہ ہوگئے[1] گویا آپ نے احرام باندھا ہوا تھا اور وہ احرام حج کا نہیں عمرے کا تھا۔

عبداللہ بن جعفر کی سعی

حضرت کے عم زاد عبداللہ بن جعفر حجاز کی بڑی اہم شخصیت تھے۔ عم زاد ہونے کے علاوہ حضرت کی ہمشیرہ حضرت زینب کبریٰ کے شوہر بھی تھے۔ قیام مدینے میں رہتا تھا غالباً حج کیلئے آئے ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت حسینؓ کی روانگی سے پہلے اُن کی کسی مداخلت کا ذکر کیوں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے حضرت حسینؓ کے اس رُخ سے جو وہ یزید کے سلسلے میں اختیار کر رہے تھے ناخوش ہوں، کیونکہ وہ حضرت معاویہ کے زمانہ سے اس خاندان کے ساتھ بہتر تعلقات رکھتے آئے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس کا معاملہ تھا۔ او عمر میں حضرت حسینؓ سے بڑے بھی تھے، بہرحال جو بھی وجہ ہو۔ روایت ہے کہ ان کو

---

[1] طبری ج ۲ صہ ۲۱۷

اطلاع ملی کہ حسین روانہ ہو گئے تو وہ اپنے دو بیٹوں کو حضرت حسین کے تعاقب میں روانہ کر کے کہ ذرا آگے بڑھ کر اُن سے کہو کہ اول تو لوٹ آئیں ورنہ کم از کم ذرا سا ٹھہریں میں آرہا ہوں، اور یہ کہہ کر وہ خود سیدھے والئ حرمین عمرو بن سعید کے پاس گئے کہ دیکھو حسین چلے گئے ہیں تم مجھے ایک خط اُن کیلئے لکھ کر دو کہ وہ لوٹ آئیں اور تم اُن کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی سے پیش آؤ گے کسی طرح کی کارروائی اُن کے خلاف نہیں ہو گی۔ روایت کہتی ہے کہ عمرو نے عبداللہ بن جعفر سے کہا تم خود خط لکھ لو اور مجھ سے دستخط کرا لو چنانچہ یہی ہوا۔ پھر ابن جعفر نے کہا کہ مزید اطمینان کیلئے اپنے بھائی یحییٰ کو میرے ساتھ کر دو اور یہ خط تمھاری طرف سے وہی حسین کو دیں گے۔ چنانچہ یہ بھی ہوا۔ یہ دونوں صاحبان حضرت حسین کے پاس پہنچے۔ مگر دوسرے تمام لوگوں کی طرح ناکام ہی رہے[1]۔

والئ حرمین کی طرف سے بجبر روکے جانے کی روایت

عبداللہ بن جعفر اور والئ حرمین عمرو بن سعید کے بارے میں جو روایت ابھی مذکور ہوئی اُسکی روشنی میں طبری ہی کی یہ دوسری روایت کسی طرح قابلِ اعتبار نظر نہیں آتی کہ جیسے ہی قافلہ مکے سے نکلا حاکم مکہ عمرو بن سعید کے فرستادے یحییٰ بن سعید کی قیادت میں ان کا راستہ روکنے اور بجبر مکہ واپس لانے کیلئے پہنچے۔ مگر یہ لوگ کامیاب نہیں ہو سکے۔ تھوڑی سی زور آزمائی اور مار پیٹ کے بعد یہ فرستادے نامراد لوٹنے پر مجبور ہوئے[2] ـــــ دونوں روایتوں میں اتنا تضاد ہے کہ کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ دونوں بیک وقت نہیں ہو سکتیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ روایت ماقبل میں مذکور واقعہ ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور کچھ نہیں۔ ویسے بھی کیا تُک تھی کہ جس حاکم نے سوا چار مہینے حضرت حسین سے بیٹ کر نہیں پوچھا کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ جبکہ اُسے معلوم تھا کہ آپ نے مدینہ کیوں چھوڑا ہے۔

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۹-۲۲۰ [2] ایضاً صفحہ ۲۱۶-۲۱۷

رمضان تک تو وہ خالی حاکم مکہ ہی تھا۔ رمضان میں مدینے کی حکومت بھی اس کے سپرد کردی گئی تھی۔ اور اس سپردگی کے ساتھ ہی اس نے عبداللہ بن زبیر کے خلاف ــــــ جو حضرت حسین ہی کے ساتھ مکے میں آئے تھے ــــ گرفتاری کی کارروائی بھی شروع کردی تھی۔[1] اسکے برخلاف کوئی ایک روایت نہیں ملتی کہ اُس نے حضرت حسین کو چھیڑا ہو، اُن کے معاملات میں کسی طرح کا دخل دیا ہو۔ حالانکہ اہلِ کوفہ کے وفود اُن کے پاس آرہے تھے۔ اُن کے فرستادے کوفے جارہے تھے۔ وہ سفر کی تیاریاں کررہے تھے۔ تقریباً اسی نوّے آدمیوں کا قافلہ جانے کو تھا۔ اسکی تیاریاں دو چار دن پہلے سے تو بالکل صاف نظر آنے ہی لگی ہوں گی۔ اب اس تمام مدت میں تو حاکم مکہ اُن سے تعرض نہیں کرتا۔ مگر جب وہ مکہ سے نکل جاتے ہیں تو اُن کی پکڑ کو آدمی دوڑاتا ہے۔ کوئی تک کی بات تو ہے نہیں۔

اس روایت کا ایک دوسرا جزو بجائے خود اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ حاکم مکہ کی طرف سے تعاقب کی کہانی درست نہیں ہے۔ وہ دوسرا جزو یہ ہے کہ قافلہ حاکم مکہ کے فرستادوں کو پسپا کرکے آگے بڑھا تو ایک قافلہ ملا جو یمن سے (سالانہ معمول کے مطابق) دار الخلافہ دمشق کیلئے بہت سے قیمتی سامان لئے جارہا تھا۔ حضرت حسین نے اُس پر قبضہ کرلیا۔ اور شتربانوں سے کہا کہ تم میں سے جو چاہے یہاں سے لوٹ جائے اور جو چاہے ہمارے ساتھ کوفے تک چلے ہم اس کو معاوضہ دیں گے ــــ ہمارا خیال یہ ہے کہ روایت کے دونوں جزوں میں سے کوئی ایک ہی ٹھیک ہوسکتا ہے۔ ورنہ کیسے یہ بات قابلِ تصور ہے کہ ابھی حاکم مکہ کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا تھا (جس کے بعد پورا اندیشہ ہونا چاہئے تھا کہ شاید وہ مزید کمک لے کے آتے ہوں) اور ابھی ایک ایسا کام کیا جاتا رکا؟ یعنی سرکاری قافلہ لوٹنا) کہ پسپا شدہ لوگ کسی کمک کے ساتھ دوبارہ نہ بھی آتے ہوں تو اس نئے واقعہ کے بعد حاکم پر بالکل فرض ہو جائے کہ وہ سرکاری مال کی بازیابی اور شتربانوں کی

---

[1] ایضاً ص ۱۹۳-۱۹۲

امداد کیلئے کوئی مؤثر کارروائی کرے۔ اور جب روایت میں یہ بھی ہے کہ جن شتربانوں نے آگے جانا قبول نہیں کیا اُن کا وہیں حساب کر دیا گیا[1]۔ تب تو حاکم مکہ کو واقعہ کی فوری خبر ہونے کا بھی سامان ہو گیا تھا۔ اور کسی کارروائی کا اندیشہ نہ ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ بہرحال روایت کے دونوں اجزاء میں سے ایک ضرور غلط ہے، اور اس صورت حال کے نتیجہ میں یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ دونوں ہی غلط ہوں[2]۔

نوٹ کرنے کی بات

بہرحال نہ صرف یہ کہ جبر و اکراہ والی یہ روایت کسی طرح قابل قبول نظر نہیں آتی، بلکہ یہ بات بھی نوٹ کی جانی چاہیئے کہ جس طرح حاکم مدینہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے حضرت حسین کے ساتھ قاعدہ و قانون کے بجائے لحاظ و احترام کا معاملہ کیا۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے برخلاف اُن کو بالکل اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ نیز حاکم مکہ — اور بعد میں حاکم حرمین — عمرو بن سعید بن العاص — المعروف بہ الاشدق نے آپ کے ساتھ یہی معاملہ رکھا۔ کوئی تعرض آپ کے معاملات میں نہیں کیا۔ اور کیا تو وہ بھلائی کا معاملہ کیا جو عبداللہ بن جعفر نے اُن سے چاہا تھا۔ [illegible] میں یہ بات نہیں سوچی جا سکتی کہ مقامی حکام احترام، نرمی اور چشم پوشی کا یہ رویہ مرکزی حکومت اور دارالخلافہ دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔ لازماً یہ رویہ وہاں کے ایماء پر ہونا چاہیئے اور حضرت عبداللہ بن عباس کے نام کے خط سے بھی، جس کا اوپر تذکرہ ہوا، یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یزید حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱

[2] "شہید انسانیت" کے مصنف جناب علی نقی نقوی صاحب [illegible] کسی دوسرے [illegible] لاشبہ [illegible] واقعہ کو محض [illegible] ہے۔ [illegible] واقعہ نہیں۔

معاملے میں وہی فرق کرتا تھا جس فرق کی حضرت معاویہ نے اُسے وصیت کی تھی۔[1]

ذی الحجہ کی ۸ر یا ۱۰ر

محمود احمد عباسی مرحوم نے اپنی کتاب میں ایک خاص بحث یہ کی ہے کہ حضرت حسینؓ کے قافلے کا سفر ۸ر ذی الحجہ کو حج سے پہلے شروع ہوا تھا یا ۱۰ر کو؟ وہ کہتے ہیں کہ ۸ر کی جو روایت عام طور پر مؤرخین کے یہاں پائی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح ۱۰ر ذی الحجہ ہے یعنی آپ حج کر کے روانہ ہوئے تھے۔ اسکے لئے انہوں نے بہت سے دلائل جمع کئے ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ دمشق کو جانے والے یمنی قافلے کو پکڑنے کی جو روایت آئی ہے اُس میں اس واقعہ کا مقام تنعیم کو بتایا گیا ہے۔ جو مکہ مکرمہ سے شمال مغرب کی جانب ۴ میل کے فاصلے پر مشہور جگہ ہے۔ اس کو چھوٹا عمرہ بھی کہتے ہیں کیونکہ عمرہ کا (احرام باندھنے کیلئے حدود حرم سے باہر جو جانا پڑتا ہے تو اس کام کے لئے یہ قریب ترین جگہ ہے) — عباسی صاحب کہتے ہیں کہ تنعیم کا محلِّ وقوع اس سمتِ جنوب مشرق سے جس سمت میں آدمی مکّے سے کوفے کیلئے چلتا ہے، بالکل مخالف سمت، شمال مغرب میں راہِ دمشق پر ہے۔ تو مکّے سے کوفے کو جاتے ہوئے تنعیم کا یہ واقعہ کیسے پیش آگیا؟ اور کیسے یہ قافلہ جو حج کے ایام میں مکہ سے گزر رہا تھا بغیر حج کئے ہوئے مکہ سے آگے بڑھ کر تنعیم پہنچ گیا ہوگا؟ عباسی صاحب کا یہ سوال تو بالکل صحیح ہے۔ مگر اس کے ذریعہ جو وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہاں حج کے بعد ۱۰ر تاریخ میں حضرت حسین کا سفر مانا جائے تو یہ واقعہ ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ بالکل بھی قابل قبول بات نظر نہیں آتی۔ کیونکہ حج کرنے کی صورت میں حضرت حسین

---

[1] شیعہ مصنفین نے مدینے سے حضرت حسین کے خفیہ کوچ کا بدیہی جواز ثابت کرنے کیلئے اور اسی طرح مکہ سے قبلِ حج کوچ کیلئے عجیب عجیب الزامات حکام مکہ و مدینہ اور حکومت دمشق پر لگائے ہیں، مگر سب بے بنیاد اور محض افترا ہیں۔ شہید انسانیت ص۲۲ پر ہے کہ ولید نے یزید کو حضرت حسین کی بیعت سے انکار کی خبر دی تو اس نے حکم بھیجا کہ بیعت کرنے و نہ کرنے والوں کی فہرست بھیجو جس کے ساتھ حسین کا سر بھی ہونا چاہیے۔

اور اُن کا قافلہ تنعیم سے اُسی مخالف سمت میں جس سمت میں راہ کوفہ سے اس وقت کے مقابلہ میں اور زیادہ دور ہوجاتا تھا جس وقت آپ ۸ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں تھے۔ حج کے ارکان منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں ادا ہوتے ہیں اور یہ مقامات مکہ سے بجانب مشرق (یا جنوب مشرق) ۲½ میل سے لیکر ۱۲ میل تک کے فاصلے پر ہیں جبکہ تنعیم مکہ سے خود عباسی صاحب کے قول کے مطابق بھی — بجانب شمال مغرب ۳-۴ میل کے فاصلے پر ہے لہٰذا ۳-۴ میل مخالف سمت میں اگر اس واقعہ کا تصور مشکل ہے تو اسی مخالف سمت میں ۱۵-۱۶ میل کا فاصلہ ہوجانے پر اور بھی زیادہ مشکل ہوجانا چاہیئے۔

دوسری دلیل عباسی صاحب نے البدایہ والنہایہ کے الفاظ "وذالك فی عشر ذی الحجۃ" کو بنایا ہے، مگر اسی البدایہ والنہایہ جلد ۸ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ

فاتفق خروجہ من مکۃ ایام	پس آپ کا مکہ سے خروج ایام ترویہ میں
التروبۃ قبل مقتل مسلم بیوم واحد	قتل مسلم سے ایک دن پہلے ہوا مسلم کا
فان مسلما قتل یوم عرفۃ (ص ۱۵۹)	قتل یوم عرفہ میں ہوا تھا۔

پس اس کی روشنی میں "عشر ذی الحجہ" کا مطلب ۱۰ ذی الحجہ نہیں بلکہ "عشرۂ ذی الحجہ" ہے جیسا کہ ... علاوہ ازیں معاملے کا یہ پہلو بھی عباسی صاحب سے نظر انداز ہوگیا کہ اگر حضرت حسینؓ نے سفر کا آغاز حج کے بعد کیا ہوتا تب وہ ۱۲ ذی الحجہ تاریخ سے پہلے سفر نہیں کر سکتے تھے حاجی کو کم از کم ۱۲ تک کو منیٰ میں رک کر رمی جمرات کرنا ہی ہوتی ہے۔ اور اس صورت میں عباسی صاحب کے دیئے ہوئے پیمانۂ رفتارِ سفر کے مطابق آپ ۱۰ محرم ۶۱ھ کو کربلا میں نہیں پہنچ سکتے تھے۔

ہمیں بذات خود ۸ ذی الحجہ تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن عباسی صاحب کے قارئین میں سے کسی کی نظر سے ہمارے یہ صفحات گزرے تو اُسے خیال ہو سکتا ہے کہ ایک سوال جو حضرت حسین کی تاریخ روانگی کے سلسلہ میں اتنی اہمیت سے ایک مصنف نے اٹھایا تھا۔ بعد والے دوسرے مصنف نے اس سے بالکل اعتنا ہی نہیں کیا۔ اس لئے اپنا نقطۂ نظر اس بارے میں عرض کرنا مناسب سمجھا گیا۔

کربلا تک رودادِ سفر اور یوم شہادت کی روایتیں

آغاز سفر کے ساتھ جس طرح کی روایتیں ابھی آپ کے سامنے آئیں کہ ایک کا مضمون دوسرے کی نفی کر رہا ہے۔ بلکہ خود ایک ہی کے اندر کے دو حصے ایک دوسرے سے تضاد رکھتے ہیں۔ ان کے بعد جو اور روایتیں کربلا تک کے سفر اور یوم شہادت کی روداد بیان کرتی ہیں، وہ بعینہٖ اس کیفیت کی حامل اگرچہ نہ ہوں مگر دوسرے متعدد اسباب سے اُن کا بیشتر حصہ مشکوک اور ناقابل اعتبار ہے۔ اور کوئی خاص اہمیت اس پوری روداد کے بیان کی ہے نہیں مثلاً آپ راستے میں کہاں کہاں ٹھیرے؟ یہ جگہیں اکثر وہ ہیں جو قاری کے لئے ایک جائے مجہول کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا علم اُسے ہو یا نہ ہو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا کتنی دیر تک دو منزلوں کے بیچ میں چلے۔ اور کتنی دیر اور کون سے وقت آپ کس منزل پر ٹھیرے، اور کتنا پانی کہاں سے بھر کے ساتھ لیا۔ اور کون سی منزل کی کیفیت کیا تھی؟ یہ سب باتیں وہ ہیں جو اس واقعہ کے بارے میں اُس خاص نقطۂ نظر کے ساتھ جو شیعہ حضرات کا ہے اور جو اعتقادات حضرت حسین اور ان کے اہلِ بیت کے بارے میں شیعہ حضرات رکھتے ہیں اُن اعتقادات کے ساتھ تو ان تفصیلات میں جانے کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں لیکن ان اعتقادات اور اس نقطۂ نظر کے بغیر ان تفصیلات میں جانا کوئی بامعنیٰ کام نہیں ہوگا۔ اس لئے ہم تفصیل برائے تفصیل کے بجائے اس روداد کی صرف وہی باتیں یہاں بیان کریں گے جن میں ہر اعتقاد اور ہر نقطۂ نظر کے لئے کوئی افادیت کا پہلو ہے۔

فرزدق سے ملاقات

فرزدق عربی شاعری کا مشہور نام ہے۔ حضرت علی اور آپ کے اہل بیت کے حامیوں میں سے تھا۔ عراق ہی وطن تھا۔ طبری نے دوران سفر حضرت حسین سے اسکی ملاقات

بتانے والی دو روایتیں دی ہیں۔ ایک بتاتی ہے[1] کہ مقام صفاح پر اسکی ملاقات ہوئی جو کہ حدودِ حرم سے باہر تقریباً دس میل کی مسافت پر ہے۔ اور اس ملاقات کے راوی ایسے دو کوفی ہیں جو یوم ترویہ میں مکہ مکرمہ پہنچے جو کہ حضرت حسین کی روانگی کا دن تھا۔ اور آپ کو رخصت کرکے حج کے قافلوں میں شامل ہو گئے۔ اس سفر کی بہت سی روایتیں انہی دو کے حوالے سے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم حج سے فارغ ہو کر شتابی سے حضرت حسین کے تعاقب میں نکلے ـــــ شریک سفر ہونے کیلئے نہیں بلکہ تماشہ دیکھنے کیلئے کہ کیا ہوتا ہے ہم "صفاح" پہنچے تو دیکھا کہ فرزدق ہے جو حضرت حسین سے مل رہا ہے۔ اور ان دونوں کی بات چیت ختم ہوئی تو حضرت حسین نے اپنی سواری کو حرکت دی اور السلام علیکم کہہ کر دونوں الگ ہو گئے۔ ان الفاظ سے صاف طور پر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ فرزدق عراق کی سمت سے آ رہا تھا۔

عراق کی سمت سے آنے کا یہ کون سا وقت تھا جبکہ حج ہو چکا ہے؟ اور حضرت حسین کو صفاح پہنچتے پہنچتے جو کہ بمشکل دس میل پر ہے ایسے کتنے دن لگ گئے کہ وہ دو کوفی (عبداللہ بن سلیم اور المذری بن مشمعل) جو واقعہ کے راوی ہیں حج کرنے کے بعد حضرت حسین کے پیچھے نکلے تو اس وقت تک حضرت حسین کا قافلہ صفاح تک ہی پہنچا تھا؟ جبکہ یہ دونوں حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد ۱۲ ذی الحجہ سے پہلے نہیں روانہ ہو سکے ہوں گے یعنی حضرت حسین کی روانگی کے چار دن بعد!

دوسری روایت[2] جس کا راوی خود فرزدق کو بتایا گیا ہے، وہ بتاتی ہے کہ فرزدق سنہ ۶۰ھ کے ایام حج میں (اپنی والدہ کو حج کرانے کے واسطے لئے ہوئے) حرم (یعنی حدودِ حرم) میں داخل ہوا تو اُسے ایک قافلہ مکہ سے نکلتا ہوا ملا جو تلواروں اور ڈھالوں کے ساتھ تھا۔ معلوم کرنے پر کہ یہ کس کا قافلہ ہے پتہ چلا کہ حضرت حسین بن علی کا۔ فرزدق نے لپک کے ان کو سلام کیا اور کچھ بات چیت کی جس میں یہ سوال بھی تھا کہ اے ابن رسول اللہ آپ حج چھوڑ کے کہاں جا رہے ہیں؟

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۸ [2] ایضاً

پس پہلی روایت کی رو سے حج (یوم عرفہ) ہوئے بھی تقریب چار پانچ دن ضرور ہو چکے تھے جب فرزدق عراق سے آتے ہوئے (صفاح کے مقام پر) حضرت حسین سے ملا۔ اور دوسری روایت کی رو سے فرزدق ۸ ذی الحجہ کو حرم شریف پہنچ گیا تھا۔ او حضرت حسین سے ملاقات مکہ سے آپ کے نکلتے وقت ہوئی۔

اور ایک تیسری روایت بھی ہے جو بعض شیعہ مصنفین نے اپنے ماخذ سے لی ہے[1]۔ وہ اس ملاقات کے واقعہ کی ایک تیسری شکل بتاتی ہے کہ فرزدق حج کر کے لوٹ رہا تھا تب ایک پڑاؤ پر ملاقات ہوئی غرض "شد پریشان خوابِ من از کثرت تعبیرہا" کا مضمون ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یا کہہ لیجئے "اندھوں کی فیل شناسی" کہ جس اندھے نے ہاتھی کے جس حصے کو چھوا اُسی کی شکل وصورت اور سائز کو پورے ہاتھی کی شکل اور سائز بتا دیا۔

روداد سفر کی روایتوں کا یہی وہ حال ہے جس کی بنا پر عرض کیا گیا کہ بالکل قابلِ اعتنا نہیں ہیں۔ فرزدق کی ملاقات کے سلسلے میں طبری کی دونوں روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت حسین نے فرزدق سے پوچھا کہ "اپنے پیچھے (یعنی عراق میں) کیا حال چھوڑ کر آئے ہو؟" فرزدق نے جواب دیا کہ :-

"دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنی امیہ کے ساتھ اور قضا وقدر اللہ کے ہاتھ ہیں۔ جس پر آپ نے فرمایا "سچ کہتے ہو" اور رخصت ہو گئے[2]۔

یہاں قدرتی طور پر حیرت ہوتی ہے کہ حضرت حسین نے تو یہ سفر پوری طرح اس پر اطمینان پر شروع کیا تھا کہ کوفے کے لوگ آپ کی حمایت پر مستعد اور آپ کی آمد کیلئے چشم براہ ہیں پھر فرزدق کی اس سے بالکل مختلف بات پر اظہارِ تعجب کے بجائے آپ نے تصدیق وتصویب فرمائی!
—— بعد میں آنے والی کچھ اور روایات بھی ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق والی گفتگو کی شاید کوئی اصلیت نہیں ہے۔ یہ روایات آگے آرہی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ

---

[1] نجد برزاق موسوی المقرم نے "مقتل حسین" میں ص۷۵ پر [2] طبری ج ۶ ص۲۱۸

فرزدق سے ملاقات سے کافی دنوں بعد تک حضرت حسین کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب کوفہ کے
ساتھ نہیں ہے۔

انجام مسلم کی خبر

حضرت حسین کا قافلہ کوفے کی طرف سرگرم سفر تھا مسلم بن عقیل کا خط ملنے کے بعد
سے وہاں کے حالات میں جو تبدیلی ہوئی تھی بشلاً خود جناب مسلم اور ہانی بن عروہ کو دی
جانے والی سزائے موت' اس کا کوئی علم کسی ذریعہ سے نہ ہوا تھا۔ راہ میں ایک منزل
زُبالہ آتی ہے۔ جہاں سے کوفہ زیادہ دور نہیں رہتا۔ اس منزل پر آپ کو وہ قاصد[1] جو کوفے
سے محمد بن اشعث نے مسلم بن عقیل کی وصیت کے مطابق ان کا یہ تحریری پیغام لیکر بھیجا تھا۔

"میں یہاں گرفتار کیا جا چکا ہوں۔ آپ شاید چل بھی نہ پائیں کہ میرا قتل ہو جائے
پس آپ جہاں بھی یہ پیغام پائیں لوٹ جائیں۔ کوفہ والوں کا بھروسہ نہ کریں
ان لوگوں نے آپ سے بھی جھوٹ بولا تھا اور مجھ سے بھی جھوٹ ہی بولا۔ اور یہ تو
آپ کے والد کے وہ ساتھی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ موت یا قتل کی تمنا کرنے لگے تھے۔"[2]

ایک روایت کے مطابق آپ نے درمیان سفر میں مقام حاجر سے اپنے رضاعی بھائی
عبداللہ بن یَقطُر کے ہاتھ (یا ایک دوسرے شخص کے ہاتھ) اہلِ کوفہ کے نام اپنی روانگی کی
اطلاع بھی روانہ کی تھی۔ اسی منزل زُبالہ پر اُن کے بارے میں بھی خبر ملی کہ وہ کوفے سے
پہلے قادسیہ کے مقام پر گرفتار کر لئے گئے۔ اور پھر مقتول ہوئے۔[3]

ساتھیوں کو آگاہی

کہا گیا ہے اور بالکل قرین قیاس ہے کہ زُبالہ کی منزل پہ یہ پوری صورت حال ...

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۶ [2] ایضاً ص ۲۱۱ [3] ایضاً ص ۲۲۶

بدلنے والی ... جو اطلاعات حضرت حسینؓ کو موصول ہوئیں تو آپ نے ضروری سمجھا کہ ساتھیوں کو آگاہ کریں اور اجازت دیں کہ اس نئی صورت حال میں جو شخص قافلے سے علیحدہ ہونا چاہے وہ علیحدہ ہو جائے۔ یہ بات روایت کے مطابق آپ نے خاص طور پر اُن ساتھیوں کے پیش نظر کہی تھی جو راستے کی منزلوں پر آپ کا مقصدِ سفر معلوم کر کے آپ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اور یہ زیادہ تر بدوی تھے۔ چنانچہ ایسے سب ہی لوگ یہ سن کر منتشر ہو گئے۔ اور آپ کے ساتھ سفر میں صرف وہی لوگ رہ گئے جو مکہ سے ساتھ تھے۔

واپسی کا مشورہ

طبری نے اسی صفحہ (۲۲۶) پر اگلی روایت دی ہے کہ جب منزل بطن عقبہ پر قیام ہوا تو وہاں ایک شخص نے آپ کے حالات سننے کے بعد یہ مشورہ دیا کہ برائے خدا آگے نہ جائیے۔ ان حالات میں آگے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ آپ نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ مگر فرمایا کہ "اللہ کے ارادوں پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا۔" اور سفر جاری رکھا۔

ایک صفحہ قبل یعنی (ص۲۲۵) طبری نے ایک اور روایت بھی ایسے ہی مشورے کی نقل کی ہے۔ یہ مشورہ اُن دو کوفیوں نے دیا تھا جن کا ذکر ہم نے فرزدق کی ملاقات والی روایتوں کے ضمن میں کیا ہے کہ یہ حج کے بعد سے حضرت حسینؓ کے قافلے کے پیچھے پیچھے [illegible] لگ گئے تھے۔ ان کی روایت ہے کہ زرود کے مقام پر کوفے سے آنے والے ایک شخص سے ہم کو مسلم اور ہانی کے مارے جانے کی خبر ملی تو ہم نے ثعلبیہ[2] کی منزل پر حضرت حسینؓ کی خدمت میں رازداری کے ساتھ پہنچائی، اور پھر ذرا سا وقفہ دے کر عرض کیا کہ "للہ آپ آگے نہ جائیے۔ اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔" کہتے ہیں کہ یہ سنتے ہی بنو عقیل چلائے کہ ہرگز نہیں

---

[1] طبری ص۲۲۵ [2] ثعلبیہ اس راہ کی مشہور منزلوں میں ہے۔ مکہ کی طرف سے جاتے ہوئے زرود سے ایک منزل پہلے پڑتی تھی۔

واللہ ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یا تو اپنے بھائی مسلم کا انتقام لیں اور یا ہم بھی اُنکے والے انجام سے دوچار ہو جائیں" کوفی راوی کہتے ہیں کہ اس پر آپ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کہ اِن (بچوں) کے بعد بھلا زندگی میں کیا مزہ؟ یعنی آپ نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ فرمالیا۔ صلاً ۲۲۶ والی روایت میں جو الفاظ بَطنِ عَقَبَہ کی منزل کے آئے ہیں کہ "تم ٹھیک کہتے ہو مگر اللہ کے ارادوں پر کون غالب ہو سکتا ہے"؟ اِن الفاظ کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ غالباً کوفیوں والی وہ روایت صحیح ہے جو ابھی گزری جس کے مطابق بظاہر آپ (دو منزلیں پہلے ثَعْلَبِیَہ کے مقام پر) یہ فیصلہ کر لینا چاہتے تھے کہ آگے نہ بڑھا جائے۔ مگر بنو عقیل کا رُخ دیکھ کر اس کو مناسب نہ سمجھا۔

حضرت محمد الباقر کی روایت

طبری نے رودادِ سفر اور واقعہ شہادت کے سلسلے میں دوسری بہت سی روایتوں کے ساتھ ایک مسلسل روایت ٹکڑوں میں حضرت حسین کے پوتے حضرت محمد الباقر کی بھی درج کی ہے۔ اس روایت کے پہلے ٹکڑے کا ایک اقتباس ہم پیچھے دے چکے ہیں، اس کے دوسرے ٹکڑے یہ آتے ہیں:-

فاقبل حسین بن علی بکتاب	حسین بن علی، مسلم بن عقیل کا خط
مسلم بن عقیل کان الیہ حتی	پانے کے بعد کوفے کی طرف متوجہ ہو گئے
اذا کان بینہ وبین القادسیۃ	حتیٰ کہ جب آپ وہاں پہنچے کہ قادسیہ
ثلٰثۃ امیال لقیہ الحُرُّ بنُ	کے اور آپ کے درمیان تین میل کا
یزید التمیمی فقال لہ این	فاصلہ تھا[1] تو وہاں حُر بن یزید تمیمی
تُرید قال ارید ھذا المصر	سے ملاقات ہوئی حُر نے دریافت کیا،

[1] قادسیہ اسلامی تاریخ فتوحات کا نہایت مشہور نام ہے۔ کوفے سے تقریباً ۴۵ ـ ۵۰ میل بجانب جنوب مغرب اس کا محل وقوع ہے۔ اس میں گزر کر ہی کوفے کو سیدھا راستہ جاتا تھا۔

قال له ارجع فانی لم ادع لك خلفی خیرًا ارجوه فهمّ ان یرجع وکان معه اخوة مسلم بن عقیل فقالوا والله لا نرجع حتّی نصیب بثأرنا او نُقتل، فقال لا خیر فی الحیاة بعدکم فسار...[1]

کہاں کا ارادہ ہے؟ فرمایا اسی شہر کا. حرّ نے عرض کی، آپ لوٹ جائیں اس لئے کہ میں (جو وہیں سے آرہا ہوں) آپ کے لئے کوئی اچھی صورت حال چھوڑ کر نہیں آرہا ہوں. اس پر آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا، لیکن مسلم بن عقیل کے بھائی آپ کے قافلے میں تھے، وہ بولے کہ خدا کی قسم ہم تو بغیر بدلہ لئے یا اپنی جان دیئے نہیں واپس ہونگے تب آپ نے فرمایا کہ تمھارے بعد میرے لئے زندگی میں کیا مزہ ہے؟ اور یہ کہہ کر آپ آگے کو چل دیئے.

حضرت محمد الباقر کی اس روایت کے بعد ـــــ جو اگر صحیح ہے تو یقینًا انھوں نے اپنے والد ماجد حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) سے سنی ہوگی جو اس سفر میں اپنے والد ماجد حضرت حسین کے ساتھ تھے[2] ـــــ یہ بات بالکل یقینی ہوجاتی ہے کہ حضرت حسین نے حالات کے ہمہ انقلاب کا علم و یقین حاصل ہوجانے کے بعد واپسی کا ارادہ فرمایا تھا. اگرچہ وہ برادرانِ مسلم کی وجہ سے عمل میں نہ آسکا.

سمتِ سفر کی تبدیلی اور نزولِ کربلا

جب کہ وہبی کی روایت میں آیا، آپ نے برادرانِ مسلم کی بات سن کر واپسی کا ارادہ

۱؎ طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۰ ۲؎ خود حضرت محمد باقر بھی دو ڈھائی سال کی عمر کے اس قافلے میں شامل [illegible]

باب دہم[۱]

کربلا کی سرگزشت

عمر بن سعد کی آمد

حضرت محمد الباقر کی جس روایت کے الفاظ پر گزشتہ باب ختم ہوا ہے اسی میں آگے بیان ہوا ہے کہ عمر بن سعد بن ابی وقاص جن کو ابن زیاد رے[۱] کا حاکم بنا کر بھیج رہا تھا حضرت حسین کا معاملہ سامنے آجانے پر انہی ابن سعد کو یہ حکم ہوا کہ پہلے تم اس معاملے سے نپٹتے جاؤ۔ (عربی کے الفاظ ہیں اِکفِنی ھذا الرجل) انھوں نے اس خدمت سے معافی چاہی، مگر مجبور ہونا پڑا، اور حضرت حسین کی اطلاع پا کر کربلا کا رُخ کیا۔

صلح کی بات اور ناکامی

فلما اتاه قال له الحسين	پس جب ابن سعد وہاں پہنچ گئے تو حضرت
اختر واحدة من ثلاث اما ان تدعوني	حسین نے اُن سے کہا کہ تین باتوں میں سے
فانصرف من حيث جئت	ایک قبول کر لو۔ یا تو میں جہاں سے آیا ہوں
اما ان تدعوني فاذهب الى	وہاں واپس ہو جانے دو۔ یا یزید کے پاس[۳]
يزيد واما ان تدعوني فالحق	جانے دو۔ یا پھر سرحدوں
بالثغور[۲]	کی طرف (جہاں میدان جہاد گرم ہے) نکل جانے دو۔

---

۱ یہ ایران میں تہران کے قریب ایک مشہور شہر ہے۔ ۲ طبری ج ۶ ص ۲۲

عمر نے آپ کی اس پیش کش کو قبول کر کے ابن زیاد کو اطلاع بھیجی۔ مگر وہاں سے جواب آیا کہ یوں نہیں، بلکہ انھیں پہلے "میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھنا ہوگا۔" "لا ولا کرامۃ حتی یضع یدہ فی یدی۔"

فقال لہ الحسین لا واللہ لا یکون ھذا ابداً۔[1]	اس پر حسین نے کہا کہ نہیں، یہ تو بخدا کبھی نہیں ہوگا۔

ایک دوسری روایت سے تائید

حضرت محمد الباقر کی روایت کے بعد طبری نے اُنہی کی روایت کی طرح کی ایک جامع روایت (جس میں اول سے آخر تک کا قصہ اختصار سے بیان کیا گیا ہے) اور درج کی ہے۔ اس کے راوی حصین بن عبدالرحمٰن ہیں۔ اُس سے بھی واقعہ کی صورت تقریباً یہی معلوم ہوتی ہے جو مندرجہ بالا روایت سے سامنے آئی۔ اس میں ہے کہ "حضرت حسین اپنی منزل کی طرف وہاں کے حالات سے بالکل بے خبر گامزن تھے۔

حتی لقی الاعراب فسألھم فقالوا واللہ ماندری غیرانا لا نستطیع ان نلج ولا نخرج فانطلق یسیر نحو طریق الشام نحو یزید فلقیتہ الخیول بکربلاء فنزل یناشدھم اللہ والاسلام قال وکان بعث	یہاں تک کہ کچھ اعرابی ملے اور آپ نے اُن سے حالات کی بابت سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ حضور ہمیں نہ کی تو خبر نہیں البتہ اتنا جانتے ہیں کہ نہ ہم اِدھر سے اُدھر جا سکتے ہیں اور نہ اُدھر سے اِدھر آسکتے ہیں[2]۔ اس پر آپ نے شام کے راستے کی طرف یعنی

---

[1] طبری جلد ۶ صفحہ ۲۲۰　[2] یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ بات چیت قادسیہ کے قریب ہی کہیں ہوئی ہے جو کوفے کا ناکہ تھا اور جہاں روک تھام کے انتظامات تھے۔

الیہ عمر بن سعد وشمر بن ذی الجوشن وحصین بن نُمیر فناشد ھم الحسین اللہ والاسلام ان یُسیّروہ الی امیر المؤمنین فیضع یدہٗ فی یدہٖ فقالوا لا الّا علیٰ حکم ابن زیاد ......[1]	یزید کی طرف کو چلنا شروع کیا اور اسی اثناء میں مقام کربلا میں آپ کو گھڑسوار دستوں کا سامنا ہوا، پس آپ اُترے اور اُنھیں اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر سمجھانے لگے. راوی کا مزید بیان ہے کہ ابن زیاد نے عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن اور حصین بن نُمیر کو کربلا بھیجا تھا سو آپ نے انکو اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر کہا کہ آپ کو امیر المؤمنین (یزید) کے پاس جانے دیں وہاں آپ اپنا ہاتھ انکے ہاتھ میں دیدیں گے. مگر ان لوگوں نے کہا کہ نہیں پہلے آپ کو ابن زیاد کا حکم ماننا ہوگا (یعنی اس کے پاس چلنا ہوگا.)

اس روایت میں اس بات کا ذکر نہیں ہے، جو اوپر والی روایت میں تھا کہ عمر بن سعد نے تو حضرت حسین کی پیش کش (یا مصالحتی فارمولا) قبول کرلیا تھا. مگر ابن زیاد نے اُسے رد کرکے واحد صورت یہ تجویز کی کہ وہ کوفے آکر پہلے اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں، بعد میں اُن کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا. مگر یہاں اس بات کا ذکر نہ ہونا کہ عمر بن سعد نے تو قبول

---

[1] طبری ج ۶ [illegible] ۔ اس روایت میں تین صورتوں کے بجائے صرف یزید کے پاس جانے والی صورت کا ذکر ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ تینوں صورتوں میں سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر چیز تھی واللہ اعلم

کیا تھا مگر ابن زیاد نے رد کر دیا صرف برنبائے اختصار ہی سمجھا جانا چاہئے۔ ورنہ ایسی
کوئی ایک روایت بھی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ خیال کرنے کی گنجائش ہو کہ عمر بن سعد کو
لڑائی ٹالنے سے نہیں بلکہ برپا کرنے سے دلچسپی تھی۔ ابن سعد سے متعلق تمام روایتیں اس کی
شہادت دیتی ہیں کہ وہ ہر ممکن طریقے پر خواہش مند تھا کہ اس کے نامۂ اعمال میں قتل حسینؓ
نہ لکھا جائے۔

جنگ اور شہادت

حضرت محمد الباقر کی روایت میں اوپر گزر چکا ہے کہ ابن زیاد کی طرف سے یہ شرط
کہ "پہلے حسین اُسکے قیدی بن کر کوفے آئیں بعد میں اُن کی سرخی پیش کش پر غور کیا جائے"
حضرت حسین کو منظور نہیں ہوئی، اور فرمایا" لا واللہ لا یکون ھذا ابدا " اس کے
بعد بیان ہوا ہے۔

فقاتله فقتل اصحاب الحسين	جس پر عمر نے آپ سے جنگ کی، یا آپ
كلهم وفيهم بضعة عشر شاباً	نے عمر سے جنگ کی، اور اس میں تمام رفقاء
من اهل بيته وجاء سهم	حسین شہید ہوئے اور ان میں دس سے
فاصاب ابناً له معه في	زیادہ نوجوان آپ کے اہل بیت میں سے تھے۔
حجره فجعل يمسح الدم عنه	اور ایک تیر آکے آپ کے ان صاحبزادے
ويقول اللهم احكم بيننا و	کو لگا جو آپ کی گود میں تھے، آپ
بين قوم دعونا لينصرونا	صاحبزادے کا خون پونچھتے جاتے اور
فقتلونا ثم امر بحبرة فشققها	فرماتے جاتے تھے کہ اے اللہ تو ہی فیصلہ
ثم لبسها وخرج بسيفه فقاتل	کیجئے ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان

حتّٰی قُتل صلوٰت اللہ علیہ۔[1]	جنھوں نے ہماری مدد کیلئے ہمیں بلایا اور پھر قتل کیا، پھر آپ نے ایک چادر طلب کر کے اُسے پھاڑا اور اپنے اوپر لپیٹا پھر تلوار لے کر نکلے اور قتال کیا حتیٰ کہ شہید ہوئے۔ صلوٰت اللہ علیہ۔

حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اس موقع پر ذراسی اور تفصیل ہے اُس میں کہا گیا ہے کہ ابن زیاد نے جو لشکر حسینی قافلے کی گرفتاری کے لئے بھیجا تھا اس میں ایک صاحب حُر بن یزید حنظلی بھی تھے جو ایک سوار دستے کے سالار تھے۔ انھوں نے جب یہ صورت حال دیکھی کہ حضرت حسین کی بات ردّ کی جارہی ہے تو معاملہ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیا غضب ہے!

واللہ لو سألکم ھذا الترك والدیلم ما حلّ لکم ان تردّوہ۔[2]	یہ بات تو اگر تم سے تُرک اور دیلم کے کافر بھی مانگتے تو اُن کا سوال بھی رد کرنا تمہیں روا نہ تھا۔

مگر باقی کمان کے اُن تینوں افراد نے اپنی بات پر اصرار جاری رکھا[3] جس پر حُرّ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حضرت حسین کی صفوں میں پہنچ گیا، اور وہاں سے پلٹ کر ابن زیاد کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔

فصرف الحرّ وجہ فرسہ وانطلق الی الحسین واصحابہ	اس پر حُرّ نے اپنے گھوڑے کا رُخ پھیرا اور حسین اور اُنکے ساتھیوں کی طرف

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۲ [2] البدایۃ ص ۱۷۲ [3] بعض دوسری روایات میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے کہ حُرّ نے یوم عاشورہ کی صف آرائی کے وقت ابن سعد امیر لشکر کو مخاطب کر کے یہ بات کہی تھی اور صرف ابن سعد ہی نے جواب دیا تھا۔ جو یہ تھا کہ میں تو خود یہی چاہتا تھا مگر میرا اختیار نہیں ہے۔

فظنوا انہ انما جاء لیقاتلھم	چلا ان لوگوں نے گمان کیا کہ یہ شخص
فلما دنا منھم قلب ترسہ	اُن سے لڑنے آرہا ہے مگر قریب پہنچ کر
وسلم علیھم ثم کرّ علی	حُرّ نے اپنی ڈھال کو اُلٹ دیا (جو
اصحاب ابن زیاد فقاتلھم	دوست ہونے کی علامت تھی) اور
فقتل منھم رجلین ثم قتل	سلام کیا۔ اس کے بعد وہ اصحاب
رحمۃ اللہ علیہ۔[1]	ابن زیاد پر پلٹا اور حملہ کر کے دو آدمی
	مارے اور پھر خود بھی جان دیدی۔

حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت کے اس زائد حصّے سے یہ سمجھنا ممکن ہوتا ہے کہ کربلا کی جنگ کا آغاز حر بن یزید کی تلوار سے ہوا، مگر واقعہ میں یہ صرف ایک نداز بیان ہے ابتدا دوسری طرف سے ہوئی تھی۔

حُرّ بن یزید دوسری روایات میں

حُرّ بن یزید کا تذکرہ واقعۂ کربلا کی دوسری روایات میں بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے، اور ماتم حسین کی مجلسوں میں انصار حسین کے جب نام آتے ہیں تو وہاں یہ ایک بہت نمایاں نام ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں پہلی تفصیلی روایت یہ ہے کہ عمر بن سعد کے فوجی دستوں سے پہلے ایک گھڑسوار دستے نے آکر حضرت حسین کا راستہ روکا تھا، یہ دستہ حُرّ بن یزید ہی کی قیادت میں تھا۔ اس روایت کے مطابق اس دستے کا اور قافلۂ حسینی کا سامنا کربلا سے کچھ دور پہلے ذو حُسُم پہاڑ کے دامن میں ہوا۔ یہ دستہ اس اطلاع پر کہ حضرت حسین نے اپنا رُخ کوفے سے موڑ کر اُس راہ پر کر دیا ہے جو شام اور دمشق کو جاتی ہے، اس مقصد کیلئے قادسیہ سے دوڑایا گیا تھا کہ ان لوگوں کو حراست میں کوفے لائے حضرت حسین نے اس بات سے انکار کر کے مکہ کو واپسی کا ارادہ کیا تو حُرّ اس پر

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۳

حائل ہوا۔ لیکن دل میں نرمی تھی کسی بڑی سختی پر آمادہ نہ ہو پایا اور بیچ کی راہ یہ نکالی کہ نہ آپ کوفے جائیں نہ ہی مکے کو، بلکہ ایک بین بین راستے پر ہم دونوں ہلکے ہلکے چلتے رہیں حتیٰ کہ میں ابن زیاد کو خط لکھ موجودہ صورت حال میں اُس کا نیا حکم حاصل کروں۔ روایت کہتی ہے کہ حکم یہ آیا کہ جہاں ہو وہیں قافلے کو روک لو۔ اور انتظار کرو۔ چنانچہ حُرؓ نے جو ابن زیاد کا حکم آپ کو پہنچایا اور مزید کسی رعایت سے معذوری ظاہر کی، تو اگرچہ آپ کے کچھ ساتھیوں کی رائے نہ تھی کہ اس حکم کے مطابق اسی جگہ پر رُک جانا قبول کیا جائے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کسی مناسب اور اپنی پسند کی جگہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ اس میں حُرؓ کے دستے سے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ مگر حضرت حسینؓ نے کسی طرح کی جنگ آزمائی کو مناسب نہ جانا اور حُرؓ نے جہاں کہا وہاں آپ ٹھہر گئے ـــــ اور یہ کربلا کا میدان تھا۔[۱]

آپ کے اس نزول ـــــ نزول کربلا ـــــ کی تاریخ ۲ محرم یوم پنجشنبہ ۶۱ھ درج ہوئی ہے۔[۲] اور طبری نے چونکہ حُرؓ سے متعلق یہ روایت "۶۱ھ کے واقعات" کا عنوان قائم کر کے دی ہے۔ اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ حُرؓ کے دستہ سے آپ کے قافلہ کا سامنا یکم محرم ۶۱ھ کو ہوا یعنی اس سے پہلے نہیں۔ گویا ایک یا دو دن کے اندر کوفے سے خط و کتابت کے مراحل طے ہو گئے۔

اس کے بعد روایت کا سلسلۂ بیان کہتا ہے کہ اگلے دن ـــ یعنی ۳ محرم یوم جمعہ کو ـــ عمر بن سعد کی سرکردگی میں چار ہزار نفوس پر مشتمل مزید فوجی دستے پہنچ گئے۔

۱۔ اسکے متعلق روایتوں میں یہ بھی ہے اور اس کی بے حد شہرت ہے کہ یہ بے آب و گیاہ ریتلا میدان تھا۔ مگر واقعہ میں یہ بات بے اصل ہے۔ خود حضرت محمد الباقرؒ والی روایت کے الفاظ کہ وہاں بانس اور نرکل (قصباء) کا جنگل تھا اسکی تردید کرتے ہیں۔ ۲۔ طبری ج ۶ ص ۲۳۲ بعض روایتوں میں آپکے مقام نزول کو نینویٰ بھی بتایا گیا ہے (طبری ج ۶ ص ۔) معجم البلدان کے مطابق یہ نینویٰ ایک علاقہ ہے جس میں کربلا کا قریہ واقع تھا۔ یہ وہ نینویٰ نہیں ہے جو شہر موصل کے پاس مشہور شہر اور ایک پرانی تہذیب کا مرکز ہے۔ ج ۲ ص ۲۱۵

دونوں روایتوں میں تطبیق

پس یہ ہو سکتا ہے کہ حُصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں حُر بن یزید کا جس طرح ذکر آیا ہے اُس کی واقعی صورت اِسی تفصیل کے مطابق ہو جو ابھی اوپر بیان ہوئی ہے حُصین کی روایت میں اُس کا اختصار کر کے بس حُر کی موجودگی میدان کربلا میں بتا دی گئی ہو۔

دوسری روایات کا ناقابلِ قبول حصہ

لیکن اس موجودگی کے بعد حُر کے جس کردار کا بیان حُصین کی روایت میں ہوا ہے وہ اپنے دستے کی قیادت چھوڑ کر حضرت حسین کی صفوں میں جا ملے اور پھر اُدھر سے پلٹ کے عمر بن سعد کے لشکر پر حملہ آور ہوئے اس کردار کی جو تفصیلی شکل طبری کی دوسری روایتوں میں بیان ہوئی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ جسے تفصیل و اجمال کا فرق کہہ کر قبول کر لیا جائے۔ بلکہ یہ دراصل میدان کربلا کے واقعات کی اُس "تفصیل" کا حصہ ہے جس کا وجود بظاہر عالم واقعہ میں نہیں جو بعد کے مصنفینِ مقاتل یا اُن کے 'راویوں' کی قوتِ تخیل کا کرشمہ ہیں۔

اس نوعیت کی "تفصیلی" روایتوں کے مطابق جن کا سلسلہ طبری میں صفحہ [illegible] سے تقریباً ۳۰۰۸ تک یعنی [illegible] صفحات میں پھیلا ہوا ہے، حُر نے یوم عاشورہ کی صبح اس وقت جبکہ دونوں طرف صف بندی ہو چکی تھی اپنے سردارِ لشکر کی آنکھوں سے بچتے ہوئے یا بروایت حکمت عملی سے کام لیکر اپنی صف کو چھوڑا اور صفِ حسینی میں جا پہنچے[1]۔ اور عرض کیا کہ یہ میرا ہی قصور تھا جو آج آپ کو یہ صورت حال درپیش ہے، ورنہ میں اگر آپ کا راستہ نہ روکتا تو آپ سلامتی کے ساتھ واپس ہو چکے ہوتے اسکے بعد اپنی معافی اور توبہ کی قبولیت کا اطمینان حضرت حسین کی زبان سے حاصل کیا۔ پھر پلٹ کر لشکر ابن زیاد کی طرف گئے اور

---

[1] اس حکمت عملی کی تفصیل خاصی طویل ہے۔ طبری ج ۶ ص ۲۴۴

ایک تقریر اُن کو مخاطب کر کے کی :-

"اے لوگو، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ حسین کی پیش کردہ باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی تم قبول نہیں کرتے۔" لوگوں نے کہا کہ "آپ امیر عمر بن سعد سے بات کریں" پس انھوں نے عمر کو مخاطب بنا کر یہی بات کہی۔ عمر نے جواب دیا کہ "مجھے تو خود بے حد خوشی ہوتی اگر میرے بس کی بات ہوتی"۔ اس پر حُر پھر عام لوگوں سے مخاطب ہو گئے کہ "اے کوفے والو، خدا تمھیں غارت کرے۔ تم نے اِن کو بلایا اور پھر دشمن کے حوالے کر دیا۔ تم نے دعویٰ کیا تھا کہ تم ان پر اپنی جانیں قربان کرو گے۔ اور اب تم اُلٹا اُن کو قتل کرنے کے درپے ہو۔ تم نے انھیں گھیر لیا ہے اور گھونٹ کے مارنا چاہتے ہو۔ اللہ کی اِس چوڑی زمین میں سے کسی طرف کو چلے جانے کا اذن نہیں دیتے کہ وہ اور ان کے اہلِ بیت امن پا سکیں۔ تم نے اُنکو ایسا بے بس قیدی بنا دیا ہے کہ اپنے نفع نقصان کا کچھ بھی اختیار ان کو نہیں رہ گیا۔ تم نے اُنکو اُنکی عورتوں اور بال بچوں کو فرات کے اُس بہتے پانی سے محروم کر رکھا ہے، جسے یہودی مجوسی اور نصرانی بھی پیتے ہیں اور سواد کے خنزیر اور کتے اس میں لوٹتے ہیں۔ ادھر یہ ہیں کہ پیاس سے مرے جاتے ہیں۔ کیا ہی بُرا سلوک ہے جو تم نے ذرّیتِ محمدؐ کیلئے روا رکھا ہے۔ خدا تمھیں بھی (قیامت کی) پیاس کے دن پانی کے قطروں کو ترسائے، اگر تم اس وقت کا رویہ چھوڑ کر اس سے توبہ نہیں کرتے ہو"[1]

یہ سب باتیں چھوڑیئے کیا اس بات کا یقین تو یقین، امکان بھی مانا جا سکتا ہے کہ لشکر کا ایک افسر عین میدانِ جنگ میں کھلی غدّاری کر کے "دشمن"[2] کی صفوں کا حصہ بن جائے اور لشکر کا افسر بالا نہ صرف یہ کہ دشمن کی صفوں سے اُسکی تقریر سننے اور اپنے فوجیوں کو سننے دینے کے لئے تیار ہو جائے، بلکہ اسکے جواب میں ایسے الفاظ بھی کہے کہ :-

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳۔ [2] غلط فہمی نہ ہو یہاں "دشمن" کا لفظ ابن زیاد کی فوج کے نقطۂ نظر سے ذرائع احساس کی ترجمانی کے طور پر لکھا ہے۔

”تم جانتے ہو کہ میرے بس میں کچھ نہیں۔ ورنہ میں تو شروع ہی سے اس بات کا حامی اور حریص ہوں کہ حسین کی تین باتوں میں سے کوئی ایک بات مان لی جائے“؟

ظاہر ہے کہ یہ تو عام حالات میں بھی ایک ناقابلِ تصور بات ہے۔ مگر یہاں تو حالات بھی عام قسم کے نہ تھے۔ اسی تاریخ طبری کی روایات کے مطابق یہ صورت حال تھی کہ عمر بن سعد ہر ممکن کوشش کے باوجود کہ اُسے اس مہم پر نہ بھیجا جائے ابن زیاد نے مجبور کر کے بھیجا تھا، پھر جب انہی روایتوں کے مطابق[1] اُس نے حضرت حسین کی طرف سے مصالحت کی پیش کش اور مُس... فارمولا اپنی سفارش کے ساتھ ابن زیاد کو بھیجا تو وہاں سے جواب آیا کہ :-

”میں نے تم کو اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ تم وہاں جا کر اپنی بچت کی راہیں نکالو، حسین کو ڈھیل دو اور بقاء و سلامتی کے خواب دکھاؤ، نہ اس لئے کہ وہاں جا کر اُنکے سفارشی بن بیٹھو، دیکھو اگر حسین اور انکے ساتھی میرا حکم مانتے اور اپنے آپ کو سپرد کر دیتے ہیں تو اُنھیں یہاں بھیج دو، ورنہ اُن پر یلغار کرو اور نہ صرف قتل کرو بلکہ اُن کا مُثلہ کرو (ناک کان کاٹو) اس لئے کہ یہ اسی کے قابل ہیں اور خاص کر حسین قتل ہوں تو اُن کا سینہ اور پشت گھوڑوں سے روندو۔ اسلئے کہ وہ حکومت کے نافرمان، باغی، حریف اور نہایت خطاکار ہیں“[2]

نیز یہ بھی اس سلسلے میں روایت موجود ہے کہ ابن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن کو اس خط کے ساتھ یہ ہدایت دے کر کربلا روانہ کیا کہ اگر عمر بن سعد پھر بھی لیت و لعل کرے تو تم خود کمان تم ہاتھ میں لو اور عمر کا سر کاٹ کر ہمارے پاس بھیج دو۔[3]

چنانچہ جیسا کہ حصین بن عبدالرحمٰن کی روایت میں اوپر گزرا اور اسکے سوا بھی طبری کی متعدد روایتیں یہی بات بتاتی ہیں کہ عمر بن سعد حضرت حسین کی پیش کش قبول کرتے

---

[1] جی ہاں ”انہی روایتوں کے مطابق“ ورنہ آگے جو بات نقل کی جا رہی ہے اِس مصنف کے نزدیک اس کا بیشتر حصہ تو بالکل من گھڑت ہے اور ہو سکتا ہے کہ کُل ہی ہو [2] طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۶ [3] ایضاً

عذر کر کے اُن کے سامنے بس یہی ایک فیصلہ کن بات رکھنے پر مجبور ہوا کہ آپ اپنے آپ کو ابن زیاد کے حکم کے مطابق (جو سرکارِ یزید کی طرف حضرت حسینؓ کے معاملے میں کُلّی (FULLY) مختار بنا دیا گیا تھا) ہمارے حوالے کر دیں۔

کیا کوئی اِمکان اِن حالات میں اِس بات کے سوچے جانے کا ہے کہ اسی عمر بن سعد نے اپنے لشکر کے ایک باغی کی نہ صرف تقریر خود سنی اور اپنے لشکر کو پورے سکون واطمینان سے سننے دی، بلکہ نہایت ندامت کے ساتھ علی الاعلان یہ جواب بھی دیا کہ "میں کیا کروں مجبور ہوں"؟ ہاں یہ بات ہو سکتی تھی جبکہ مان لیا جائے کہ عمر بن سعد کو گرفتاری یا جنگ کے لئے نہیں بلکہ صلح کی گفت وشنید کیلئے بھیجا گیا تھا، مگر ایسی صورت میں ۴-۵ ہزار فوج کی کوئی تُک نہ تھی!

ایک اور روایت اس قصّے کو اور بھی زیادہ ناقابلِ تصور بنانے والی سن لیجئے طبری کی اسی جلد ۳۲۳ پر ہے کہ "عمر بن سعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرمی دور کرنے کیلئے نہر میں گھسے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر کان میں کہا: امیر ابن زیاد نے جویریہ بن بدر تمیمی کو اس ہدایت کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ (عمر) اگر حسین اور اُن کے ساتھیوں سے جنگ نہیں کرتے ہیں تو وہ آپ کی گردن ... عمر نے یہ سنا تو کود کر اپنے گھوڑے کی طرف آئے سوار ہوئے اور گھوڑے ہی پر بیٹھے بیٹھے ہتھیار منگا کر سجائے اور لشکر کو لیکر حسینی قافلے پر پہنچے اور جنگ کی"۔۔۔ ذرا غور کر لیجئے کہ ایک طرف یہ روایتیں اور ایک طرف وہ روایتیں! کیا کوئی بھی صورت دونوں کے بیک وقت درست ہونے کی ہے؟

اور یومِ عاشورہ کی باقی کہانی؟

حیرت مصنّفین مقتلِ حسینؓ یا اُن کے راویوں پر نہیں، جنھوں نے واقعۂ کربلا کو ایک بھرپور رزمیہ داستان کا روپ دینے کے جوش میں اُسکے مُبیّنہ واقعات کے سلسلے

لے جویریہ [illegible] کے بارے میں [illegible] ہے کہ وہ ابن زیاد کا ایک فوجی افسر تھا جیسا کہ مشہور [illegible] [illegible] حضرت [illegible] [illegible] ہے ۔ اس کی روایت [illegible] شخص مخالف فریق سے کوئی تعلق ہی نہ رکھتا تھا۔ [illegible] تھا جو کوفے کی طرف سے آتا ہوا حضرت حسینؓ کو ملا تھا۔

میں امکان اور عدم امکان سے بحث نہیں رکھتی۔ حیرت اپنے مؤرخین پر ہے کہ یہ باہم متضاد
اور مختلف نوع بنوع قسم کی حکایتیں فقط درقلم انھوں نے اپنی کتابوں میں جمع کر دی ہیں۔
جیسے حُرؒ کی تقریر کی یہ روایت ہے ایسے ہی انہی حالات میں جن کی طرف اوپر روایتیں منسوب
کی گئی کتنی ہی روایتیں اور حکایتیں ہمیں حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کی لمبی لمبی
چھوٹی بڑی تقریریں سناتی ہیں۔ دو دو آدمی عمر بن سعد کی گردن مارنے کو حکم دیئے ہوئے موجود
ہیں۔ اور کوئی ان پر شمر جیسا بدنام بھی ہے۔ مگر ابن سعد ہیں کہ نہ صرف حسینؓ کے خلاف تلوار اُٹھانے
میں پس و پیش کر رہے ہیں بلکہ اس طرح دیر لگا رہے ہیں کہ اپنی فوجوں کو وہ تقریریں
سنوا رہے ہیں جو انھیں اُن کے خلاف برآمادہ کرنے کیلئے، دشمنوں کی صفوں سے کی جا رہی
ہیں۔ ہاں شیعی اپنے ائمہ کیلئے معجزات کا ویسے ہی عقیدہ رکھتے ہیں جیسے ہم نبی علیہ السلام
کیلئے۔ وہ اگر ان ناممکنات کے قائل ہیں اور ایک ہی وقت میں متضاد باتوں کے وقوع
کا بیان معتبر سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے وہ بطور معجزۂ امام ان باتوں کا قائل اپنے آپ کو
کر سکتے ہوں گے، مگر جو لوگ جو ان "ائمہ" کے لئے تمام تر احترام کے باوجود کوئی معجزہ
نہیں مانتے وہ کیسے انتہائی درجہ کی ان متضاد روایتوں کو اپنے دل و دماغ یا اپنی کتابوں
میں جگہ دیتے ہیں؟ ان متضاد اور عجیب روایتوں کے جنگل میں تقریباً دس روز پہلے
داخل ہو کر یہ مضمون جس حیرت میں مبتلا ہو تھا آج تک اس حیرت کا کوئی نام
بلکہ اس سے بھی کچھ سوا ہے۔ اب تک یہ معمہ حل نہیں ہو پایا کہ ہمارے مؤرخین نے کیسے
اس جنگل کو اپنی کتابوں میں سجایا ہے؟

حضرت حسینؓ اور اصحاب کی تقریریں

طبری نے روایت بیان کی ہے کہ شمر ابن ذی الجوشن، عبیداللہ بن زیاد کا وہ حکمنامہ
عمر بن سعد کے پاس لیکر آیا (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) جس میں کہا گیا تھا کہ حسینؓ سے

نپٹنے کے معاملے میں فضول وقت مت گنواؤ تمھیں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اُنھیں حراست میں لے کر یہاں آؤ۔ حراست قبول نہیں کرتے تو قتال کر کے قصہ ختم کرو، ورنہ ہم نے شمر کو ہدایت کی ہے وہ لشکر کا چارج تم سے لے لے۔ ابن سعد نے خط دیکھ کر کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ معاملہ تم ہی نے خراب کیا ہے ورنہ ابن زیاد حسین کی پیش کردہ تین صورتوں میں سے کسی ایک کو مان ہی لیتا۔ اور پھر یہ کہہ کر کہ نہیں میں ہی مفوضہ مہم کو انجام دوں گا، اُس نے اُسی وقت فوج کو حملے کیلئے کوچ کا حکم دیدیا۔ یہ محرم ۶۱ھ کی ۹ تاریخ پنجشنبہ کا دن اور عصر کا وقت تھا۔[۱] اس کے بعد بیان ہوا ہے کہ اِن لوگوں سے یہ کہہ کر مہلت (حضرت حسین کی طرف سے) مانگی گئی کہ بھئی یہ تم ایکدم سے چڑھ آئے، ہمیں بتایا تو ہوتا کہ کونے سے ہماری پیش کش نامنظوری ہو گئی ہے۔ بات معقول تھی۔ شمر کو بھی اتفاق کرنا پڑا اور اس قرار داد پر فوج واپس ہو گئی کہ صبح تک آپ لوگ فیصلہ کرلیں۔ صبح کو یا تو سپردگی ہو جائے ورنہ ہم طاقت استعمال کریں گے۔[۲]

حالات کی جو صورت اوپر بیان کی گئی تھی، اس میں ۹ محرم کی شام کو داخل ہونے والے اس نئے عنصر کا بھی اضافہ کر لیجئے جس کا ابھی ذکر کیا جس کی رو سے دشمن ۹ کی شام ہی کو حملہ آور ہونے آ گیا تھا۔ اور بمشکل صبح تک کا وقت دے کر واپس گیا کہ رات میں فیصلہ کرلیں کہ پُرامن سپردگی منظور ہے یا مزاحمت' اور اس پس منظر میں ذرا غور کیجئے کہ کیا یہ بات قابلِ یقین نظر آتی ہے کہ ۱۰ تاریخ کی صبح عمر بن سعد شمر بن ذی الجوشن کے ساتھ (اور اُس عمرو بن الحجاج کے ساتھ جسے ہم روایتوں کے مطابق کچھ ہی دیر بعد رفقائے حسین پر نہر فرات کا راستہ روکتے ہوئے پاتے ہیں) اپنی فوج لئے ہوئے آتا ہے تو نہ یہ پوچھتا ہے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ اور نہ ہی کسی علامت سے یہ نتیجہ اخذ کر کے کہ مزاحمت کا فیصلہ ہے۔[۳]

---

۱ طبری ج ۶ ص ۲۳۶-۲۳۷، ۲ ایضاً ص ۲۳۸، ۳ روایت میں ہے کہ صبح کو جب لشکر حسینی خیموں پر پہنچا تو دیکھا کہ خیموں کے اردگرد آگ روشن ہے جس سے سمجھا جاسکتا تھا کہ مزاحمت کا فیصلہ ہے اور یہ حفاظتی انتظام ہے۔

حملہ آور ہو جاتا ہے، بلکہ اپنی چار[۱] یا پانچ[۲] ہزار فوج ـــ اور شیعہ مصنفین کے مطابق کم از کم بیس[۳] تیس[۴] ہزار فوج[۵] ـــ کے ساتھ آکر "بہتر پیادوں اور تیس سواروں" کے سامنے اسی طرح کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کچھ برابر سرابر کی بات ہو، اور باقاعدہ جنگ ہوتی ہو،[۶] اور پھر اسی صورتِ حال میں حضرت حسینؓ انھیں مخاطب کر کے کچھ فرمانے کیلئے "اونٹنی پر سوار ہو کر تشریف لاتے ہیں[۷]۔ اور انھیں پورا موقع دیا جاتا ہے کہ جو کچھ فرمانا ہو فرمائیں چنانچہ حسب روایت وہ فرماتے ہیں:-

"اے گروہِ مردم، میری بات سنو، جلدی سے کام نہ لو، یہاں تک کہ مجھ پر جو تمھارا حق ہے اس کے ماتحت تم کو نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کروں اور تمھارے سامنے یہ حقیقتِ حال بیان کر دوں کہ میں تمھاری جانب کیوں آیا۔ اگر تم نے میرے بیان کو صحیح سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمھاری خوش قسمتی ہو گی۔ اور تمھیں معلوم ہو گا کہ تمھیں میری مخالفت کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اگر تم نے میرے بیان کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو شوق سے مجتمع کر لو اپنی طاقتوں کو اور اکٹھا[۸] کر لو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں میں سے اور کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھو۔ پھر پوری طاقت سے بغیر ایک دم کی بھی مہلت دیئے ہوئے میرا خاتمہ کر دو۔ میرے لئے وہ پروردگار کافی ہے جس نے قرآن کو نازل کیا۔ اور وہی اپنے نیک اعمال بندوں کا مددگار ہے۔"

راوی کہتا ہے کہ حضرت حسین کے یہ ارشادات جب (خیموں میں) اُن کی بہنوں اور بیٹیوں نے سنے تو وہ چیخیں چلّائیں اور روئیں، اور اُن کی آواز بلند ہو کر باہر پہنچی تو آپ نے

---

[۱] شہید انسانیت از قبلہ علی نقی صاحب لکھنوی ص ۲۷ [۲] کوئی بھی حکومت اپنے باغیوں کے ساتھ حتی الامکان برابر کے حریفوں والا معاملہ نہیں کیا کرتی [۳] طبری ج ۶ ص ۲۴۲

اپنے بھائی عباس اور اپنے بیٹے علی کو بھیجا کہ جاؤ انھیں چپ کراؤ۔ کس قدر یہ لوگ رو رہی ہیں"
پھر جب وہ چپ ہوگئیں۔ تب آپ نے از سرنو حمد و ثنا سے تقریر شروع کی اور فرمایا:-

• ذرا تم میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں۔ پھر اپنے گریبانوں میں منھ ڈالو اور غور کرو کہ کیا تمھارے لئے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمھارے نبی کا نواسہ نہیں ہوں، اور اُن کے وصی اور اُن کے چچا زاد بھائی اور اُن پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور اُن کی تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا حمزہ سید الشہداء میرے باپ کے چچا اور جعفر طیار خود میرے چچا نہیں تھے، کیا یہ حدیث جو زبان زد خلائق ہے تمھارے کانوں تک نہیں پہنچی کہ حضرت رسول خدا نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ "یہ دونوں جوانانِ اہلِ جنّت کے سردار ہیں"؟ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو۔ اور حقیقتہً وہ سچ ہی ہے (اس لئے کہ میں نے جب سے یہ جانا کہ اللہ جھوٹ بولنے والے سے ناراض ہوتا اور خود اس کا جھوٹ بھی اُسے نقصان دیتا ہے، تب سے میں نے کبھی جھوٹ کا ارادہ نہیں کیا) پھر تو کوئی بات نہیں۔ اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ایسے اشخاص ہیں جن سے اگر تم پوچھو تو وہ بتلا دیں گے۔ پوچھ لو جابر بن عبداللہ سے، ابوسعید خُدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے وہ تمھیں بتلائیں گے کہ انھوں نے رسالت مآب سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے، پھر کیا یہ تمھیں میری خونریزی سے روکنے کیلئے کافی نہیں ہے؟"

راوی کہتا ہے کہ "اس موقع پر شمر آپ کا قطع کلام کرتے ہوئے بولا کہ میں خدا کی تابعداری کنارے پہ کھڑے ہو کر کرنے والوں میں سے (یعنی منافقوں میں سے) ہوں، اگر ذرا بھی

سمجھا ہوں کہ تم کہہ کیا رہے ہو" حبیب بن مظاہر، یکے از رفقائے حضرت حسینؓ نے جواب میں کہا کہ واللہ میں تو سمجھتا ہوں کہ تو اللہ کی تابعداری ایک کنارے پر نہیں، ستر کناروں پر کھڑے ہو کر کرتا ہے (یعنی پرلے درجے کا منافق ہے) اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہہ رہا ہے کہ تیری سمجھ میں حضرت کی بات ذرا بھی نہیں آرہی۔ کیونکہ اللہ نے تیرے دل پر مہر لگادی ہے"
اس کے بعد حضرت حسین نے سلسلۂ تقریر دوبارہ جاری کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر تمہیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمہارے رسول کا نواسہ ہوں۔ اور خدا کی قسم مشرق سے مغرب تک کوئی بھی رسول خدا کا نواسہ میرے سوا موجود نہیں ہے، نہ تم میں اور نہ تمہارے سوا کسی دوسری قوم میں۔ بس میں ہی ایک تمہارے نبی کا نواسہ ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تم کیوں میرے درپے ہو؟ کیا کسی مقتول کا بدلہ لینے کو، جس کو میں نے قتل کیا ہے؟ یا کسی مال کے سلسلے میں جس کو میں نے تلف کر دیا ہے یا کسی کو زخم لگایا ہے جس کا قصاص مطلوب ہے؟"

راوی کہتا ہے کہ "کوئی جواب کسی طرف سے نہیں ملا" تو آپ نے نام لے لے کر اُن میں سے بعض کو مخاطب کیا:۔

"اے شَبَث ابن ربعی، اے حجاز بن اَبجر، اے قیس بن اَشعث، اے یزید بن حارث: کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ "باغات میں بہار ہے، کھیتیاں سرسبز ہیں۔ چشمے ابل رہے ہیں اور مسلح لشکر آپ کی پذیرائی کو چشم براہ ہیں۔ پس قدم رنجہ فرمایئے؟" ان لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں ہم نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔ یہ سن کر ارشاد ہوا۔ اللہ اکبر، اتنا بڑا جھوٹ! قسم ہے خدا کی تم نے لکھا تھا!"

اس کے بعد آپ نے فرمایا:۔

"اے لوگو اگر تمہیں میرا آنا ناپسند ہے تو مجھے چھوڑ دو کہ روئے زمین پر جہاں کہیں اپنے لئے امن و امان کی جا سمجھوں چلا جاؤں۔ اس پر قیس بن اشعث نے کہا کہ آپ اپنے بنی عم" کا حکم کیوں نہیں مان لیتے؟ آپ کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ جو آپ چاہیں گے آپ کے ساتھ وہی ہوگا، حضرت نے فرمایا: تم اپنے بھائی ـــ محمد بن اشعث ـــ کے بھائی ہی تو ہو۔ کیا تمھاری خواہش ہے کہ بنو ہاشم تم پر مسلم بن عقیل کے علاوہ کسی دوسرے خون کا بھی دعویٰ کریں[1]، نہیں خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں نہیں دوں گا اور نہ غلاموں جیسے اقرار تمھارے آگے کروں گا۔ اے لوگو میں تمہارے رب کی اور اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو، اور میں پناہ مانگتا ہوں ہر متکبر سے جسے یوم حساب پر ایمان نہیں"۔

راوی کہتا ہے" اس کے بعد آپ نے اونٹنی کو بٹھایا۔ اُترے اور عُقبہ بن سمعان (غلام) کو حکم دیا کہ باندھ آئے اور اب دشمن آپ کی طرف بڑھنے لگا[2]"۔

حضرت حسین کی یہ مبیّنہ تقریر اس سوال پر غور کرنے کیلئے من وعن نقل کی گئی ہے کہ جب امیر لشکر عمر بن سعد کو اتنے سخت احکام ہوں جیسے کہ اوپر طبری کی روایتوں سے نقل کئے گئے۔ دو دو آدمی ان روایتوں کے مطابق، ان تاکیدی احکام کے ساتھ یہ ہدایت دے کر بھیجے گئے ہوں کہ اگر عمر حسین کو ڈھیل دینے اور معاملے کو طُول دینے کی روش سے باز نہ آئے تو اُس کی گردن کاٹ کے ہمارے پاس بھیجدی جائے' اور معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے'کیا اس سب کے باوجود (اور مزید اسکے باوجود کہ ایک شب کی جو آخری مہلت

---

[1] مسلم بن عقیل کے واقعہ میں گزر چکا ہے کہ اُن کی گرفتاری محمد بن اشعث کے ذریعہ ہوئی تھی۔

[2] طبری ج ۶ ص ۲۴۲-۲۴۳ حضرت حسین کی تقریر کے آغاز سے یہاں تک اقتباسات کے ترجمے میں اپنی سہولت کی خاطر ہم نے قبلہ نقوی صاحب کے ترجمے سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن کلیۃً انحصار نہیں کیا گیا۔

حضرت حسین کو ۹ر کی شام کو دی گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور اُن کی طرف سے سر تسلیم خم کرنیکی بات سامنے نہیں آئی) یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ۱۰ر کی صبح کو عمر بن سعد اپنا لشکر لیکر خیام حسینی پر آئے تو بجائے اسکے کہ فوراً کوفے کے احکام کی تعمیل شروع کرے وہ حضرت حسین کو موقع دیتا ہے کہ اُسکے ساتھیوں میں اپنے ایک طویل خطاب کے ذریعے کوفے اور دمشق کی حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کریں؟ یقیناً یہ قابل تصور بھی نہیں ہے چہ جائیکہ بطور واقعہ پیش آئی ہو۔ ہاں کوئی حضرت حسین کیلئے معجزہ کی قدرت کا قائل ہو تو اُسکے لئے شاید یہ بات قابل تصور ہو سکتی ہو۔

معاملہ کا ایک اور پہلو

اس سوال سے قطع نظر جس کی بنیاد تقریر کے ماحول اور موقع و محل پر رکھی گئی ہے اور اسی موقع و محل کے پیش نظر ہم مجبور ہوئے ہیں کہ اس تقریر کی واقعیت میں کلام کریں (اس سے قطع نظر) تقریر میں واقعی شہادتیں بھی اس بات کی صاف نظر آرہی ہیں کہ یہ واقعہ نہیں بلکہ لوگوں کی تخیلی قوت کا کرشمہ ہے۔ عہد نامۂ جدید کی انجیل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تختۂ دار پر چڑھا ہوا دکھاتی ہے وہ آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمہ شکایت اور جزع و فزع کہلواتی ہے کہ :-

ایلی ایلی لما سبقتنی۔ اے میرے اللہ اے میرے اللہ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے؟

اسلامی ذہن کی رو سے یہ کیسا داغ ہے جو اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے دامنِ صبر و رضا پہ لگایا گیا ہے مگر حضرت حسین کی طرف مذکورۂ بالا تقریر منسوب کرنے والوں نے اُن سے کہیں زیادہ بڑا داغ نواسۂ رسولؐ کے دامنِ عزّ و شرف کو لگایا ہے۔ اہلِ انجیل نے پیغمبر کو بہر حال صرف خدا ہی کے سامنے رُلایا اور اُس سے شکوہ کرایا ہے، مگر ان لوگوں نے ــــ

پتہ نہیں یہ کس سطح کے لوگ تھے؟ — حضرت حسین کو اُن غدّار کوفیوں اور ابن زیاد کے کاسہ لیسوں کے آگے ہر ہر رُخ سے اور ہر ہر رنگ میں جان کی امان مانگتے دکھایا ہے جن کی طرف رُخ کرنے کی اجازت بھی غیرت کے قانون میں نظر نہیں آتی۔ اور یہ تو عام قانونِ غیرت کی بات ہے یہاں تو معاملہ ریحانۃ الرسولؐ کی غیرت کا اور ہاشمی خون کی غیرت کا ہے۔

وہ مرتبہ ناشناس اور زمانہ ساز جنھوں نے کل آپ کے بڑے بھائی حضرت حسن مجتبیٰؑ کو رنج دینے اور رسوا کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور جو آج چند ٹکوں یا چھوٹے بڑے مرتبوں کی خاطر آپ کا خون بہانے کو...... لشکر اعداء میں شامل ہو گئے تھے، جن میں شمر جیسے زبان دراز بھی تھے جس نے ابھی ابھی آپ کے خیموں کے گرد آگ کے الاؤ دیکھ کر پکارا تھا:۔

یا حسین استعجلت النار فی	او حسین یہ آگ کی ایسی جلدی کہ قیامت
الدنیا قبل یوم القیامۃ۔	سے پہلے دنیا ہی میں اس کا بندوبست کر لیا؟

ان بد نہادوں اور مسخ فطرتوں کے سامنے آپ واسطہ دیتے اٹھے اپنی نسبی عظمتوں کا! نواسۂ رسولؐ ہونے کا! ابن فاطمہ بنت الرسولؐ ہونے کا! ابن علی مرتضیٰ وصیٔ رسول ہونے کا! حضرت حمزہ سید الشہداء سے اپنی قرابت کا اور جعفر طیار سے رشتے کا! کیا واقعی یہ باتیں کسی ایسے آدمی کیلئے قابل تصور ہیں جو سچ مچ حضرت حسین کا کچھ مرتبہ سمجھنے کے قابل ہو؟ اور ایسے واسطے دینا تو کسی بھی حالت میں حضرت حسین جیسے مرتبہ کے انسان کیلئے موزوں بات نہیں ہو سکتی۔ بہت کم شعور اور کم حیثیت لوگ ایسے واسطوں کا استعمال کرتے ہیں۔

آگے آیئے۔ تعزیہ کے اس حصّے پر وہی شمر ایک بار پھر زبان درازی کا مظاہرہ کرتا ہوا خالص بولہبی لہجے میں کہتا ہے۔ ؎

سمجھ میں کچھ نہیں آیا یہ تم نے کیا سنایا تھا

مگر افسوس کہ یہ خطابِ حسینی کے مصنّف اس کے بعد حضرت والا کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ

چلو تمھیں میرے اور میرے بھائی کے بارے میں جوانانِ جنت کی سرداری والی حدیث کی صحت کا یقین نہیں تو کیا یہ بھی تمھارے لئے ممکن ہے کہ میرے نواسۂ رسولؐ ہونے میں شک ظاہر کرو؟ کیا مشرق و مغرب میں اِک میرے سوا کوئی اور ہے جسے نواسۂ رسول ہونے کا دعویٰ ہو؟ کُل روئے زمین پر میں تنہا ہوں جو اس شرف کے ساتھ مشرف ہو۔ بتاؤ اس کے باوجود تم کیسے میرے خون کے پیاسے ہو؟

اور ابھی بس کہاں؟ وہ شبث بن ربعی، و حجار بن ابجر و قیس بن اشعث اور یزید بن حارث جن کے دستخطی خط حضرت والا کی تحویل میں موجود تھے جن میں بڑے تپاک سے کوفے میں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ چاروں اپنی بے غیرتیوں کے ساتھ صفِ اعداء میں اپنے اپنے قبیلوں کی کمانیں سنبھالے کھڑے تھے حضرت حسینؓ کو ان بے غیرتوں سے بھی تو نام بنام مخاطب ہو کر ان کے خطوط یاد دلاتے دکھایا گیا ہے ۔۔۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔۔۔ پتہ نہیں یہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس طرح دانستہ یا نادانستہ سبطِ رسول کی رسوائی کا سامان کیا ہے؟

اور یاں وہ خواتین خانوادۂ نبوت جن کے ذکر کے ساتھ ساتھ صبر و ضبط اور عزیمت و خودداری کی صفات تصور میں آتی ہیں۔ وہ نقش فاطمی ذہن پر اُبھرتا ہے جو میدانِ اُحد میں قائم ہوا تھا کہ سیدۂ فاطمہ کسی آہ و بکا کے بجائے اپنے والد ماجد (رسول اللہ) کے آقائے نامدار کی مرہم پٹی کا حوصلہ دکھا رہی اور دوسروں کا حوصلہ بڑھا رہی ہیں۔ اور پھر عائشہ صدیقہؓ کا وہ نقش کہ زخموں کو دھونے اور زخمیوں کو پانی پلانے کیلئے مشک اٹھائے دوڑ رہی ہیں۔ ان صفات کی جگہ پر ہمیں یہ کربلا میں خطابِ حسینی کا قصہ سنانے والے بتاتے ہیں کہ ابھی تو ابھی لڑائی نہیں ہوئی۔ کوئی معرکہ ہوا نہیں۔ کوئی خون نہیں، کوئی زخم نہیں۔ فقط ایک جملہ حضرت حسینؓ کی زبان سے ابتدائے تقریر میں نکلا کہ اگر تم نہیں مانتے تو پھر ایک دم کی بھی مہلت

لے طبری ج ۶ ص ۱۹۲ ان لوگوں کے خط ورنامے کا ذکر ہو دو، جو گزرے ۔۔۔ [illegible]

دیئے بغیر پوری طاقت سے اُٹھو اور میرا خاتمہ کردو بس اتنا سننا تھا کہ خانوادۂ نبوّت کے خیمے ماتم کدے بن گئے۔ اور آہ و بکا کا وہ شور برپا ہوا کہ حضرت کو تقریر روک دینا پڑی۔

حقیقت (کم از کم راقم کے نزدیک) یہ ہے کہ پوری تقریر اور اسکے درمیانی قصّے گویا کہے ہی اس نقطۂ نظر سے گئے ہیں کہ واقعۂ کربلا کے نام پر ایک ماتمی فضا پیدا کرنے میں مدد مل سکے ورنہ ظاہر ہے کہ واقعیت سے اِن کا دور دور بھی کوئی تعلق نہیں، نہ ہو سکتا ہے۔ واقعیت اگر ہے تو اُس دعا میں ضرور نظر آتی ہے، جو تقریر والی روایت سے متصلاً پہلے کی روایت میں[1] طبری نے دی ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب (۱۰ کی) صبح کو دشمن کا لشکر آپہنچا تو حسینؓ نے دعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے اور (یوں بارگاہِ احدی میں) عرض کناں ہوئے:۔

"خداوندا تو ہی میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں، میرا قبلۂ امید ہے ہر کلفت میں، اور تجھ ہی پر ہر مہم میں جو مجھے درپیش ہو میرا بھروسہ ہے، کتنے ہی حالات ایسے ہیں جن کے مقابلے میں دل کمزور پڑ جاتا ہے۔ اور تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں، دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے اور دشمن طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں، میں ان حالات کو تیرے حضور میں پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں فریاد کیا کرتا ہوں اس لئے کہ تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لَو لگانا میں جانتا نہیں پس تو حالات کی تکلیف اور اُن کی ناسازگاری کو دور کرتا اور راہ نکالتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک ہر بھلائی کا سرچشمہ اور ہر امید کا مرکز ہے۔"

یہ دعا اگر معیارِ روایت کے اعتبار سے کوئی کمزوری نہیں رکھتی تو اسکی واقعیت تسلیم کرنے میں ذرا بھی اشکال نہیں۔ کیونکہ تقریر کے برعکس موقع و محل کا عین تقاضہ ہے اور حضرت حسینؓ سے پورے طور پر متوقع اور اُن کے شایانِ شان ہے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۱-۲۲۲

زُہیر بن قین کی تقریر

دو تقریریں جو اوپر درج ہو گئیں، ایک حُرؓ بن یزید کی اور ایک خود حضرت حسینؓ کی ان میں سے کسی ایک کے لئے بھی اس ماحول اور صورت حال میں جو کربلا کے سلسلے کی روایتیں بنا تی آ رہی تھیں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہاں تو ایسی تقریروں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ لگتا ہے کہ معرکۂ کارزار نہیں ہے یہ عکاظ تھا۔ طوالت ہوئی جاتی ہے مگر ایک تقریر اور سن لیجئے۔ یہ زُہیر بن قَین نام کے ایک ساتھی ہیں۔ اور اُن کی بھی کچھ ایسی اہمیت ہے جیسی حُرؓ بن یزید کی۔ ایک ایسا شخص اس تقریر کا راوی بتایا گیا ہے جو ابن زیاد کی فوج میں شامل تھا۔ یہ کہتا ہے کہ (حضرت حسینؓ تقریر کے بعد پیچھے ہٹے اور) ہم آگے بڑھے تو زہیر بن قین نکل کر آئے۔ گھوڑے پر سوار اور اسلحہ سے لیس تھے انھوں نے ہمیں مخاطب کر کے کہا کہ :-

"کوفے والو، خبردار، خدا کے عذاب سے خبردار ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان بھائی کا حق ہے کہ اُسکی خیر خواہی کرے۔ ہم لوگ اس وقت بھائی بھائی ہیں، ایک دین اور ایک ملت پر ہیں، جب تک ہمارے درمیان تلوار نہیں چلنے لگتی، ہاں اگر تلوار چل گئی تو پھر یہ رشتہ خود بخود کٹ جائے گا اور تم الگ اور ہم الگ ملت ہو جائیں گے۔ دیکھو ہمیں تمہیں اللہ نے ذریت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آزمایا ہے تاکہ دیکھے کہ ہم تم کیا کرتے ہیں۔ سو ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ اُنکی مدد کرو اور سرکش عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ اس لئے کہ تمہیں اِن دونوں کی حکومت سے سوائے دکھ اور رنج کے اور کچھ نہ ملے گا وہ تمھاری آنکھوں میں سلائیاں پھروانے، تمھارے ہاتھ پاؤں قطع کراتے، تم کو سولیاں دلواتے، اور تمھارے نیک اعمال قُرّاء اور عمائد مثلاً حُجر بن عدی اور اُن کے

اصحاب اور ہانی بن عروہ وغیرہ کو قتل کراتے رہے"۔

راوی کہتا ہے کہ اس پر ہماری طرف والوں نے زُہیر کو بُرا بھلا کہا اور عبیداللہ بن زیاد کی تعریفیں کیں اور کہا کہ ہم تمھیں اور تمھارے صاحب (حضرت حسین) اور انکے سب ساتھ والوں کو اسکے بغیر نہیں چھوڑیں گے کہ یا قتل کریں اور یا گرفتار کر کے عبیداللہ بن زیاد کے پاس روانہ کریں۔ اس پر زُہیر پھر عرض پرداز ہوئے کہ:۔

"اے اللہ کے بندو فاطمہ رضوان اللہ علیہا کی اولاد سمیّہ کی اولاد کے مقابلے میں تمھاری محبت اور مدد کی زیادہ حقدار ہے۔ اور اگر تم مدد نہیں کر سکتے تو میں تمھارے لئے اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم اُن کو قتل کرو تم اس شخص (حسینؓ) کے اور اُسکے چچازاد یزید بن معاویہ کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ قسم میری جان کی۔ یزید کیلئے تمھاری اطاعت کو قتل حسین کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اسکے بغیر بھی تمھاری اطاعت پر راضی رہے گا"[1]

ایک خاص نکتہ

اوّل صورت حال اور موقع و محل کے اس نکتے کے علاوہ جسکی بنا پر ہمارے لئے یہ بات مشکل ہو رہا ہے کہ فی الواقع یہ تقریریں میدان کربلا میں ہوئی تھیں۔ زُہیر بن قین کی تقریر کے بارے میں خاص طور سے یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ اس میں جو کچھ لعنت و ملامت کوفیوں کو ہے اور جو کچھ اپیل اور فہمائش کے حیلے میں اُن سب کی بنیاد بس یہ ہے کہ حضرت حسین اور اُن کے اہلِ خانہ اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ذرّیتِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حالانکہ ان صاحب کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں عثمانی گروہ کے تھے اور اس لئے اتفاق سے حج سے واپسی میں حضرت حسین کے قافلے کا ساتھ ہو گیا تو منازل پر فاصلے سے اپنا خیمہ لگاتے

۱؎ طبری ج ۶ ص ۲۴۳

اور حضرت حسین کے سائے سے بھی بچنا چاہتے تھے[1]۔ مگر حضرت حسینؑ کے اس سفر کے حالات میں آتا ہے کہ وہ راستے کے تقریباً ہر اہم آدمی کو بالخصوص جس کا کوفے سے تعلق تھا، اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک دفعہ ان کو بلا بھیجا تو اُن کی بیوی نے شرم دلا کر کہ بہر حال ابن بنت رسول اللہ ہیں آپ کو اُن کی دعوت پر جانا چاہیے اُن کو خیمہ حسینی میں جانے پر مجبور ہی کر دیا اور پھر وہ آپ کی طرف سے آپ کی مہم میں رفاقت کی دعوت بھی ردّ نہ کر سکے اور جان و دل سے ساتھ ہو گئے۔ بہر حال ایک عثمانی الاصل آدمی بھی صرف اسی "ذرّیت محمدؐ" اور "ابن بنت رسول اللہ" کے حوالے سے یزیدی کوفیوں کو لعنت و ملامت یا اُن سے اپیل کرے یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ بے شک یہ بھی ایک مناسب عنوان اور حوالہ تھا۔ مگر اسی پر انحصار اور صرف اسی حوالے سے حضرت حسین اور ان کے اہل خانہ کی عظمت اور ان کا حق پہچاننا۔ ابن زیاد کے مقابلے میں اُن کیلئے صرف اسی حوالے کو وجہ ترجیح بنانا یہ تو شیعیت کا مزاج ہے۔ اور اس لئے علاوہ حالات اور حوالے بتانے کے جس طرح حضرت حسین کی تقریریں بعض اور پہلو بھی اس تقریر کو غیر واقعی اور جعلی قرار دینے والے اور اسی کے ساتھ اس جعلسازی کی بنا بھی سامنے لانے والے ہیں۔ اسی طرح زُہیر بن قین کی تقریر کا یہ پہلو بھی اس کی غیر واقعیت کو ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس جعلی کارروائی کے پیچھے کام کرنے والے اس نقطۂ نظر کو بھی صاف سامنے لے آتا ہے کہ اس طرح کی تقریریں اگر حضرت حسین کی موجودگی میں عثمانی الاصل لوگوں کی زبان سے ادا کرا دی جائیں تو شیعی تصوّرات اور طرز فکر کو ایک اساس اور بنیاد ملتی ہے[2]۔

---

[1] یہ بھی نہیں سمجھ میں آتا کہ ان کو منزل بمنزل ساتھ چلنے کی ضرورت کیا تھی تو پھر ساتھ چلنا کو بھی دور رہتے ہم منزل پڑاؤ تھا یہ اس وقت کو کم از کم ایک دو منزل کا فاصلہ بھی تو رکھ سکتے تھے!

[2] مجھے ان نتائج سے انکار نہیں ہے کہ محرک عثمانی نہ تھے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

سبھی کچھ تصنیف

جس طرح یہ تقریریں بول رہی ہیں کہ میدان کربلا میں ہوئی نہیں بلکہ بعد میں تصنیف کی گئی ہیں اسی طرح ـــ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا تھا ـــ یوم عاشور کی تقریباً پوری کہانی کا یہی حال نظر آتا ہے۔ مثلاً۔

(۱) مُبارزانہ جنگ[۱] کے قصّے

تقریروں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے تو مُبارزطلبی[۲] شروع ہو جاتی ہے اور عمر بن سعد جو ابن زیاد کی ساری تنبیہات کے خلاف اِن حضرات کو تقریریں کر کے اس کے اپنے کیمپ میں بغاوت کی آگ بھڑکانے اور بے یقینی اور بے دلی پھیلانے کا پہلے ہی کافی موقع دے چکا تھا۔ تقریروں کے بعد حُر بن یزید کے حملہ آور ہوتے اور دو آدمی بھی اپنی صف کے اُسکے ہاتھوں مارے جانے کے باوجود ابن زیاد کے انتہائی سخت احکام کی تعمیل میں بھر پور یلغار کر کے قصہ ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ صف حسینی سے جو مبارزانہ جنگ کا سلسلہ اب شروع ہوتا ہے، جو غیر معمولی قلّت تعداد کی بنا پر اس صف کیلئے مناسب ترین اور پسندیدہ ترین صورت جنگ ہو سکتی تھی، تو وہ اس میں بھی ان کی معاونت شروع کر دیتا ہے۔ اور شمر جو اپنی آمد کے بعد سے برابر اپنی موجودگی کا اظہار طرح طرح سے کر رہا ہے، ابن سعد کی اس بے عملی کے معاملے میں وہ ذرا بھی باعمل نظر نہیں آتا۔ حالانکہ وہ بھیجا صرف اسی لئے گیا ہے کہ ابن سعد کی سست روی اور بے عملی کا سلسلہ روک دے ـ پس یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات کہ وہاں جنگ مبارزانہ ہوئی ہوگی؟

---

[۱] ایک صف سے ایک سورما نکل کر پکارتا ہے کہ کوئی اسکے مقابلے کو آئے۔ اس طرح دونوں صفوں سے ایک ایک آدمی نکل کر لڑتا ہے۔ [۲] مقابل کو پکارنا۔

(ب) صبح سے سہ پہر تک کے معرکے

ابن زیاد کے سخت احکام کی اور شمر "جیسے حسین دشمن" کو تعمیل احکام کیلئے مسلط کئے جانے کی روایتیں جس طرح اس بات کو باور کرنے کی اجازت نہیں دیتیں کہ کربلا میں مبارزانہ جنگ کا سلسلہ چلا ہوگا.........................

...........................اسی طرح یہی روایتیں

اور لشکر ابن سعد کی تعداد والی روایتیں (کہ کم سے کم ۴ - ۵ ہزار ورنہ شیعہ مآخذ کے مطابق کم سے کم تیس[۳۰] چالیس[۴۰] ہزار) اس بات کا تصور مشکل بناتی ہیں کہ اس لشکر نے قافلۂ حسینی کو کوئی باقاعدہ جنگ کرنے کا موقع دیا ہوگا۔ یہ CASE (معاملہ) کسی جنگ کا تھا ہی نہیں، مزاحمت اور مزاحمت کو توڑنے کا کیس تھا، ابن سعد کی اُس نفسیاتی کیفیت کو دیکھتے ہوئے جس کی گواہی قصے کی تمام روایتیں دے رہی ہیں کہ ایک طرف ابن زیاد کی فرمانبرداری بھی منظور تھی دوسری طرف حضرت حسین کی سلامتی بھی عزیز (اس کیفیت میں اور کم از کم بیس[۲۰] پچیس[۲۵] گنا زیادہ نفری کے ساتھ) واقعۂ کربلا کی اسکے سوا کوئی اور صورت ازروئے عقل و عادت نہیں ہونی چاہئے تھی کہ ابن سعد کی طرف سے ان لوگوں کو گھیر کر اور بے قابو کر کے زیادہ سے زیادہ تعداد میں سلامتی کے ساتھ گرفتار کر لینے کی کوشش ہوتی اور اُدھر سے مزاحمت۔ یہ مزاحمت طاقتور ہوتی، اور بظاہر ہونی ہی چاہئے تھی، تو ابن سعد کی کوشش ناکام ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ تعداد اپنی مزاحمت پر قربان ہو جاتی۔ لیکن اس میں صبح سے سہ پہر تک کا وقت لگ جاتا۔ اور باقاعدہ دو لشکروں کے درمیان جنگ کی صورت بنتی (جیسا کہ روایتیں کہتی ہیں، اور مجالس عزا میں دہرایا جاتا ہے) یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات تو ہے نہیں۔ بظاہر یہ بیان واقعہ کے بجائے واقعہ کی اُسی طرح کی ایک مبالغہ آمیز اور انتہاپسندانہ تعبیر ہے جس طرح کی دوسری انتہاپسندانہ تعبیر ایک روایت میں یوں پائی جاتی

ہے کہ ابن زیاد نے جس شخص، زحر بن قیس کو حضرت حسین کا سر لے کر یزید کے پاس بھیجا، اس نے یزید کے پاس پہنچ کر کہا کہ :-

ابشر یا امیر المؤمنین بفتح
الله نصره وَرَدَ علینا الحسین
بن علی فی ثمانیة عشر مـــن
اهل بیتهم وستین من شیعتهم
فسرنا الیهم فسألناهـــم أن
یستسلموا وینزلوا علی حکم الامیر
عبید الله بن زیاد او القتـــال
فاختاروا القتال علی الاستسلام
فعدونا علیهم مع شروق الشمس
فاحطنا بهم من کُلّ ناحیـــة
حتیٰ اذا اخذت السیوف
مأخذها من هام القوم
یهربون الی غیر وَزَر ویلوذون
مِنّا بالآکام والحفر لواذاً کما
لاذ الحمائم من صقر فوالله
یا امیر المؤمنین ما کان الاجزر
جزورٍ او نومة قائلٍ حتّیٰ
اتینا علیٰ آخرهم.....[1]

امیر المؤمنین مژدہ ہو، اللہ کی طرف سے
فتح و نصرت کا، حسین بن علی اپنے
اٹھارہ گھر والوں اور ساٹھ شیعوں
کے ساتھ آ پہنچے تھے۔ (اس خبر پر)
ہم لوگ اُن کی طرف چلے اور ہم نے
مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے سپرد کر کے
امیر عبید اللہ بن زیاد کے فیصلے پر چھوڑ دیں
ورنہ قتال کیلئے تیار ہوں۔ ان لوگوں نے
قتال پسند کیا، نتیجہ میں ہم نے سورج نکلتے ہی
اُن پر چڑھائی کی اور ہر طرف سے
گھیر لیا، حتیٰ کہ جب تلوار وں نے ان کی
کھوپڑیوں پر کام شروع کیا تو جدھر منہ
اُٹھا بھاگ پڑے، کہیں ٹیلوں کی کہیں
گڑھوں کی پناہ ڈھونڈنے لگے جیسے کہ
کبوتر شکرے کے سامنے کیا کرتے ہیں، بس
اے امیر المؤمنین قسم ہے خدا کی ہمیں
اُن کا خاتمہ کرنے میں اس سے زیادہ
وقت نہیں لگا جتنا ایک قصاب کو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۴

ایک اونٹ ذبح کرنے میں یا دوپہر کو کسی
شخص کے قیلولہ کرنے میں لگتا ہے۔

لمبے وقت کے دامن میں لپٹے قصّے

لمبا وقت لگنے کی روایتیں جب ناقابلِ اعتبار اور ناقابلِ قبول ٹھہر جاتی ہیں تو پھر اس لمبے وقت کے دامن پر جو اور بہت سی کہانیاں ٹانک دی گئی تھیں وہ بھی کسی اعتبار کے لائق کہاں رہ جاتی ہیں؟ انہی کہانیوں میں فرزندانِ اہلِ بیت کی لاشوں کا ایک کے بعد ایک کر کے تڑپنا، حضرت حسین کا اُن کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا۔ رنج والم کے کلمات سے اُنھیں آخرت کے لئے رخصت کرنا۔ یا ایک طرف کو لا کے لٹانا۔ حضرت زینب کبریٰ کا روتے تڑپتے بار بار میدانِ جنگ میں نکل آنا۔ وغیرہ وغیرہ

یہ ساری کہانیاں، جن میں سے کتنی ہی ایسی ہیں جو دراصل حضرت حسین کی ثنا کو داغ لگاتی ہیں، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس سبائی ذہن کے ماتحت گڑھی گئی ہیں جو برابر فرزندانِ اسلام کی "متاعِ دین و دانش" لوٹ لینے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ اور اُسے نواسۂ رسول کی مظلومیت کے نام پر ایک ہوش رُبا قسم کی جذباتی فضا پیدا کر دینے میں اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا بہترین سامان نظر آیا۔ اور وہ اپنے اس حربے اور مقصد میں خوب خوب کامیاب رہا۔ اسلام کے ناواقف اور ضعیف العقیدہ فرزندوں کی ایک بڑی تعداد اس حربے کا شکار ہو کر اسلام کی شاہراہ (یا MAIN STREAM) سے ہٹ گئی۔ اور بالکل ایک اجنبی راہ پر "اسلام" ہی کے بلکہ "اصل اسلام" کے نام سے لگ گئی۔ آج جو لوگ اس مذہب ماتمِ حسین کے پیرو ہیں یقین ہے کہ وہ اپنے دلوں سے اسلام دوست ہیں، اس مذہب کے اصل بانیوں[1]

---

[1] عبداللہ ابن سبا وغیرہ۔

کی طرح چھپے دشمن نہیں مگر "صیّاد[1] کے اقبال" کا بھی کیا "سحر" ہے کہ اُن کے "صید[2]" کی یہ موجودہ نسل بھی (جو ہماری ہم عصر ہے) اپنی "قید" کی جان و دل سے حفاظت کرنا چاہتی ہے[3]، اور اسی مذہب والوں کا کیا، ہر شخص جس مذہب کے ماحول میں پیدا ہو گیا ہے، بے سوچے سمجھے، بلکہ سوچ سمجھ کی دعوت سے (اِلّا ما شاء اللہ) دشمنی کرتے ہوئے اُسی مذہب پر جینا اور مرنا چاہتا ہے۔

دامانِ اہلِ بیت کیلئے ننگ

بہر حال آیئے یوم عاشورہ کی وہ کہانیاں دیکھیں جن سے دراصل حضرت حسین کی شان اور عظمت کو دھبہ لگتا ہے۔ دھبہ لگانے کو تو وہ قبل از "جنگ" کی تقریر ہی بہت کافی ہے جو اوپر نقل ہو چکی۔ علی مرتضیٰ شیرِ خدا کا بیٹا اور اُن بے حیاء، غدّار اور پست کردار لوگوں سے جن کا از خود کیا ہوا احسان بھی اہل شرف و عزّت کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اپنے والد ماجد کے نام پر، اپنی والدہ خاتونِ جنّت کے نام پر، اپنے نانا سید الانبیاء کے نام پر اپنے چچا جعفر طیار کے نام پر اور اپنے نانا کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ کے نام پر اپنی جان کی امان مانگے؟ (جیسا کہ وہ تقریر دکھاتی ہے) اور ایک بار نہیں بعنوان بدل بدل کر بار بار مانگے؟ العیاذ باللہ!

اس تقریر میں ننگ و عار کا یہ پہلو ہرگز کوئی ایسا نکتہ نہیں ہے کہ کوئی آکے اُسے کھولے تو لوگوں پر کھُلے۔ بالکل کھُلی ہوئی اور عام آدمی کو محسوس ہونے والی بات ہے مگر اس حد تک عام آدمی کہاں جا سکتا ہے کہ روایت میں کلام کرے۔ اس پہلو کا معاملہ تو وہ حضرت حسین پر چھوڑ دے گا کہ ہو گی کوئی مصلحت، البتہ یہ بات اُس کے دل میں نقش ہو جائے گی کہ حضرت حسین اپنی اصل عظمت یہ سمجھتے تھے کہ وہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے نواسے

---

[1] شکاری [2] شکار [3] طائروں پر سحر ہے صیّاد کے اقبال کا ※ اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

فاطمہ بنت رسول اللہ اور علیؓ وصی رسول اللہ کے بیٹے ہیں۔ اور یہی وہ دوسرے مسلمانوں سے چاہتے تھے کہ انھیں اس نسبی عظمت کی نظر سے دیکھا جائے اور اسی کے مطابق انکے ساتھ معاملہ کیا جائے، اصل اہمیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن کے نسبی رشتے کی ہو، دینی رشتے پر نظر ہو یا نہ ہو، حالانکہ اسلام میں اصل اہمیت تقویٰ اور تدیّن کی ہے، نہ کہ نسل و نسب کی، یہ بات اگر مسلمانوں کے ذہن نشین ہو گئی اور عزت و احترام کے ساتھ قبول کر لی گئی تو سبائی منصوبے کی کامیابی کیلئے پوری بنیاد فراہم ہو گئی[1]۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خلافت و وراثت کو ایک نسبی سلسلہ بنا دینے اور نسب ہی میں ساری عظمتیں جمع کر دینے کا کام اس کے بعد کچھ مشکل نہیں رہ گیا۔ بس یہ فلسفہ ہے جو اس سراپا ننگ و عار تقریر کے پیچھے کام کرتا نظر آ رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہی بیماری جو اس تقریر کے ذریعہ مسلمانوں کے ذہن میں پیوست کرنے کی کوشش کی گئی تھی اسی کو آگے کی ان کہانیوں سے خوب خوب گہرائی میں اُتارنے کی سعی کی گئی ہے کہ آپ اپنے فرزندوں، بھتیجوں، بھانجوں اور بھائیوں کی لاشوں کی طرف دوڑتے ہوئے جاتے اور اس طرح کے کلمات سے اپنے رنج والم اور بے بسی کا اظہار کرتے۔

بعد القوم قتلوك و مَن	ہلاک ہو وہ قوم جس نے مجھے قتل کیا
خصمهم يوم القيامة مِنك جدك[2]	اور جس کے مقابلے میں قیامت کے دن

---

[1] تشیعیت کے سلسلے میں عبداللہ بن سبا کا بنیادی کردار ایک مانا ہوا کردار تھا۔ لیکن طٰہٰ حسین مرحوم نے جب سے یہ تحقیق پیش کی کہ یہ کوئی حقیقی نہیں بلکہ بعض راویوں کی بنائی ہوئی شخصیت ہے تب سے شیعہ اہل قلم بھی ابن سبا کی شخصیت کا انکار کرنے لگے ہیں۔ مگر اس تحقیق پر نکلی ہوئی تنقیدوں نے اس میں کوئی جان نہیں چھوڑی ہے، اس سلسلہ کا ایک مضمون محترمہ ذکیہ سلطانہ کے قلم سے الفرقان بابت، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۹ء میں بھی نکل چکا ہے۔ [2] طبری ج ۶ صـ۲۵۷ یہ کلمات جس موقع سے نقل کئے جا رہے ہیں وہ آپ کے بھتیجے قاسم بن حسنؓ کی شہادت کا موقع ہے۔

تیرے نانا فریق ہوں۔

اسی طرح کسی رفیق کربلا کی جانبازی اور مردانہ کارکردگی پر اُسے شاباش دیتے ہیں،
ان روایتوں کے مطابق یہ الفاظ دیتے ہیں:-

جزاك الله خيرًا عن اهلِ بيت نبيّك۔[1] اللہ تمہیں اپنے نبی کے اہلِ بیت کی طرف سے بہترین بدلہ دے۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات کی مثالیں آگئیں۔ اصل منشاء یہاں حضرت حسینؓ کی تقریر کے علاوہ اُن مزید کہانیوں کی کچھ نشاندہی ہے جن سے واقعہ میں حضرت موصوف کی شان پر یا آپ کے دیگر اہلِ بیت کی شان پر دھبّہ آتا ہے۔ مگر دھوم سے مشہور کی گئی ہیں اور ہر سال تازہ کی جاتی ہیں۔

سب سے بڑی مثال

اس کی سب سے بڑی مثال وہ روایتیں ہیں جو دکھاتی ہیں کہ حضرت حسین دوسرے رفقاء و انصار ہی کو نہیں اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو بھی، حتیٰ کہ نابالغ بچوں کو بھی[2]، اپنے اوپر قربان ہونے کی اجازت دیتے رہے اور جب سوائے ایک بیمار صاحبِ فراش صاحبزادے، علی بن الحسینؓ (زین العابدین) کے اور کوئی نہ بچا تب آپ نے تلوار اُٹھائی۔ اول تو اپنے بچوں ہی کو آدمی، اگر معذور و مجبور نہیں ہے تو ہلاکت کے لئے آگے نہیں بڑھاتا۔ یا کم از کم اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اور یہاں روایتیں ہمیں باور کرا رہی ہیں کہ نہ صرف صاحبزادے علی اکبر (بعمر ۱۹۔۲۰ سال) کو اکیلا آگے بڑھنے دیا۔ اور پھر دیکھتی آنکھوں اکیلا ہی

---

[1] الیفؑ ص ۲۵۵ [2] یہ ابھی قاسم بن الحسنؑ کا جو نام گزرا ہے۔ ان کے بارے میں "شہید انسانیت" میں تصریح ہے کہ بالغ نہیں ہوئے تھے (ص ۵) اور شہادت کا جو واقعہ طبری میں ہے اُس میں بھی کچی عمر کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً زخم کھا کر "ہائے چچا" پکارنا وغیرہ۔

آخر دم تک لڑنے بھی دیا، بلکہ بھتیجوں اور بھانجوں اور بھائیوں کے ساتھ بھی اُن کی کم عمری کے باوجود، یہی معاملہ رکھا! کوئی بتائے کہ کیسے یقین کیا جائے؟ اور یقین کیا جائے تو پھر کیسے حضرت والا کے لئے عقیدت کو ایک شدید احساس کی چبھن سے بچایا جائے؟

ایک تأویل اور توجیہہ

بات خدا لگتی ہے، چنانچہ جو لوگ ان روایتوں کے قائل ہیں وہ بھی اس سوال سے دامن نہ بچا سکے۔ مگر تأویل کی راہ کہیں بھی بند نہیں ہوتی۔ چنانچہ جناب علی نقی صاحب کی کتاب "شہید انسانیت" میں، جس کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں۔ اُس میں بھی یہ سوال سامنے لایا گیا ہے اور خطابت و ذہانت کی بہترین صلاحیتیں صرف کر کے اُس کا حل یوں پیش کیا گیا ہے کہ :-

"حسین کے لئے نسبتہً یہ بہت آسان ہوتا کہ سب سے پہلے آپ اپنی جان کا ہدیہ راہ حق میں پیش کر دیتے۔ اس صورت میں آپ کی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی اور اس کو کسی ایسے شہید کی قربانی سے بڑا درجہ نہ دیا جا سکتا جس نے کبھی بھی حمایت حق میں اپنی قربانی پیش کی ہو۔

اس صورت میں آپ کی قربانی اس سے زیادہ وقیع نہیں سمجھی جا سکتی تھی جتنی کہ بقول نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی قربانی کہ آپ دینِ حق کی تبلیغ کی وجہ سے سولی پر چڑھا دیئے گئے۔ یا سقراط کی قربانی کہ اُن کو اصول کی حمایت میں زہر کا جام پینا پڑا۔ اور حسین کے لئے اس منزل سے گزر جانا مشکل ہی کیا ہوتا جب کہ آپ اُسی باپ کے بیٹے تھے جس کا قول یہ تھا کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ موت مجھ پر آپڑتی ہے یا موت پر میں جا پڑتا ہوں۔ اور نیز یہ کہ موت سے اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ پستانِ مادر سے مانوس ہوتا ہے..... مگر

حسین کی شہادت کو جو خاص امتیاز حاصل ہے وہ اسی لئے کہ آپ نے ایسے ہر ہر فرد کو جو آپ کی ذات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے تھے، اپنی موجودگی میں راہِ حق میں نثار کر دیا...... حسین کا کمالِ عمل محض یہی نہیں تھا کہ وقت اور موقع آنے پر آپ نے اپنی جان راہِ خدا میں پیش کر دی۔ بلکہ آپ کے نفس کا کمال یہ تھا کہ آپ نے جان سے عزیز ہستیاں رضائے حق کے راستے میں یکے بعد دیگرے قربان کر دیں[1]۔ اور جب تک صبر و تحمل کے ساتھ اِن تمام دشوار گزار مراحل کو طے نہ کر لیا اس وقت تک خود اپنی جان کا ہدیہ پیش نہیں کیا[2]۔

ایک بے معنیٰ اور ناقابلِ فہم بات کو "فلسفہ" بنانے کی یہ کوشش ایک بڑے فاضل اور نامی گرامی شیعہ عالم کی ذہانت و ریاضت کا ثمرہ ہے، بس اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ معاملہ کس قدر ناقابل توجیہہ اور ناقابلِ حل ہے۔ حل واقعہ میں صرف ایک ہی ہے کہ اِن روایتوں کو جن کی سندیں کوئی وزن نہیں رکھتیں اور جن میں دس علامتیں موضوع ہونے کی پائی جاتی ہیں، انھیں موضوع قرار دے کر رد کیا جائے۔ لیکن یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنھوں نے اپنا دین و ایمان مظلومیت حسین کے ماتم کو نہیں قرار دے رکھا ہے۔ ورنہ تو اِن روایتوں کی حفاظت لازم آتی ہے۔ اس لئے کہ ان کے بغیر وہ تضا ہی نہیں بن سکتی جس میں ماتم ہی اوّل اور ماتم ہی آخر ہو جائے۔ مثلاً حضرت محمد الباقر والی روایت لے لیجئے جس میں المیۂ کربلا کو بغیر نمک مرچ لگائے اور بغیر ایک رزمیہ داستان بنائے سیدھے سادھے لفظوں میں یوں پیش کر دیا گیا ہے کہ:۔

"پس (جب آپ نے ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کی شرط پوری کرنے سے انکار کیا تو) عمر بن سعد نے آپ سے قتال کیا۔ اس میں آپ کے تمام اصحاب شہید ہو گئے،

---

[1] اگرچہ ان میں ایسے کم عمر بھی تھے، جیسے کم عمروں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں شریک ہو کر راہِ خدا میں بھی اپنی جان قربان کرنے کی اجازت نہیں دی۔ [2] صفحہ ۱۴-۵۱۳

جن میں آپ کے اپنے گھر کے قریباً ۱۵ - ۲۰ جوان بھی تھے[۱]۔ بعد ازاں آپ نے خود قتال کیا اور آپ بھی شہید ہوئے۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ماتم کے کاروبار کو رونق نہیں مل سکتی۔ اس میں ایک کے بعد ایک لاشہ گرنے کا منظر نہیں آتا۔ اس لاشے پر حضرت حسینؓ کا دوڑ کے جانا اور حزن والم کے کلمات ادا فرمانا نہیں آتا۔ حضرت زینب سر کھولے سینہ پیٹتی اور پچھاڑیں کھاتی ہوئی نہیں آتیں، لاش سے لپٹ کے بین کرتی نہیں پائی جاتیں۔ حضرت حسینؓ پیاس کی شدّت سے فرات کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے۔ اور عین اس حالت میں کہ پانی حلق سے اُتارنے جارہے ہیں گلے میں دشمن کا تیر کھاتے ہوئے اور پھر اُن کے لئے یوں بد دعا کرتے نہیں دکھائی دیتے کہ:-

"اے اللہ ان کو گن لے۔ اور پھر انھیں چُن چُن کے مار اور ایک کو بھی باقی نہ رکھ"[۲]

اور پھر بعد میں زخموں سے چور دشمن کے نرغے میں گھرے ہوئے اُن سے یوں مخاطب ہوتے ہوئے بھی نہیں ملتے جس سے ایک عاجزی اور بیچارگی کی تصویر بنتی ہے کہ:-

"کیا تم میرے قتل پر ایک دوسرے کو اکسا رہے ہو؟ یاد رکھو کہ میرے بعد کوئی ایسا بندہ نہیں ہے جس کے قتل سے اللہ اتنا ناراض ہو جتنا میرے قتل سے ہوگا .... اور اگر تم نے مجھے قتل کر ہی دیا (اور نہ مانے) تو اللہ تم پر آپس کی لڑائی اور خونریزی کا عذاب مسلّط فرمائے گا، اور پھر اس عذاب دنیا پر بس نہ کرتے ہوئے (آخرت کے)

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ میں ان حضرات کی بابت کئی اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ ایک قول ۲۰ کا ہے جو حسن بصریؒ کی طرف منسوب ہے۔ ایک ۱۷ کا جو محمد بن حنفیہ کی طرف منسوب ہے۔ اور ایک قول ۲۳ کا۔ (ج ۸ صـ ۱۸۹)

[۲] طبری ج ۶ صـ ۲۵۹

عذابِ الیم کا اُس پر اضافہ فرمائے گا۔"[1]

اور پھر حضرت زینبؓ یہ کہتی ہوئی نہیں نکل آئیں کہ:۔

یا عمر بن سعد أيقتل ابو عبد الله — اے عمر ابن سعد کیا ابو عبداللہ (حسینؓ)
وانت تنظر اليه۔[2] — قتل ہوں گے اور تم دیکھتے رہو گے؟

چنانچہ اس روایت کا ذکر باوجود حضرت محمد باقر کی روایت ہونے کے، مشکل ہی سے کہیں ملے گا۔

قصہ مختصر

اختصار کی کوشش کے باوجود قصہ طویل ہو گیا۔ مختصر یہ ہے کہ معرکۂ کربلا کی لمبی چوڑی کہانیاں علاوہ اس کے کہ موقع و محل کے حالات ان کے وقوع کے لئے گنجائش نہیں دکھاتے، اور علاوہ اس کے کہ ان قصّوں کی سندیں نہایت بے وقعت ہیں یہ قصے متعدد پہلوؤں سے خانوادۂ نبوت پر داغ بنتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال کے ذکر سے ہم نے اوپر بات شروع کی تھی، اور اس کے ضمن میں باقی وہ تمام چیزیں آگئیں جن کو الگ الگ ذکر کرنے کا ارادہ تھا یعنی حضرت حسینؓ کا اپنے آپ کو اپنی زبان سے مقدس اور مقبول بارگاہِ حق بتانا جس کی کوئی گنجائش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں نہیں ہے۔ اپنے دشمنوں کو بد دُعائیں دینا، جو اُن کے نانا کی سنت نہیں اور مردوں کا میدانِ جنگ میں شیوہ نہیں۔ سیدہ زینب بنت خاتونِ جنت کا بین و بکا

---

[1] طبری ج ۲ صفحہ ۲۶۲ اس عبارت میں علاوہ اس بات کے کہ ادب کو ... کر حضرت حسین اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، عبارت کے زیرخط الفاظ بھی وجہ عجب ہیں، قرآن کے اسلام میں ایک نبی اور رسول کے علاوہ کوئی شخص مجاز نہیں کہ یہ گمان اپنے بارے میں رکھے۔ فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ اپنی پاکیزگی و بزرگی کے دعوے نہ کرو وہ بہتر جانتا ہے کون متقی ہے (نجم آیت ۳۲) کیسے [illegible] سکتا ہے کہ حضرت حسین قرآن پاک کی تعلیم سے نا آشنا تھے [illegible] معاذ اللہ اپنی عاقبت کا وہ خطرہ مول رہے تھے تو ایسے کلمہ پر قرآن حدیث کی وعید [illegible]

[2] ایضاً

کرتے ہوئے بار بار میدانِ جنگ میں آنا اور لاشوں سے لپٹ کے رونا چلانا۔ پھر حسینؓ کے لئے عمر بن سعد سے رحم کی اپیل کرنا بھلا یہ باتیں کہیں خانوادۂ نبوت کی خواتین کو زیب دیتی ہیں۔ اور خاتون بھی علی مرتضیٰ جیسے شیر مرد کی بیٹی۔ یہ روایتیں اگر قابلِ اعتبار ہو سکتی ہیں تو صرف اُن لوگوں کے لئے جنھیں خانوادۂ نبوت کی محبت کے نام پر اُن کی مظلومیت کے ماتم کی دوکان کھولنی ہے خواہ مظلومیت کی اس داستان کو رنگین کرنے کے لئے اُن تمام چیزوں کا اپنے ہی ہاتھ سے خون کرنا پڑے جو اس خانوادے کا اور کسی بھی خانوادے کا شرف اور اس کی عزّت ہوں۔

۴۔ بندشِ آب

داستان کربلا کا ایک اور اہم جزو ابن زیاد کی طرف سے قافلہ حسینی پر پانی کی بندش ہے۔ دوسرے اجزاء پر گفتگو نے اتنا وقت لے لیا کہ اب جی چاہتا ہے یہ گفتگو ختم ہو۔ مگر اس بندشِ آب والے جزو کی اہمیت اجازت نہیں دیتی کہ اس سے اغماض کر لیا جائے۔ یہ بندش ۷ محرم سے بتائی گئی ہے۔ اور اہل قافلہ کا پیاس سے خاص کر خود حضرت حسینؓ کا وہ برا حال سنایا جاتا ہے کہ سخت حالت جنگ میں بھی دشمن کو نقصان پہنچانے یا اُس سے اپنا دفاع کرنے سے بھی بڑھ کر پانی کا حصول ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ حالانکہ اسی یوم عاشورہ کی روایتوں میں ایک روایت یہ بھی موجود ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت حسینؓ اور اُن کے ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے غسل کیا جس میں نورے کا استعمال بھی کیا گیا تھا۔ اور ایک بڑے برتن میں مشک گھول کر تیار کیا گیا تھا جو ان حضرات نے لگایا۔ اس کے علاوہ کربلا کا میدان جس کے بارے میں روایتوں نے یہ تأثر دیا ہے کہ وہ ایک بے آب وگیاہ ریگستان تھا اس کی تردید کے لئے حضرت محمد الباقر والی وہ روایت کافی ہے جس کا کچھ حصہ اوپر بیان ہو چکا ہے جس کے مطابق کربلا ایک ایسی زمین تھی جس میں نرکل اور بانس کا جنگل

یا جھاڑیاں موجود تھیں اور یہ ریگستان میں نہیں ہوا کرتیں۔ یہ مسلّم ہے کہ یہ دریائے فرات یا اُس سے نکلنے والی کسی نہر کا کنارہ تھا۔ یہاں پانی زمین کی سطح سے اتنا قریب تھا کہ تھوڑی سی زمین کھودو اور پانی لے لو۔ معجم البلدان میں کربلا کے ذیل میں صراحت ہے کہ یہاں کی زمین میں نرمی (رَخْوَۃٌ) ہے۔ اور یاد آتا ہے کہ طبری ہی میں یہ روایت موجود ہے کہ اصحاب حسینؓ کو بھی زیر زمین کا یہ تجربہ ہوا تھا کہ ذرا سا کھودنے پر پانی نکل آیا[1]۔ بہر حال یہ "تاریخی حقیقت" کے نام پر خالص ایک پروپیگنڈہ ہے کہ کربلا میں پانی نایاب یا کمیاب تھا۔ اور اس سے ۷ محرم سے بندش آب کے افسانے کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

معاملے کے کچھ اور پہلو

کربلا جیسی لبِ دریا سرزمین پر اس بات کو ممکن سمجھ لینا کہ وہاں ڈیڑھ دو سو ایسے مسلّح انسانوں پر جن میں تیس[۳۰] بتیس[۳۲] سوار بھی تھے مسلسل تین[۳] دن تک پانی کی مکمل بندش کی جا سکتی تھی، یہ بات عقل و خرد سے مکمل رخصت لئے بغیر تو ممکن نہیں۔ ہاں اگر یہ بات کہی جائے کہ پانی کا گھاٹ ــــ یعنی اس جگہ کا جو قریبی گھاٹ تھا وہ ــــ روکا گیا تھا۔ تاکہ حسینی قافلہ بسہولت پانی نہ لے سکے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ پانی کے گھاٹ سے پانی حاصل کرنے اور جانوروں کو پلانے میں جو آسانی ہوتی ہے وہ ظاہر ہے کہ گھاٹ سے ہٹ کر دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ روایت میں گھاٹ روکنے ہی کا ذکر ہے۔

لیکن اس میں بھی ۷ تاریخ سے شروعات کی جو بات کہی جاتی ہے۔ اور وہ بندشِ آب والی روایت میں آئی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی ناقابل فہم ہے جیسی مکمل بندش والی بات اس کے برخلاف جو بات واقعاتی لحاظ سے قابلِ فہم ہے وہ یہ ہے کہ ۱۰ تاریخ کو جب

---

[1] دم تحریر صفحہ کا حوالہ مجھے دستیاب نہیں ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ میری یادداشت صحیح ہے تلاش سے طبری میں (یا ابن اثیر میں) وہ موقع نکل آئے گا۔

لڑائی چھڑی تو دشمن نے اپنی جلد از جلد کامیابی کے لئے جہاں دوسرے ذرائع اور ہتھیار استعمال کئے وہاں ایک تدبیر یہ بھی اختیار کی جو جنگ میں عام طور پر کی جاتی ہے کہ فریق مخالف کے لئے پانی کا حصول مشکل بنا دیا جائے۔ اس سے قدرتی طور پر مخالف فریق کی قوت مدافعت گھٹتی ہے۔ پس اگر یہ دعویٰ کیا جائے یا یوں کہئے کہ روایت میں اس طرح کی بات کہی گئی ہو تو یہ ایک قابلِ فہم بات ہے۔ اور اس پر کسی کو کلام کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ نیز واقعے کے تمام پہلوؤں کی روایات کے چوکھٹے میں اس کا فٹ ہونا بھی دقت طلب نہ ہوگا۔ جبکہ اس کے برعکس ۷ تاریخ والی روایت بعض دوسری روایتوں کے ساتھ جوڑ نہیں کھا سکتی۔ بالکل ایک تضاد کا درجہ لئے ہوئے نظر آئے گی۔ آیئے اس پہلو سے روایت کا جائزہ لیجئے۔

ہم نے اگرچہ تفصیل اور ترتیب کے ساتھ وہ روایات اس کتاب میں جمع نہیں کی ہیں جن میں ابنِ سعد اور حضرت حسین کے درمیان نامہ و پیام اور ملاقاتوں کا بیان ہے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کا بیان آتا ہے۔ تاہم کچھ نہ کچھ ذکر ان سب چیزوں کا اسی باب کے اوپر کے صفحات میں آچکا ہے اور یوں بھی یہ باتیں واقعۂ کربلا کے سلسلے میں بہت مشہور و معروف ہیں۔ اس لئے قارئین اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جس وقت سے ابن سعد نے کربلا میں قدم رکھا اُسی وقت سے اس کے اور حضرت حسین کے درمیان نامہ و پیام اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر اس کا نتیجہ ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان خط و کتابت کی شکل میں ظاہر ہوا جس کا حاصل یہ تھا کہ ابن سعد حضرت حسین کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کرے! اس سلسلے میں کئی ایک روایات ہیں جن کا مجموعی تاثر یہ بنتا ہے کہ طرفین کی یہ سلسلہ جنبانی بالکل آخر وقت تک قائم رہی۔ اور دو روایتیں تو صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ ۹ تاریخ کی شام کو یہ سلسلہ بند ہوا۔ اِن دونوں کا ذکر اوپر اسی باب میں آچکا ہے۔ اور طبری جلد ۶ میں اِن میں سے ایک روایت صـ۲۲۲ پر سعد بن عُبید کے حوالے سے

ہے۔ دوسری ص ۲۳۶-۳۷ پر عبداللہ بن شریک عامری کے حوالے سے۔

معاملات کے اس پس منظر میں ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ، تاریخ سے بندشِ آب کا نہ صرف حکم بلکہ اس کا نفاذ بھی بتانے والی روایت کو ماننے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ وہ بات الگ رہی جو اس گفتگو کے شروع میں عرض کی گئی ہے کہ قتل و قتال کی حالت میں تو، جو۔ ازتاریخ کو ہوا، بندشِ آب کی کارروائی کچھ مؤثر اور بامعنیٰ ہو سکتی تھی۔ بغیر قتل و قتال کی حالت کے یہ ایک فضول سی محض بدنامی مول لینے والی بات تھی۔ اور پھر کہا یہ ممکن ہے کہ، تاریخ سے ایسا ہوا ہوتا تو۔ ازتاریخ سے پہلے کہیں کسی طرح بھی اس کی شکایت کی کوئی روایت نہ پائی جاتی؟ تمام شکایتی بیانات۔ ازتاریخ ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ اُس سے پہلے کا کوئی بیان نہیں ملتا۔

روایت کی اندرونی شہادت

روایت میں اس بات کی صراحت تو ہے ہی، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، کہ بندشِ آب کی صورت صرف یہ تھی کہ گھاٹ روکا گیا تھا:-

"......پس عمر بن سعد نے عمرو بن الحجاج کو پانسو سواروں کا دستہ دے کر بھیجا اور وہ گھاٹ پر جا اُترے[1] اور حسین اور اُن کے ساتھیوں اور پانی کے بیچ میں حائل ہو گئے......"

اس کے علاوہ اس بات کی بھی علامت روایت کے اندر پائی جاتی ہے کہ یہ کارروائی۔ ازتاریخ ہی کو عمل میں آئی جو جنگ کا دن تھا، کیونکہ روایت میں اگرچہ مذکورہ بالا الفاظ کے بعد "وَذَالِكَ قَبْلَ قَتْلِ الْحُسَيْنِ بِثَلَاثٍ" (اور یہ شہادت حسین تین دن پہلے کی بات ہے) کے الفاظ آتے ہیں مگر پھر فوراً۔ ازتاریخ ہی کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کی کوئی

---

[1] روایت کے اصل الفاظ میں "فنزلوا علی الشریعۃ" (طبری ج ۶ ص ۲۳۴)، "شریعۃ" کے معنی گھاٹ یا گھاٹ کا راستہ۔

بات نہیں۔

قال وناذلہٗ عبد اللہ بن ابی الحصین الازدی وعدادہٗ فی بجیلہ فقال یاحسین الا تنظر الی الماء کانہٗ کبد السماء واللہ لا تذوق منہ قطرۃً حتی تموت عطشاً ۔۔۔[1]	حمید کہتا ہے کہ عبداللہ بن ابی الحصین ازدی جس کا شمار بجیلہ میں کیا گیا ہے' حضرت حسین کے مقابلے پر آیا اور کہا کہ حسین تم پانی کو دیکھ رہے ہو کیسا آسمان کی طرح شفاف ہے قسم خدا کی تم اس سے ایک قطرہ بھی نہ چکھ سکو گے حتیٰ کہ پیاس سے (معاذ اللہ) دم نکل جائے۔

سچ بات یہ ہے کہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں یہ لے تکے طور پر "شہادت سے تین دن پہلے" کے الفاظ روایت میں درج کئے گئے ہیں جضرت حسین سے کسی کا مقابلہ ۱۰ تاریخ سے پہلے کہیں مروی نہیں اور پانی کی کوئی شکایت بھی ۱۰ تاریخ سے پہلے کہیں بیان نہیں کی گئی۔

راوی کے اوصاف

اس روایت پر غور و فکر کے سلسلے میں اس کے راوی حُمید بن مسلم کے کردار پر بھی نظر ضروری ہے۔ واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں اس کی روایات بے شمار ہیں جن میں اس بات کے نہایت واضح قرائن ہیں کہ اس کی روایتیں ہی جعلی اور خانہ ساز نہیں بلکہ یہ خود بھی شاید ایک جعلی شخصیت ہے۔ ورنہ ایک نہایت موقع پرست اور کوفیوں کے ٹیپیکل (TYPICAL) اوصاف کا مجسمہ ہے۔ ویسے تو یہ اپنے آپ کو ابن سعد کی فوج میں شامل بتاتا ہے۔ اور جب تک واقعۂ شہادت ہو نہیں جاتا یہ کوئی ذرا سا بھی اپنا ہمدردانہ کردار

[1] حوالہ سابق

اہلِ بیت کے ساتھ نہیں دکھاتا۔ مگر جیسے ہی یہ واقعہ ہو لیتا ہے نہ صرف اس سے بڑھ کر اہلِ بیت کا کوئی ہمدرد کربلا کے میدان نظر نہیں آتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفِ اعداء کا نہیں صفِ حسینی کا آدمی تھا، جنگ کے وقت میں حضرت حسین نے دشمنوں کی جارحیت اور سفّاکی پر جو جو ردّ عمل اللہ سے دعا یا بد دعا کی صورت میں یا اظہارِ رنج والم کی صورت میں ظاہر فرمایا، اس کا ایک ایک لفظ آپ اس شخص کی زبان سے سن لیجئے جیسے کوئی ہمزاد ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ واقعہ کربلا کے تین چار سال بعد یزید کی موت کے ساتھ ہی جب وقت بدلا اور ایک طرف حضرت عبداللہ بن زبیر اور دوسری طرف مختار ثقفی نے ہمدردانِ بنی اُمیّہ اور قاتلانِ حسین کے لئے زمین تنگ کر دی تو بہت سے لوگوں نے عافیت طلبی کے لئے چولا بدلا، حُمید بن مسلم اگر واقعی اُس زمانے کا کوئی شخص تھا تو یقیناً انہی چولا بدلنے والوں میں سے ایک تھا۔ اہلِ بیت کی ہمدردی میں طرح طرح کے غم انگیز افسانے تراشتا ہے۔ یہاں تک کہ اس معاملے میں اپنے آپ کو شمرؔ جیسے آدمی سے بھی لڑتا جھگڑتا اور اُسے مغلوب کر لیتا ہوا دکھاتا ہے[1] جو کہ روایات کی روشنی میں حادثۂ کربلا کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ اور جس کی آمد کے بعد ابن سعد کو بھی اس قتل و قتال پر مجبور ہونا پڑا تھا جس کو وہ برابر ٹالنے کی کوشش میں لگا تھا، ان افسانوں سے جن میں سے ایک یہ بندشِ آب والا افسانہ بھی ہے وہ ایک طرف اپنے آپ کو محبّانِ اہلِ بیت میں شمار کرا رہا تھا، دوسری طرف نظر آتا ہے کہ وہ اس موقع سے ذاتی اور خاندانی رنجشیں یا رقابتیں بھی چکا رہا تھا۔ ورنہ جب یہ خود یزیدی لشکر میں تھا تو اس کے لئے کوئی جواز نہ تھا کہ مظالم کی روایتوں میں افراد کو بھی نامزد کرتا جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں عبداللہ بن ابی الحصین کا نام اس نے دیا ہے۔ اس کی روایتوں میں یہی تنہا ایک نامزد ر لوٹ

[1] طبری ۶ صفحہ ۲۶۰ پر اسکی روایت میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت علی (زین العابدینؓ) جو قتل و قتال کی زد سے بچ رہے تھے انھیں بعد میں شمر کی زد سے بچانے کا کارنامہ اسی فدوی کا ہے۔

نہیں ہے۔ بار بار وہ یہی کام کرتا نظر آتا ہے جضرت حسین کے جسد مبارک کو گھوڑوں کے سُم سے روندے جانے والی روایت میں (جس پر آگے کلام آئے گا) یہ اس ہی سے دو آدمیوں کا ذکر نام کے ساتھ کرتا ہے۔ اس طرح کا معاملہ اس کی اور روایتوں میں بھی ہے، بلکہ اس شخص کے اسی کردار کی بنا پر یہ بھی خیال ہونے لگتا ہے کہ کہیں شمرؔ کی بدنامی میں بھی اُس کی اپنی واقعی بداعمالیوں کے ساتھ حُمید بن مسلم کی "مہربانیوں" کا بھی تو کافی دخل نہیں ہے؟ اس لئے کہ اس کی روایتوں میں شمرؔ کا ذکر بار بار آیا تا ہے۔ اور اس ذکر میں اس کی بُرائیاں الم نشرح کرنے سے حُمید کی بہت ہی خصوصی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگلے باب میں حُمید پر اُس کی کچھ اور روایتوں کے ماتحت بھی گفتگو ہوئے گی۔

خلاصۂ کلام

یوم عاشورہ کے واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں جن مختلف پہلوؤں کو اوپر کے صفحات میں اُجاگر کیا گیا اُن کے پیش نظر اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یہ روایتیں بالعموم ناقابل اعتبار بلکہ بیشتر بالبداہت (EVIDENTLY) قابلِ رد ہیں؛ اس لئے عقل اور نقل، قانونِ شریعت اور تقاضائے دیانت ہر ایک کے ماتحت ان روایتوں کی فراہم کی ہوئی تفصیلات کو کم از کم ناقابلِ اعتبار ضرور قرار دیا جانا چاہیئے اور اس سے زیادہ کچھ کہنے کی گنجائش نہیں سمجھی جاتی چاہیئے۔ جتنا ایسی روایتوں ہی آتا ہے، جیسی روایت حضرت محمد الباقر کے حوالے سے اوپر نقل کی گئی[1]۔

"جب حضرت کربلا میں ٹھیرنے پر مجبور ہو گئے (اور کوفیوں کی غداری لشکر

---

[1] یہ احتیاط علمی ذمہ داری ہی کی بنا پر لازم نہیں ہے بلکہ شرعی اور اخلاقی ذمہ داری بھی یہی چاہتی ہے؛ اس لئے کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق دو فریقوں سے ہے اور شرعاً و اخلاقاً کسی فریق کی حمایت یا مخالفت میں کوئی بات مضبوط شہادت کے بغیر جائز نہیں۔

عمر بن سعد کی فشکل میں عملاً سامنے آگئے) تو آپ نے (اس نئی صورت حال سے عہدہ برآہونے کے لئے) تین شکلیں ابن سعد کے سامنے رکھیں۔ میں[1] حجاز واپس چلا جاؤں۔ یزید[2] کے پاس چلا جاؤں۔ یا کسی[3] سرحد پر نکل جاؤں (یعنی ملک چھوڑ دوں) ابن سعد نے تجویز پسند کی اور ابن زیاد کے پاس بھیجدی۔ وہاں سے نامنظور ہوئی اور اسکی جگہ یہ حکم آیا کہ وہ (کسی اور بات سے پہلے) ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ (پھر اُن کی کسی بات پر غور کیا جائے گا) اس شرط کو حضرت حسین رض نے قطعی طور سے رد کر دیا۔ نتیجہ میں ابن سعد نے (جیسا کہ اُسکو حکم تھا) طاقت استعمال کی۔ اور اس میں حضرت حسین کے تمام ساتھی شہید ہوئے۔ ان میں آپ کے گھرانے کے بھی قریباً ۱۵۔۲۰ جوان تھے۔ آپ کا چھوٹا بچہ بھی ایک تیر آ کر لگنے سے شہید ہوا۔ اسکے بعد آپ نے بھی تلوار اُٹھائی اور قتال کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔[1]

یزید کے پاس جانے کی پیش کش

واقعۂ کربلا کے بیان میں شیعہ نقطۂ نظر کو براہ راست جاننے کی غرض سے جو چند کتابیں مجھے دیکھنے کا موقع ملا اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت محمد الباقر کی یہ روایت ان حضرات کے یہاں ذکر میں نہیں لائی جاتی حالانکہ سند کے اعتبار سے ان حضرات کے یہاں اُسکی بیحد وقعت ہونی چاہئے تھی۔ ہاں اُس کا آخری حصہ جو دربار یزید میں حضرت حسین کا سر لیجائے جانے سے متعلق ہے، جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ اس کا تذکرہ یہ حضرات کر دیتے ہیں۔ وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس روایت میں یزید کے پاس جانے کی پیش کش بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہ پیش کش باوجود "حسین رض کی پیش کش" ہونے کے ایسی ناخوشگوار شئے گردانی گئی ہے کہ یوم عاشورہ کی جن روایتوں کا بڑے ذوق و شوق سے بیان کیا جاتا ہے، ان میں بھی جہاں کہیں اس پیش کش

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲

کی بات صراحتہً یا اشارۃً آگئی ہے۔ وہاں اس روایت کا بیان اسی جگہ ختم کر دیا گیا ہے، یا یہ جزو حذف ہے۔ کئی ایک مثالوں میں سے بس ایک مثال کے طور پر حضرت حسین کے رفیق زُہیر بن قَین کی وہ تقریر لے لیجئے جو اسی باب میں اوپر گزر چکی ہے۔ اُس میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ :۔

"اے اللہ کے بندو فاطمہ رضوان اللہ علیہا کی اولاد بہ نسبت ابنِ سُمیہ (ابن زیاد) کے تمھاری محبت اور نصرت کی زیادہ مستحق ہے لیکن اگر تم ان کی مدد نہیں بھی کرتے تو اُن کے قتل کے درپے ہونے سے تو باز آؤ اور اِس آدمی (حضرت حسینؓ) کے اور اُس کے چچا زاد یزید بن معاویہ کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میری جان کی قسم یزید کو تم سے راضی کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تم حسینؓ کو قتل کرو"[1]

لیکن "شہید انسانیت" کے مصنف اس تقریر کو اس سے پہلے جملے پر ہی ختم کر گئے ہیں[2]۔ یہ بور کے جملے بھی اُن کے قارئین تک پہنچ جائیں اس کو انھوں نے پسند نہیں فرمایا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ یزید کے پاس جانا چاہتے تھے[3]۔

اور شیعہ حضرات کو کیا کہیں، خود اہلِ سنت حضرت حسین سے متعلق شیعی تصورات سے اس درجہ متأثر ہوئے ہیں کہ اُن کے یہاں بھی واقعے کے اس جزو کو، جو حتمی طور پر ثابت ہے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳ [2] ملاحظہ ہو ص ۳۸۰-۳۸۱ [3] حُر بن یزید تمیمی کی تقریر اور اس سے متعلق قصے میں بھی بار بار حضرت حسین کے پیش کردہ شرائط کے الفاظ آتے ہیں۔ وہ روایت جس میں شمر ابن زیاد کو یہ شرائط قبول کرنے سے روکتا ہے اس کا تقریباً ہر مصنف کے یہاں تذکرہ ہوتا ہے اسی روایت میں وہ شرائط پوری تفصیل سے موجود ہیں۔ مگر ان کی طرف سے تجاہل برتا جاتا ہے آخری بات یہ ہے کہ اس مسئلے پر اختلافی بیانات اور راویوں کی روایتیں طبری نے ص ۲۳۵ پر درج کر دی ہیں ان کا یکجائی مطالعہ بھی صاف طور سے اسی نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ بیانِ شرائط والی روایتیں ہی مضبوط ہیں اور خود طبری نے گویا یہی تأثر دیا ہے۔

تاریکی ہی میں رکھنا عام طور پر پسند کیا گیا۔ ۳۷ سال پہلے کا "واقعۂ کربلا" نامی راقم کا مضمون جس پر "نظرِ ثانی" اس کتاب کی شکل اختیار کر گئی جو آپ پڑھ رہے ہیں، اُس مضمون میں راقم نے اس حقیقت سے بے خبری کے عالم میں کہ حضرت حسین نے جو سہ رُخی پیش کش کربلا میں کی تھی جس کا ایک جز یزید کے پاس جانا اور اکثر روایتوں کے مطابق بیعت کیلئے جانا تھا[1]۔ اس کا یہ جزو مکمل تاریکی میں ہے، اس جزو کو بھی روشنی دکھانے کی غلطی کر دی۔ اور بس یہ "غلطی" قیامت خیز ہو گئی بہت بہت پڑھے لکھے سنی حضرات جن میں میرے بعض بڑے محترم اور مشفق بھی شامل تھے، اُن کے لئے حضرت حسین کی طرف اس بات کی نسبت ناقابلِ برداشت ہو گئی، اور معاملہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب الفرقان کی اگلی اشاعت میں تاریخ طبری اور ابن کثیر وغیرہ کے پانچ چھ حوالوں سے اصل عربی عبارتوں میں وہ پیش کش نقل کر دی گئی۔ اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اس پیش کش کی بات کوئی افتراء اور بہتان یا کسی کمزور ذریعے (SOURCE) کی بات نہیں تھی۔

بہر حال یہ بات پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ سامنے آجانی چاہیئے کہ حضرت حسینؓ نے کربلا میں یہ دیکھ کر حالات کا رُخ اُس خیال و گمان کے بالکل برعکس ہے، جس گمان اور اطمینان کے ساتھ کوفے کی طرف سفر شروع کیا گیا تھا۔ ابن زیاد کے نائب عمر بن سعد کو وہ پیش کش کی جو حضرت محمد الباقر کی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ اور جس کی تائید واقعۂ کربلا سے متعلق چند در چند روایات میں صراحتہً یا اشارۃً پائی جاتی ہے۔ یہ حضرت حسین کے ورودِ کربلا کے ساتھ جڑی ہوئی ایسی حقیقت ہے کہ جب تک آپ کے ورودِ کربلا اور عمر بن سعد کے وہاں آنے سے انکار نہ کر دیا جائے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ جس

---

[1] ان روایتوں کے الفاظ ہیں حتیٰ اضع یدی فی یدہ جس کا لفظی ترجمہ ہے (تا کہ میں اپنا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دیدوں) کوئی اس عبارت کا ترجمہ "بیعت" سے نہ بھی کرنا چاہے تو "سپردگی" سے پھر بھی کرنا ہی ہوگا اور پھر کیا فرق رہا۔؟

سید امیر علی جیسے شیعہ مصنفین جن کے یہاں شیعیت تو قدرتی طور سے پائی جاتی ہے مگر علمی خیانت کے قائل نہیں ہیں انھوں نے بھی واقعۂ کربلا کے سلسلے میں نہ صرف اس سہ گانہ پیش کش کی بات پوری صراحت سے درج کی ہے بلکہ ایک روایت (صرف ایک روایت) جو اس کی تردید میں پائی جاتی ہے اُس کو رد بھی کر دیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب "اسپرٹ آف اسلام" (SPIRIT OF ISLAM) میں واقعۂ کربلا کے ذکر میں حضرت حسین کی سہ گانہ پیش کش بیان کر کے موصوف نے اس پر حاشیہ دیا ہے جو کتاب کے اردو ترجمے میں بایں الفاظ درج ہوا ہے :-

"صاحب روضۃ الصفا یہ شرائط بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ خدامِ حسین میں سے ایک شخص نے جو مقتل کربلا سے اتفاقاً بچ نکلا، اس دعوے کو غلط بتایا کہ امام حسین نے اُموی سردار کے سامنے کسی قسم کی شرائط صلح پیش کیں، ممکن ہے[1] کہ اس خادم نے یہ انکار یہ ظاہر کرنے کی خاطر کیا ہو کہ امام حسین نے صلح کی تجویز کر کے اپنے آپ کو دشمن کے سامنے ذلیل نہیں کیا، لیکن میرے نزدیک صلح کی تجویز سے حضرت حسین کی سیرت عالیہ کی کسی طرح کسر شان نہیں ہوتی۔"[2]

---

[1] یہاں سے جسٹس امیر علی کا تبصرہ شروع ہوا ہے۔

[2] روحِ اسلام ترجمہ "اسپرٹ آف اسلام" از محمد ہادی حسین۔ اسلامک بک سینٹر دہلی ص ۴۵۸

باب یازدہم

شہادت کے بعد کی کہانیاں

شہادت تک کے مرحلے میں جس طرح کی بے سروپا کہانیاں اللہ ہی جانتا ہے کہ بنانے والوں نے کن کن مقاصد کے لئے بنائیں اور ہمارے اہلِ تاریخ نے شائع کیں، اِن کہانیوں کا سلسلہ شہادت کے المناک مناظر پیش کرنے پر ختم نہیں ہوگیا (جنھیں پیش کرنے کی ہمت ہم اپنے اندر نہیں پاسکے کہ کیوں ایک جھوٹ سے دل زخمی کیا جائے) بلکہ ان سے بھی بدتر قسم کے منظر دکھانے والی کہانیاں ہم اپنی انھی تاریخی کتابوں میں مابعد شہادت کے سلسلے میں پاتے ہیں[1]۔

خواتین کی بے حرمتی

شہادت اور اُسکے ذہن کے دِلدوز مناظر جس روایت کے اندر آتے ہیں اُس کا خاتمہ خواتین اہلِ بیت کی بے حُرمتی پر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ حضرت حسین کا سَر تن سے جدا کرنے اور آپ کی جسم کی پوشش، کپڑے، جوتے، ٹوپی، کھسوٹ لینے کے بعد یہ لوگ خواتین اور خیمے کے مال واسباب پر ٹوٹے، حد یہ تھی کہ سروں سے اوڑھنیاں اور چادریں تک کھینچ لی گئیں[2]۔ اس کے بعد کی روایت کہتی ہے کہ اس مرحلے پر عمر بن سعد پہنچے اور اعلان کیا کہ کوئی شخص اِن عورتوں کے خیمے میں نہ جائے اور اُن کے سامان سے کسی نے کچھ لیا ہو تو

---

[1] طبری اور ابن اثیر کا تو ایک ہی حال ہے، ابن کثیر نے البتہ کہیں کہیں تھوڑی سی احتیاط برتی ہے۔ [2] طبری ج ٦ صفحہ ٢٦

واپس کرے. مگر کسی نے کچھ واپس نہیں کیا[1].

لاش کی بے حرمتی

پھر یہی روایت بتاتی ہے کہ عمر ابن سعد نے یہ نیک اور شریفانہ حکم جاری کرنے کے بعد دوسرا حکم یہ جاری کیا کہ

"ہاں کون ہے جو اپنے گھوڑے کے ذریعہ حسینؓ کی لاش کو روندے؟ چنانچہ دس باہمت والے نکل کے آئے اور انھوں نے یہ "کارِ خیر" بھرپور طریقے سے انجام دیا[2]."

سر کی بے حرمتی اور باقیات قافلہ سے بدسلوکی

اسی روایت کے مطابق آپ کا سر فوراً کوفے کو روانہ کیا گیا اور دوسرے دن قافلے کی خواتین اور باقیماندہ بچوں کو ساتھ لے کر عمر بن سعد اور اس کی فوج نے کربلا سے کوچ کیا. آگے کی ایک روایت کے مطابق (جس کا راوی حمید بن مسلم ہے) حضرت حسینؓ کا سر اور آپ کے اہلِ بیت جب ابن زیاد کے یہاں پہنچائے گئے تو اس نے سر کی بھی بے حرمتی اپنی چھڑی اور زبان سے کی اور اہلِ بیت کے زخمی دلوں پر بھی خوب خوب نمک چھڑکا[3]. اور پھر اس کے آگے آنے والی روایت کے مطابق حضرت علی بن الحسینؓ (حضرت زین العابدین) جو کربلا میں بیمار صاحبِ فراش ہونے کی وجہ سے "میدانِ جنگ" میں نہ نکل سکے تھے (اور بعد از ں حمید بن مسلم کی "عنایت" سے بچ گئے تھے) کو باقیات قافلہ میں دیکھنا ابن زیاد کو اسقدر ناگوار ہوا کہ اس نے ان کا ستر کھلوا کر بالغ اور نابالغ ہونے کی جانچ کرائی اور نتیجے میں قتل کا حکم دیا. مگر پھر (مختلف روایتوں کے مطابق مختلف وجوہ سے) اُن کی جان بخشی کر دی[4].

---

[1] طبری ج ۶ صـ۲۶۰ [2] ایضاً صـ۲۶۱ [3] ایضاً صـ۶۳-۲۶۲ [4] ایضاً صـ۲۶۳

تنقید کی ایک نظر

پچھلے باب میں ہم نے کہا ہے کہ اس واقعہ کی روایتوں میں روایت اور درایت کے اصولوں کے اعتبار سے اسقدر ناقابلِ قبول اور ناقابلِ قیاس باتیں بھری ہوئی ہیں کہ کسی بھی روایت کو، خاص کر جس سے کسی پر کوئی الزام آتا ہو، قبول کرنا اور مان لینا ایک بڑا مشکل اور بڑی ذمّہ داری کا کام ہے، کیونکہ شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جانا ہر مہذّب قانون کا ضابطہ ہے؛ شریعت اسلامی کا ضابطہ بھی یہی ہے، یہ سب روایتیں جن کا اختصار اوپر کے صفحات میں بیان ہوا ایسی الزامی نوعیت کی ہیں۔ تاہم جہاں تک ابن زیاد کا سوال ہے اُس کے متعلق یہ ماننا از روئے قیاس کچھ بہت مشکل نہیں نظر آتا کہ حضرت حسین کا سر اسکے سامنے رکھا گیا ہو تو اُس نے آپ کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے چھڑی سے آپ کے دانتوں یا سر کو ٹھوکا دیا ہو۔ لیکن آفت رسیدہ خواتین کے ساتھ جس قسم کی نمک پاشی کی باتیں اُس سے منسوب کی گئی ہیں۔ اُنکے لئے جب تک کوئی نہایت مضبوط شہادت نہ ہو کوئی جواز یقین کر لینے کا نظر نہیں آتا۔

حضرتِ حسینؓ کے دانتوں کو چھڑی لگانا یوں بعید از قیاس نہیں ہے کہ اسے بظاہر حضرت حسین کا کوئی ایسا احترام نہیں تھا جیسے احترام کے تخیّل سے ہمیں یہ بات بعید قبیح نظر آتی ہے۔ اُسے اگر کوئی احترام ہوتا تو کربلا کا سانحہ ہی کیوں پیش آتا۔ لیکن خواتین کی بات بہت مختلف ہے۔ حضرت حسین کے لئے بے احترامی کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ (ابن زیاد) جس حکومت کا عہدہ دار بلکہ یقینی نمک خوار تھا حضرت حسینؓ اسکو چیلنج کرنے کیلئے نکلے تھے، خواتین بے چاری محض تابع تھیں اور انھوں نے کوئی عمل یزید کی حکومت کو چیلنج کرنے کا نہیں کیا تھا۔ اس لئے قرین قیاس نہیں ہے کہ وہ خواتین کے ساتھ خاص طور سے اُنکی عزّ دگی میں ایسے طور سے پیش آیا ہو جسے کوئی بھی اہل پسند نہیں کر سکتا۔[1]

---

[1] شیعہ حضرات کی کتابوں میں ان خواتین کی طرف جو باغیانہ تقریریں کو فہ میں ان کے داخلے (باقی آئندہ صفحہ پر)

ایسی خلاف قیاس بات کا الزام کسی کو دینے کے لئے بہت ٹھوس شہادت چاہئے، اور یہاں شہادت کس کی ہے؟ حُمَید بن مسلم کی۔ ایسا جھوٹا اور لپاڑیا راوی جس کے جھوٹ اور افسانہ تراشی کی شہادت خود طبری کے اندر کی اس کی روایتوں میں موجود ہے حتیٰ کہ انہی روایتوں میں (بشمول زیر بحث روایت) موجود ہے[1] جو اوپر کے صفحات میں پیش کی گئیں۔

حُمَید بن مسلم کے تضادات

اس روایت کو (جو کہ زیر بحث ہے) شروع کرتے ہوئے حمید بن مسلم کہتا ہے کہ کربلا سے اُسے عمر بن سعد نے اپنے گھر روانہ کیا تاکہ اس کی خیر و عافیت کی خبر اور "فتح" کی خوشخبری پہنچائے۔ اور یہ کام کر کے وہ ابن زیاد کی طرف گیا تو وہاں دیکھا کہ سر حسینؓ رکھا ہوا ہے۔ اور قافلۂ حسینی کے باقیماندہ افراد بھی پہنچے ہوئے ہیں۔ بس اس کے آگے وہ خواتین اہلِ بیت کے زخموں پر ابن زیاد کی نمک پاشی کا قصہ سناتا ہے۔ جبکہ یہی شخص ایک صفحہ پہلے (ص۲۶۱) کی روایت میں یہ بیان دے رہا ہے کہ عمر بن سعد نے اس کو اور فلاں دوسرے شخص کو حضرت حسینؓ کا سر ابن زیاد کے پاس پہنچانے کے لئے بھیجا۔ بہرحال یہ شخص ایک "حاضر ناظر" قسم کا راوی ہے۔ ہر جگہ موجود ملتا ہے۔ اور متضاد قسم کی باتوں بے یقینی کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی شہادت پر کیسے کسی کو ملزم ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ افسوس ہوتا ہے کہ آخر طبری نے اسکے ایسے بیانات کیونکر بلا کسی تنقید او تبصرے کے جمع کر دیئے ہیں جو خواہ مخواہ تشویشِ ذہن اور ضیاعِ وقت کا باعث ہوں!

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) کے موقع پر منسوب کی گئی ہیں۔ ذرا سے غور سے بھی آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ سب تصنیف ہے۔ ورنہ جب وہ انہی لوگوں کے بقول قیدیوں کی طرح سے جائی جا رہی تھیں تو کون کھیر راستے میں کھڑے ہو ہو کر باغیانہ تقریریں کرنے دیتا؟ [1] پچھلے باب میں اسکے کردار پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

رہی وہ روایت کہ حضرت زین العابدین کا ستر کھول کر ان کے بلوغ اور عدم بلوغ کا امتحان کیا گیا۔ تو اس مزاق کیلئے کیا کہا جائے! اس راوی کو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ حضرت زین العابدین ۲۲ سال کی عمر کے شادی شدہ اور ایک بچے حضرت محمد الباقر کے باپ تھے، اور بچہ بھی قافلے میں موجود تھا۔[1]

---

[1] شیعہ ماخذ میں تو ابن زیاد کے بارے میں اس موقع کی وہ وہ روایتیں ہیں کہ اللہ کی پناہ اور وہ کس حد تک سنّیوں میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اسکی بابت تفصیل میں ہمیں نہیں جانا۔ البتہ ایک روایت کا ذکر یہاں کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ابن زیاد کے ساتھ بھی ہم کوئی بے انصافی کا معاملہ نہ کریں بلکہ حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کریں۔ یہ روایت طبری ہی میں ہے اور بتاتی ہے کہ:۔

فجئ برأس الحسین الی ابن	پس حسین کا سر ابن زیاد کے پاس لایا گیا
زیاد فوضع بین یدیہ فجعل	اور سامنے رکھا گیا اس پر وہ اپنی چھڑی سے
یقول بقضیبہ ویقول إنّ	اشارہ کرنے اور کہنے لگا کہ اچھا ابو عبد اللہ
اباعبد اللہ قد کان شمط قال	کے بال تو کھچڑی ہو گئے تھے۔ اور ان کی
وجئ بنسائہ وبناتہ واھلہ	بیویاں، بیٹیاں اور دیگر اہلِ خانہ بھی
وکان أحسن شئ صنعہ أن أمر لھم	لائے گئے۔ انکے معاملہ میں ابنِ زیاد نے سب سے
بمنزل فی مکان معتزل واجری علیھم	اچھی بات یہ کی تھی کہ اُنکے قیام کیلئے ایک
رزقاً وامرھم بنفقۃ وکسوۃ قال	ذرا الگ تھلگ جگہ پر انتظام کیا تھا وہیں
فنطق غلامان منھم لعبد اللہ بن	اُن کا کھانا جاتا تھا، اور دوسری ضروریات
جعفر او ابن جعفر فأتیا رجلاً من طئ	اور اخراجات فراہم کرنیکے بھی حکام دیئے تھے،
فلجآ الیہ فضرب عناقھما وجاء	اسی دوران میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ان میں سے
برؤسھما حتی وضعھما بین یدی ابن زید	عبد اللہ بن جعفر کے دو بیٹے یا پوتے نکل کر

(باقی آئندہ صفحہ پر)

اس کے بعد پیچھے کی طرف چلیے۔ حضرت حسینؓ کے جسدِ خاکی کو گھوڑوں سے روندوانے کی روایت اُن روایتوں میں سرِ فہرست رکھے جانے کی مستحق ہے جن کی وجہ سے روایتوں کا یہ سارا کارخانہ جعل و فریب پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس کا راوی بھی وہی حمید بن مسلم ہے، اسی روایت میں حُمید کا وہ بیان بھی آتا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ مجھے عمر بن سعد نے حضرت حسین کا سر دے کر ابن زیاد کے پاس روانہ کیا تھا، اور آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ اسی شخص کی دوسری روایت اِس بیان کی تردید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت میں جھوٹ کی یہ منہ بولتی علامت بھی موجود ہے کہ حضرت حسینؓ کے ساتھیوں میں سے شہداء کی تعداد بہتر۷۲ بتاتا ہے جو محض ایک شہرت ہے واقعہ نہیں،

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ)

قال فرهقه بضرب عنقه
وامر بداره فهدمت۔

بنو طے کے ایک آدمی کے یہاں پہنچ گئے اور اس سے پناہ چاہی تو اس (ظالم) نے ان کی گردنیں ماردیں اور سر لے کے ابن زیاد کے پاس آیا۔ راوی کہتا ہے کہ ابن زیاد نے (غصے میں) اسکے قتل کا ارادہ کیا اور (پھر فیصلہ بدل کر) اس کا گھر ڈھا دینے کا حکم دیا اور وہ ڈھا دیا گیا۔

اس روایت میں اور سب باتیں تو خود سمجھ لینے کی ہیں مگر ایک نکتہ عام قارئین کے اعتبار سے وضاحت طلب ہے کہ اہل عرب کے یہاں کنیّت سے کسی کا ذکر یا اس کو خطاب از راہِ تعظیم ہوتا ہے۔ اس روایت کے مطابق ابن زیاد نے حضرت حسین کا ذکر آپ کی کنیّت ابوعبداللہ سے کیا ہے۔ اور چھڑی سے کہیں ٹھوکا نہیں دیا ہے بلکہ اشارہ کیا ہے۔ یہ روایت گویا تمام روایتوں کی تردید کرتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۲

جناب علی نقی صاحب قبلہ بھی لکھتے ہیں کہ :-

"ایک تاریخی صراحت کے مطابق یہ بتیس ۳۲ سوار اور چالیس پیادوں سے زیادہ نہیں تھے۔ اور اسی لئے شہداء کربلا کے لئے بہتر ۷۲ کا لفظ زبان زد خلائق ہے۔ مگر کربلا کے حالاتِ جنگ اور مجاہدین کے ناموں کی تفصیل اور دوسرے متعلقہ واقعات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد سَو ۱۰۰ سے زیادہ اور دو سَو ۲۰۰ سے کم تھی۔"[1]

اگر یہ شخص (حمید بن مسلم) واقعی کربلا میں موجود ہوتا یا جو روایتیں اسکے نام سے آتی ہیں وہ واقعی کسی بھی ایسے شخص کی ہوتیں جو کربلا میں موجود تھا تو یہ بہتر ۷۲ کی خلاف واقعہ تعداد اس نے نہ بتائی ہوتی۔ اور یہی وہ روایت ہے جو خواتین کے سروں سے چادریں تک کھینچ لینے کا قصّہ سناتی ہے پس خود ہی سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ کس قسم کی روایت ہے، اور اس میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں اُنکی کیا حیثیت ہے؟

قصرِ یزید میں

بیان کیا گیا ہے کہ کوفے سے حضرت حسینؓ کا سر یزید کے پاس دمشق بھیجا گیا۔ علی ہذا قافلۂ حسینی کے باقیماندہ افراد خواتین اور بچے بھی وہیں پہنچائے گئے۔ اس بارے میں جو روایتیں مشہور ہیں وہ تو یہ ہیں کہ یزید نے بھی سر کے ساتھ ٹھوکا دینے کی گستاخی کی اور بقیۃ السّیف اہلِ خانہ کے ساتھ بھی رنج پہنچانے والی باتیں کیں، بلکہ شیعہ روایات کے مطابق تو اہلِ خانہ کا قافلہ کوفے سے دمشق تک راہ ہی غیر مسلم قیدیوں کی طرح نہایت ذلّت و تشہیر کے ساتھ تھا۔ اور پھر گھنٹوں محل کے دروازے پہ کھڑا رکھا گیا وغیرہ وغیرہ خرافات، جن میں اُمویوں کے ہاتھوں خاندان نبوت کی وہ تذلیل دکھا کر جو مسلمانوں نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ بھی روا نہیں رکھی، بلکہ ان اہلِ بیت کی خود اپنے ہاتھوں بھی اپنی تذلیل اور تشہیر اُنکی

[1] ے عاشورہ ۳۰

"تقریروں" وغیرہ کی شکل میں) دکھا کر، دراصل شیعہ مذہب کے تمام عقائد اور اعمال و رسوم کی سند اور اصل اہلِ بیت ہی سے فراہم کرنے کا وہ فنکارانہ انتظام کیا گیا ہے کہ ایک فن کے اعتبار سے بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔ لیکن جس کو اصلیت اور واقعیت سے دلچسپی ہے اُس کیلئے اسی طبری میں، جس میں خود کافی لغویات موجود ہیں، اِن تمام خانہ ساز لغویات کی تردید کا سامان بھی موجود ہے۔

وہ ایک روایت جو دسویں باب میں گزری ہے کہ ابن زیاد نے جو آدمی حضرت حسینؓ کا سر لے کر دمشق بھیجا تھا ۔ اور اُس نے کربلا کی یہ کہانی سنائی تھی کہ حسینؓ اور اُن کے ساتھی ہمارے سامنے ایسے بھاگے جیسے شکروں کے سامنے کبوتر ۔ حتیٰ کہ ذرا سی دیر میں اُن کا کام تمام کر دیا گیا ۔ اس میں آگے مزید یہ الفاظ بھی تھے "پس اب وہاں اُن کے جسم ہیں بے لباس ، کپڑے ہیں خون آلود ، چہرے خاک آلود ..... " الخ ۔ وہی روایت اس کے بعد بتاتی ہے :

فدمعت عین یزید وقال	یہ سن کر یزید کی آنکھیں بھر آئیں اور
قد کنت ارضی بطاعتکم بدون	کہا (ارے یہ کیا کیا) میں تو قتل حسینؓ کے
قتل الحسین لعن اللہ ابن	بغیر بھی تم سے راضی رہتا، اللہ ابن سمیہ[1]
سُمیّہ اما واللہ لو انی صاحبہ	کو غارت کرے ۔ بخدائے پاک میں اگر
لعفوت عنہ فرحم اللہ	اسکی جگہ ہوتا تو حسین سے درگزر ہی کرتا ۔
الحسین ولم یصلہ بشیءٍ ۔	اللہ حسین پر رحمت کرے" اور پھر
	اُس آدمی کو کوئی انعام وصلہ نہ دیا ۔

اس کے بعد راوی مزید بیان اس بارے میں دیتا ہے کہ ابن زیاد نے حضرت حسینؓ کے اہلِ خانہ کو بھی دو آدمیوں کی تحویل میں یزید کے پاس ارسال کیا تھا ۔ ان دو میں سے ایک کا نام مُحَفّز ابن ثعلبہ تھا ۔ اس مُحَفّز نے محل کے دروازے پہ آکر آواز لگائی ۔

ھٰذا مُحَفّز ابن ثعلبہ اتیٰ	یہ مُحَفّز ابن ثعلبہ ہے جو "بیوں و ریلیوں"

---

[1] ابن سمیہ تو ابن زیاد کے باپ زیاد کو کہا جاتا ہے ۔ واللہ اعلم یہاں ابن زیاد کے لئے کیونکر استعمال ہوا ۔

بنتام البغیرۃ. کو (معاذ اللہ) لے کر آیا ہے۔

یزید نے اس کے جواب میں کہا کہ:۔

ما ولدت أم محفّز شرًا	محفّز کی ماں نے اس سے زیادہ بُرا اور
وألأم (منه)[1]	اس سے زیادہ لئیم نہیں جنا۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ روایت ضرور صحیح ہے لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ اس روایت کی موجودگی اُن روایتوں کو مشکوک ضرور بنا دیتی ہے جن میں یزید کے اس رویّے کے برعکس رویہ دکھایا گیا ہے۔ اور مزید یہ بھی کہا جائے گا کہ جو مزاج، جو طبیعت، اور جو خاندانی ماحول یزید کیلئے فی الواقع ثابت ہے، (نہ کہ خانہ ساز ہیں) اور حضرت حسین کیلئے اسکے جس رویّے اور جن احساسات کی مضبوط شہادت کربلا کے واقعۂ شہادت سے پہلے تک کیلئے پائی جاتی ہے، جن کا کچھ بیان اس کتاب کے بعض گزشتہ ابواب میں بھی ہوا ہے، یہ ثبوت اور یہ شہادتیں بہرحال اپنا وزن اِس روایت کے اور اِس جیسی روایتوں کے پڑے میں ڈالتی ہیں۔

حضرت محمد الباقر کی روایت

ہم نے حضرت محمد الباقر کی روایت کا بار بار حوالہ گزشتہ صفحات میں دیا ہے اور بقدرِ ضرورت شہادت تک کا حصہ نقل بھی کیا ہے۔ اس حصے کے بعد اس روایت میں بھی بعد الا قصہ، ابن زیاد اور یزید سے متعلق آتا ہے ضروری ہے کہ اس گفتگو میں اُس کو بھی سامنے لایا جائے۔

اُس روایت کو ہم نے شہادت حضرت حسینؓ تک نقل کیا تھا۔ اسکے آگے اس روایت میں ہے کہ آپ کو قبیلۂ مذحج کے ایک آدمی نے قتل کیا تھا پھر اس نے سر کو تن سے جدا کیا اور لے کر عبید اللہ بن زیاد کے پاس آیا اور انعام کا طالب ہوا۔ ابن زیاد نے یزید کے پاس

---

[1] طبری ج ۶ صـ ۲۶۳ طبری میں "شروا وألأم" ہے جو بداہتہً غلط ہے "شرًا وألأم منه" ہونا چاہئے ابن اثیر میں یوں آیا ہے "الأم واحمق منه" ج ۳ صـ ۲۹۸۔

روانہ کر دیا۔ یزید کے سامنے لا کر رکھا گیا تو وہ آپ کے مُنہ پر چھڑی سے ٹھو کے دیتے ہوئے ایک "شعر" پڑھنے لگا۔ (جس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ حسین نے از راہِ حق ناشناسی و حق تلفی ہمارے خلاف صف آرائی کی) حضرت ابو برزہ اسلمی موجود تھے انھوں نے ٹوکا کہ چھڑی ہٹاؤ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بارہا دیکھا ہے کہ ان کے مُنہ پر مُنہ رکھے ہوئے چوم رہے ہیں۔ بعدہٗ حضرت حسینؓ کے اہلِ خانہ بھی کوفے سے دمشق ہی پہنچا دیئے گئے۔ اس موقع پر یزید نے اپنے خواص اہلِ شام کو جمع کیا جن میں سے ایک نے خانوادۂ حسینی کی ایک صاحبزادی پر نظر ڈال کر یزید سے کہا کہ امیر المؤمنین یہ لڑکی مجھے بخش دیجئے۔ حضرت زینبؓ نے آڑے آ کر کہا کہ ایسی بات کوئی شخص دینِ حق سے باہر ہو کر ہی کہہ سکتا ہے، اس نے اپنی بات پھر دہرائی تو یزید نے کہا کہ باز آجاؤ۔ (کُفّ عن ھذا) اور پھر اُن لوگوں کو اپنے گھر میں بھیج دیا۔ بعد ازاں اُن کے لئے سامانِ رخصت کر کے اُن کو مدینے روانہ کیا۔[1]

گویا اس روایت کا بیان بھی ایک معاملے میں اُنہی روایتوں کی طرح ہے جن کے مقابلے میں ہم نے ابھی اس سے اوپر کی ذکر کردہ روایت (بحوالہ طبری ص۲۶۶) کو قابلِ ترجیح قرار دیا۔ یعنی اس میں بھی منہ پر چھڑی رکھنے والی بات آئی ہے۔ سو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یزید سے ہم حضرت حسین کیلئے اُس احترام کی توقع نہیں کر سکتے جو ہمارے نزدیک ضروری ہے، اس لئے بالکل ممکن ہے کہ چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کچھ شکایت کا واقعہ پیش آیا ہو۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ روایت کے اس حصّے میں کھُلے طور پر الحاق کی نشانیاں موجود ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

۱۔ یہ روایت کہتی ہے کہ قاتل نے سر کو تن سے جُدا کیا اور سیدھا لے کر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا۔ حالانکہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ بغیر سالارِ لشکر ابن سعد کے بھیجے ہوئے کوئی شخص یہ کام یا یہ بھی یار خود کر ڈالتا۔

۲۔ دو شعر بھی روایت میں کسی شخص کی زبان سے ابن زیاد کے سامنے کہلوائے گئے ہیں۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۰ تا ۲۲۰

جن کا ترجمہ ہے:۔

"حضور والا، میری سواری کو سونے اور چاندی سے لاد دیجئے۔ اس لئے کہ میں نے

ایک شاہِ ذی شان کو قتل کیا ہے۔

میں نے اسکو قتل کیا ہے جو اپنے نسب اور ماں باپ کے اعتبار سے سب سے اچھا ہے۔"

یہی دو شعر پڑھتا ہوا قاتل ہمیں ایک دوسری روایت میں کربلا کے میدان میں عمر بن سعد کے خیمے پر بھی دکھایا گیا ہے۔ اور پھر اُس میں یہ بھی ہے کہ عمر بن سعد نے سنا تو کہا کہ:۔

"واللہ تو ازلی مجنون ہے۔ لاؤ اس کو اندر لاؤ۔ چنانچہ اندر لایا گیا تو چھڑی

سے اس کی پٹائی کی۔ اور کہا، اے او پاگل تو ایسی باتیں منہ سے نکال رہا ہے؟

ابنِ زیاد نے اگر سن لیا تو تیری گردن مار دے گا۔"[1]

عمر بن سعد کے خیمے پر بھی یہ شعر پڑھے گئے تھے یا نہیں؟ یہ الگ بات ہے لیکن نسبت سکے کہ قاتل سر الگ کر کے بالا ہی بالا ابن زیاد کے پاس لے گیا ہو اور وہاں ان اشعار کی صدا لگائی ہو، یہ بات زیادہ سمجھ میں آنے والی ہے کہ وہ یہ "کارنامہ" کر کے عمر بن سعد سالارِ لشکر کے خیمے پر آیا ہو اور داد و انعام کا طالب ہوا ہو۔

بہرحال کچھ بھی ہو۔ ایک روایت کے مطابق یہ شعر قاتل نے میدان کربلا میں ابن سعد کے خیمے پر پڑھے تھے۔ اب اگر بعد میں یہی قصہ کوئی ابن زیاد سے متعلق کر کے سناتا ہے تو صاف طور سے یہ کسی گڑبڑ کا شاخسانہ ہے۔ اور وہ بھی بہت اُوٹ پٹانگ قسم کی گڑبڑ۔ اور پھر اس کھلی گڑبڑ کے نتیجے میں بالکل قرینِ قیاس نظر آتا ہے کہ یزید کی طرف "چھڑی سے ٹھوکا دینے" کی نسبت بھی اسی نوعیت کی چیز ہو۔ یعنی یہ کہ واقعہ تو ابن زیاد کا تھا۔ جیسا کہ اور روایتوں میں آچکا ہے۔ مگر حافظہ کی گڑبڑ یا ارادے کی گڑبڑ سے کسی راوی نے یزید کے سر لگا دیا۔ اور یاد رہے کہ ابن زیاد کے بارے میں بھی ہم اپنی اس رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ ایسے واقعہ کا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۱

ہونا بعید از قیاس ہرگز نہیں ہے۔ البتہ جب ایک روایت "ٹھوکا دینے" کے بجائے "اشارہ کرنے" کی موجود ہے تو کم از کم شک کا فائدہ ابن زیاد کو پہنچنے سے ہم نہیں روک سکتے، خواہ وہ قتل حسین کی اصل ذمہ داری کے لحاظ سے ہمیں کتنا ہی مبغوض ہو۔

خواتین خانوادۂ نبوت کے ساتھ اور صاحبزادہ علی بن الحسینؓ کے ساتھ رنج رسانی اور سخت کلامی وغیرہ کی روایتیں جو طبری میں بھی آتی ہیں اور دوسری کتابوں میں بھی ہیں، اُن سب کے بارے میں ہم اپنے آپ کو یہی کہنے کیلئے مجبور پاتے ہیں کہ جب اِن روایتوں سے بالکل مختلف صورت بتانے والی روایتیں بھی موجود ہیں، جو ابھی آپ کے سامنے گزریں تو کوئی جواز نہیں کہ برائی اور بد سلوکی کا معاملہ دکھانے والی روایتیں قبول کرلی جائیں اور یہ تو مانا ہی ہوا ہے کہ یزید نے اس قافلے کو بہت کچھ دے دلا کر نہایت احترام کے ساتھ ایسے لوگوں کی معیت میں مدینے روانہ کیا تھا جن کے احترام اور حفظ مرتبت کے رویّہ سے اہلِ قافلہ نہایت خوشنود اور شکر گزار ہوئے۔ اور پھر مدت العمر اس خاندان کے ساتھ غیر معمولی مراعات اور حسن سلوک کا رویّہ رہا جس کی تفصیلات میں جانے کی شاید ضرورت نہیں، اور پھر ایسا ہی رویّہ اس خانوادۂ نبوت کا بھی بنو اُمیّہ کے ساتھ رہا۔ مگر اسکو کیا کیجیے کہ ان سارے حقائق کے باوجود من گھڑت روایتوں کے پروپیگنڈے سے بنائی ہوئی جذباتی فضا میں لوگ ہمیں یہاں تک یقین ماننے پر لے آئے ہیں کہ کوفے سے جب شہداء کربلا کے سر اور بقیۃ السیف افراد کا قافلہ دمشق کے حدود میں داخل ہوا اور یزید کی منتظر نظریں اپنے محل کی بلندی سے اس پر پڑیں تو اس نے وجد میں آکر یہ "ڈوڈ کا فرانہ" شعر پڑھے۔

لمّا بدت تلك الحمول واشرفت　　تلك الرؤس علیٰ ربی جیرون

نعق الغراب فقلت نح اولا تنح　　فلقد قضیت من النبی دیونی

ترجمہ: جب جیرون کے ٹیلوں پر کجاوے اُبھرے اور وہ سر نظر آئے تو کوّے نے کائیں کائیں شروع کی۔ میں نے کہا کہ تو بول یا مت بول میں نے تو نبی سے اپنا قرض چکا لیا ہے۔

کاش ہم سمجھ سکتے کہ یہ باتیں غمِ حسینؓ اور حمایتِ حسینؓ کے پردے میں کس کافرانہ منصوبے کی تکمیل ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کا ارشاد

اس موقع پر امام ابن تیمیہؒ کی بات قابلِ ذکر نظر آتی ہے۔ اپنی مشہور کتاب "منہاج السُّنۃ" میں لکھتے ہیں جس کا ہم یہاں خلاصہ پیش کرتے ہیں:۔

"یزید کے سلسلے میں لوگوں کے تین گروہ ہیں، ایک کا اعتقاد ہے کہ یزید صحابی، بلکہ خلفائے راشدین میں سے یا بلکہ انبیائے کرامؑ کے قبیل سے تھا۔ اسکے برعکس ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ کافر اور بد باطن منافق تھا۔ اسکے دل میں بنو ہاشم اور اہلِ مدینہ سے اپنے اُن کافر عزیز و اقارب کا بدلہ لینے کا جذبہ تھا جو جنگ بدر وغیرہ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، چنانچہ یہ لوگ کچھ شعار اسکی دلیل میں اسکی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن یہ دونوں قول ایسے غلط اور بے بنیاد ہیں کہ ہر سمجھدار اس کا بخوبی اندازہ کرسکتا ہے۔ یزید حقیقت میں ایک مسلمان فرمانروا اور بادشاہانہ خلافت والے خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا۔ نہ وہ صحابی یا نبی تھا۔ اور نہ ہی کافر و منافق۔"

حضرت حسینؓ اور یزید کے قضیے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ایک مجہول السند روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر یزید کے سامنے لاکر رکھا گیا اور اُس نے آپ کے دندان کو اپنی چھڑی سے ٹہوکا دیا۔ یہ روایت نہ صرف یہ کہ از روئے سند ثابت نہیں بلکہ اسکے مضمون ہی میں اسکے جھوٹ ہونے کا ثبوت ہے، اس میں جن صحابہ کی موجودگی اُس وقت یزید کے پاس بتائی گئی ہے (کہ انھوں نے اسکی اس حرکت پر ٹوکا تھا) وہ شام میں

نہیں عراق میں رہتے تھے۔ اور اس روایت کے برعکس متعدد لوگوں کی روایت ہے کہ یزید نے نہ قتلِ حسین کا حکم دیا نہ اُس کا یہ مقصود تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے والد حضرت معاویہ کی وصیت کے مطابق آپ کا اعزاز و اکرام ہی پسند کرتا تھا البتہ اسکی خواہش یہ تھی کہ آپ اسکی حکومت کے خلاف اقدام کے ارادے سے باز آئیں۔ اور چونکہ آخر میں یہی ہوا کہ کوفے کے قریب پہنچ کر آپ نے اپنا ارادہ ختم کر دیا اور یزید کے پاس جاتے یا واپس ہو جانے یا کسی سرحد پر نکل جانے کی پیش کش کی۔ اس لئے جب یزید اور اسکے گھر والوں کو آپ کی شہادت کی خبر پہنچی تو اُن کے لئے یہ نہایت تکلیف دہ ہوئی۔ یزید نے اس وقت یہاں تک کہا کہ خدا کی لعنت ہو ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر اسکی اگر حسینؓ سے رشتہ داری ہوتی تو وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتا۔ پھر اس نے آپ کے اہلِ خاندان کے لئے نہایت اچھا واپسی کا سامان کیا اور اُن کو مدینے پہنچوایا اور اس سے پہلے یہ پیش کش بھی کی تھی کہ وہ چاہیں تو دمشق ہی میں اُسکے پاس رہیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس نے حسین کے قاتلوں سے بدلہ نہیں لیا۔

اور یہ جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں کہ حضرت حسین کے گھرانے کی خواتین کو قیدی اور باندی بنا کر شہر شہر گھمایا تو اللہ کا شکر ہے مسلمانوں نے کبھی کسی ہاشمی خاتون کو باندی نہیں بنایا۔ عام اُمّت مسلمہ تو کیا خود بنی اُمیّہ میں ہاشمی خواتین کی تعظیم کا یہ حال تھا کہ حجاج بن یوسف نے (جو قریشی نہیں ثقفی تھا) عبداللہ بن جعفر کی بیٹی سے شادی کر لی تھی تو خاندان بنو اُمیّہ اسقدر برہم ہوا کہ دونوں کی علیحدگی کرائے بغیر نہ رہا۔[1]

---

[1] انتخاب و تلخیص از منہاج السنۃ: ص ۳۲۱ تا ۳۲۵۔

باب ۱۲ دوازدہم

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا

ایک نوشتۂ تقدیر تھا جو پورا ہوا

کربلا کا یہ حادثۂ فاجعہ اسے بجز تقدیرِ الٰہی کے اور کیا کہا جائے؟ ـــــ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اہلِ تعلق اور اہلِ محبت، جن میں وقت کے بزرگ ترین اکابر اہلِ علم و دین بھی ہیں، ایک زبان ہو کر سمجھائیں کہ عراق کا قصد نہ کیجئے۔ یہ غداروں اور دھوکہ بازوں کی سرزمین ہے، صبح و شام بدل جانے والوں کی سرزمین ہے۔ اور اُن آزمائے ہوئے نابکاروں کی سرزمین ہے جنھوں نے آپ کے والد ماجد کو رُلایا اور آپ کے بھائی کو کبھی نہ بھلایا جانے والا تجربہ کرایا۔ مگر یہ ساری فہمائشیں دھری رہ جائیں۔ نہ محمد بن حنفیہ جیسے جاں نثار بھائی کی مؤدبانہ اور حکیمانہ گذارش کام آئے۔ نہ حضرت عبداللہ بن عمر کی بزرگانہ اور محبانہ فہمائش۔ نہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث کا ہر ہر پہلو سے سمجھانا اور نہ حضرت عبداللہ بن مطیع کا فدویانہ واسطے دینا۔ نہ حضرت ابوسعید خدری، حضرت واثلہ بن واقد اللیثی، حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت عبداللہ بن جابر کا اپنے اپنے انداز سے فیصلہ بدلوانے کی کوشش کرنا، حتّٰی کہ وہ آخر میں حضرت عبداللہ بن جعفر کا بیچ میں آکر آخری زور لگا لینا بھی اسی طرح بے کار جائے۔ جیسے کمان سے نکلے تیر کو واپس لانے کی کوشش بے سود ہوا کرتی ہو!

اور پھر جب وقت آتا ہے کہ آپ (حضرت حسینؓ) سفر کے آخری مرحلے میں اُس مہم سے

دستکشی کا فیصلہ فرمالیتے ہیں جس مہم کیلئے سفر اختیار فرمایا گیا تھا تو قضائے الٰہی یہاں بھی آڑے آجاتی ہے۔ اور عبیداللہ بن زیاد، جس کو بظاہر بڑی خوشی کے ساتھ آپ کی تین باتوں میں سے یزید کے پاس جانے والی بات تو مان ہی لینی چاہئے تھی کہ اچھا ہے وہ جانیں اور یہ جانیں، میں آزمائش سے بچا، مگر بالکل خلاف قیاس وگمان۔ ابن زیاد نے آپ کی تینوں باتوں کو یکساں طور پر رد کردیا۔ اور پہلے کوفے آنے کی وہ شرط لگادی کہ حادثہ اور المیہ ٹلنے کی شکل بنتے بنتے بگڑ گئی ـــ آخر اسے تقدیر الٰہی کے سوا اور کیا کہا جائے؟

زُبالہ کی منزل پر جب آپ کو اپنے عمزاد اور سفیر مسلم بن عقیل کی کوفے میں گرفتاری اور انجام کی خبر ملی۔ اور وہ ساری بساط اُلٹی ہوئی نظر آئی جس کی بنیاد پر آپ نے سفر شروع کیا تھا۔ تو وہ پہلا وقت تھا کہ آپ کو (غالباً عورتوں اور بچوں کے خیال سے) سفر ترک کرکے واپس ہوجانے کا خیال ہوا۔ اور یہ ایک مناسب وقت تھا کیونکہ کوفہ یہاں سے بہت دور تھا۔ اور اُن مخلصین کی فہمائشوں، گزارشوں اور تمنّوں کے پس منظر میں جو اس سفر سے مانع ہورہے تھے۔ اور ان تجربات کے پس منظر میں جو حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کو اہلِ کوفہ سے پیش آئے تھے، اور سب سے بڑھ کر خود مسلم بن عقیلؒ کے خط کے پس منظر میں جو انھوں نے اپنی گرفتاری پر اہلِ کوفہ کی بزدلی اور غدّاری کے حوالے سے حضرت حسینؓ کو اس مقصد سے لکھا تھا کہ وہ سفر ترک کرکے پیچھے کو لوٹ جائیں (ان سب باتوں کے پس منظر میں) کسی کو بھی واپسی کے خیال سے اختلاف نہ ہونا چاہئے تھا۔ مگر جیسے کہ کوئی بات ہوکر رہنی ہو، اور کوئی نہیں خود برادرانِ مسلم بن عقیل اَڑ گئے کہ نہیں اب پیچھے نہیں لوٹا جاسکتا۔ ہم اپنے بھائی کا بدلہ لیں گے یا اپنی جان بھی دیدیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ اس صورتِ حال میں حضرت حسینؓ کیلئے ممکن نہ تھا کہ واپسی پر اصرار فرمائیں۔ آپ کو واپسی کا خیال ترک کرکے معاملہ اللہ پر چھوڑ دینا پڑا۔ اور گویا پھر تقدیر کا ہاتھ بیچ میں آگیا۔

اور پھر جب قادسیہ کے قریب پہنچ کر مرحلہ وہ آگیا کہ حالات کی خبروں کے بجائے حالات کی اپنی ٹھوس شکل وصورت ہی سامنے آجائے۔ اور اس مرحلے پر برادرانِ مسلم بھی غالباً

اپنے جذبات کے عالم سے نکل آئے۔ تب واپسی کے خیال پر عمل کرنا تو ممکن نہیں رہا تھا مگر آپ نے کوفے کی سمت سے بہرحال ہٹ جانے کیلئے ایک غیر معمولی فیصلہ فرما لیا۔ یہ فیصلہ تھا یزید کے پاس دمشق چلے جانے کا! بلاشبہ یہ ایک غیر معمولی فیصلہ تھا۔ یہ ایک انقلاب لا سکتا تھا۔ روایات میں صراحت ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے (وضع الید فی الید) کیلئے کیا تھا (اور صراحت نہ بھی ہو تب بھی جن حالات میں آپ یزید کے پاس جا رہے تھے، اُن حالات میں آپ کے وہاں جانے کے اور کوئی دوسرے معنی نہیں ہوتے)[1] جیسا کہ ابھی اوپر عرض کیا گیا۔ ابن زیاد کو بصد مسرت یہ بات قبول کر لی تھی کہ آپ یزید کے پاس تشریف لے جائیں حضرت حسینؓ اور از خود یزید کے پاس جانے کا ارادہ فرما رہے ہیں! اس سے زیادہ کسی کو کیا چاہیئے؟ زیادہ سے زیادہ اس کا اطمینان کر لیا جاتا کہ آپ واقعی وہیں جائیں گے اور کہیں نہیں چلے جائیں گے۔ اس کے لئے ابن زیاد اپنا ایک دستہ ساتھ میں کر سکتا تھا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق تو آپ نے عمر ابن سعد سے فرمایا ہی یہ تھا کہ :-

(فان ابیت هذا) فسیّرنی الی یزید۔[2]	(اگر دوسری بات منظور نہیں ہے) تو تم مجھے یزید کے پاس بھیجدو۔ (جانے دو نہیں بلکہ بھیجدو)۔

یزید کے پاس آپؓ کا اس درجہ لچک کے ساتھ جانا کہ اسکے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں، اس کا نتیجہ (وقت کے تمام دستیاب قرائن و شواہد کی بنا پر) سوائے اس کے کچھ نہیں ہونا تھا کہ یزید آپ کا اکرام کرے۔ اور ہر ممکن طریقہ سے اس بات کی کوشش کرے کہ آپ کی اسکے ساتھ کشیدگی جاتی رہے۔ وہ کیا شکل ہوتی یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت معاویہ کی وصیت کے مطابق انہی کے نقش قدم پر "صلح حسنؓ"

---

[1] بلکہ ان خاص عبارتوں سے قطع نظر بھی۔ اور جو لوگ اس جانے کے کوئی اور معنی کرتے ہیں وہ اتنی بھی بات کرتے ہیں کہ اس پر گفتگو بھی اچھی نہیں لگتی۔ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۷۰

جیسا کوئی باب یزید اور حضرت حسین کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا. مگر قیاس و گمان کے تمام تقاضوں کے برعکس ابن زیاد کو آپ کی پیش کش قبول نہ ہوئی. اور المیہ کربلا جو کاتبِ تقدیر کے ہاتھ سے رقم ہو چکا تھا. وہ وجود میں آ کر رہا.

نوشتۂ تقدیر کا راز؟

اس تقدیر کا راز اور اس کی حکمت کیا ہو سکتی ہے جو ایک الم انگیز واقعہ کیلئے راہ بنائی آرہی تھی؟ سوال کافی سخت ہے، مگر امام ابن تیمیہؒ کے یہاں اس کا ایک جواب ملتا ہے جو ہے تو قیاس اور گمان ہی کی بات مگر امام موصوف نے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے. فرماتے ہیں:-

"حسین رضی اللہ عنہ کا قتل بلاشبہ مظلومانہ قتل ہے. جو اُن کے حق میں شہادت، علوِّ منزلت اور رفعِ درجت ہے اور (راز اس کا یہ ہے کہ) اُنکے اور انکے بھائی کیلئے، اللہ کے یہاں سعادت اور نیک بختی کا وہ بلند مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کیلئے کسی نہ کسی طرح کی بلا اور مصیبت سے گزرنا لازم ہے. مگر ان دونوں کو اپنے دوسرے اہل بیت کی طرح اسکے مواقع اس لئے حاصل نہ ہو سکے تھے کہ ان کی زندگی اسلام اور عزت و عافیت کی گود ہی میں بسر ہوئی تھی پس ایک بھائی کی وفات زہر خورانی سے ہوئی. اور دوسرے کی قتل سے تاکہ اس مصیبت کے صلے میں وہ شہداء کا عیش اور سُعَدا کی منزلت پا سکیں[1]."

گویا حضرت حسینؓ کا کچھ سمجھ میں نہ آنے والا سفر ہو یا ابن زیاد کا اس سے بھی زیادہ ناقابلِ فہم رویّہ دونوں تقدیرِ الٰہی کے ایک منصوبے کا کرشمہ تھے جو پہلے سے طے ہو چکا تھا.

ابن تیمیہؒ اور حضرت حسینؓ کا اقدام

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابن تیمیہؒ حضرت حسین کیلئے اس علوِّ منزلت کے

---

[1] منہاج السنہ ج ۲ صـ۳۲۱

قائل ہونے کے باوجود، جو اُن کے مذکورہ بالا بیان میں نظر آتی ہے، آپ کے اُس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں جس کے نتیجے میں شہادت کا مرتبہ آپ نے پایا، فرماتے ہیں کہ :-

"یہ بات جان لینی چاہیئے کہ صحابۂ کرام کا طبقہ ہو یا تابعینِ عظام کا یا بعد کے زمانوں کے اہلِ بیت یا غیر اہلِ بیت کا، ان میں سے بڑے بڑے اہلِ علم و دین سے بعض وقت ایسی نوعیت کا اجتہاد سرزد ہو جاتا ہے جس میں کچھ ظن و وہم اور کبھی کوئی پوشیدہ قسم کی ہوائے نفس شامل ہو جاتی ہے، ایسا اجتہاد اُس شخصیت کی عنداللہ عظمت کے باوجود قابلِ اتباع نہیں ہوتا، لیکن جب کبھی ایسی بات پیش آجاتی ہے تو دو قسم کے انسانوں کیلئے فتنہ بن جاتی ہے، جو لوگ اُس انسان کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اس کے اس خاص فعل کو بھی صحیح اور لائق اتباع قرار دیا جائے۔ جو اُسے ناپسند کرنے والے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ایک اجتہادی غلطی کی بدولت اُسے ولایت و تقویٰ کے مرتبے ہی سے نہیں، اہلِ جنت اور اہلِ ایمان کے زمرے سے بھی خارج کر دیں۔"[1]

کیوں اس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں؟ منہاج السنہ کی اسی بحث میں جس بحث سے اوپر کے دو اقتباس لئے گئے ہیں، ہمیں اس سوال کا یہ جواب ملتا ہے :-

"حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانوں کی معاش و معاد (دنیوی و اُخروی زندگی) کی صلاح و فلاح کیلئے ہوئی تھی، آپ نے ہر اس بات کا حکم دیا جس میں صلاح (بھلائی) ہے، اور ہر اس بات سے منع فرمایا جس میں فساد (بگاڑ اور بُرائی) ہے۔ پس اب کوئی کام اگر سامنے آتا ہے جس میں صلاح اور فساد دونوں پہلو پائے جاتے ہیں تو اہلِ سنت یہ دیکھتے ہیں کہ فساد کا پہلو غالب ہے یا صلاح کا؟ اور پھر جو پہلو غالب نظر آتا ہے، اُسی کے مطابق اس کام پر حکم لگاتے ہیں،

---

[1] منہاج السنہ ج ۲ ص ۲۳۹

صلاح اور فلاح کا پہلو غالب ہے تو اس کام کے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں فساد اور خرابی کا پہلو غالب نظر آتا ہے تو اس کام کے ترک کو ترجیح دی جاتی ہے۔

پس اب ایک یزید یا عبد الملک اور منصور جیسا کوئی شخص خلافت کے منصب پر قائز ہو جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سے قتال کر کے کسی بہتر شخص کو اُسکی جگہ لانے کی کوشش کی جائے؟ اہلِ سنّت اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں کیونکہ ایسے فعل سے بہ نسبت بھلائی اور مصلحت کے بگاڑ اور فساد کے زیادہ امکانات ہیں، پوری تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ کسی صاحبِ سلطنت وقوت شخص کے خلاف جب بھی خروج کیا گیا بالعموم اُس کا خیر بہت معمولی اور شر بہت زبردست ہوا، مثلاً مدینے والوں نے یزید کے خلاف جو خروج کیا یا ابن الاشعث نے عبد الملک کے خلاف عراق میں کیا، یا ابن المہلّب نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی، یا ابو مسلم نے خراسان میں انہی بنو امیّہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، یا خلیفہ منصور کے خلاف مدینے اور بصرے سے بغاوت اُٹھی، اُن میں ہر جگہ ہزیمت اور بربادی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور ابو مسلم خراسانی جیتا بھی تو کیا جیت اُسکی ہوئی؟ منصور کے ہاتھوں وہ خود بھی مارا گیا۔ اور جیت میں کسقدر آدمی اُس نے مروا دیئے! اللہ کی پناہ! الغرض ۔

فلا اقاموا دیناً ولا ابقوا دنیا   نہ دین ہی قائم کر سکے نہ دنیا ہی بچ سکے۔

خداوند اللہ تعالیٰ کسی ایسے کام کا حکم نہیں فرماتا کہ جس میں نہ دین کی صلاح ہو نہ دنیا کی صلاح (اور ایسے کام اللہ کو پسند نہیں ہیں) چاہے اُنکے کرنے والے کیسے ہی متقی بندے اور اصحابِ جنت کیوں نہ ہوں، ذرا بتایئے کیا یہ لوگ (جنکے نام نشاناً اوپر لیے گئے) علی، طلحہ، زبیر اور عائشہ سے بڑھ کر ہیں، جن کا تقویٰ مسلّم ہونے اور جنت کی بشارت جنھیں حاصل ہونے کے باوجود اُنکے قتالِ باہمی والے فعل کو قابلِ تعریف نہیں قرار دیا گیا؟

اکابر اہلِ علم اور خروج بر ائمہ

مسلمانوں کے اکابر اہلِ علم نے ہمیشہ ہی اِن خروجوں کی مخالفت کی ہے مثلاً یزید کے خلاف اہلِ مدینہ خروج پر آمادہ ہوئے تو عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن مسیّب اور علی بن الحسین (زین العابدین) نے انکو ایسا کرنے سے منع کیا، یا ابن الاشعث کی بغاوت کا فتنہ اُٹھا تو حسن بصری اور مجاہد وغیرہ نے سمجھایا، لہٰذا اہلِ سنّت کے یہاں یہ مسئلہ بالکل طے شدہ ہوچکا ہے کہ فتنے کے وقت میں تلوار اٹھانا مناسب نہیں۔ علمائے اہلِ سنّت نے اس مسئلے کی اس درجہ اہمیت سمجھی ہے کہ اسے عقائد کی فہرست میں داخل کرکے لازم کیا ہے کہ ائمہ و خلفاء کے جور و ستم کا مقابلہ تلوار کے بجائے صبر اور برداشت سے کیا جائے حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ کیسے کیسے اور کتنے اہلِ علم اور اہلِ دین بھی فتنوں کی لڑائیوں میں شریک ہوچکے ہیں، ان کا یہ فیصلہ اس لئے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں سے اس معاملے میں یہی حکم ثابت ہوتا ہے۔ اور جو کوئی بھی اس سلسلے کی احادیث نبویہ پر غور کرے گا وہ خود بھی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ احادیث کا حکم بہترین حکم ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب حسین رضی اللہ عنہ نے عراق جانے کا ارادہ فرمایا تو اکابر اہلِ علم و دین مثلاً ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام نے اس ارادے کے خلاف مشورہ دیا، انھیں صاف نظر آرہا تھا کہ اس کا انجام آپ کی جان کو گزند پہنچنے کے سوا مشکل ہی سے کچھ اور ہوگا۔ چنانچہ جب آپ اپنا ارادہ بدلنے کو تیار نہ ہوئے تو بعض نے کہہ بھی دیا کہ "اچھا جائیے آپ کو اللہ کے سپرد کیا"[1] اور بعض نے کہا کہ "بات بدنما ہو جائے گی ورنہ جی چاہتا تھا کہ آپ کو زبردستی سے روکیں"۔

ان حضرات کا یہ کہنا سوائے اسکے اور کسی وجہ سے نہیں تھا کہ حسین رضی اللہ عنہ کی اپنی اور سارے مسلمین کی مصلحت اسی میں تھی، اور اللہ و رسول کے یہاں مصالح کی

---

[1] "استودعك الله من قتيل"

رعایت اور مفاسد سے بچنے ہی کا حکم ہے چنانچہ بالکل وہی ہوا جس کا ان حضرات کو اندیشہ تھا کہ دین یا دنیا کی کوئی بھلائی تو اس اقدام سے کسی کو حاصل نہ ہوئی البتہ کوفے کے بدنہاد ظالموں کو سبط رسول اللہ پر قابو مل گیا اور ان کو شہید کر ڈالا. کاش وہ اپنے شہر ہی میں رہتے تو وہ فساد نہ لازم آتا جو اُنکے خروج اور قتل سے رونما ہوا۔

فان ما قصده من تحصیل الخیر	انھوں نے اپنے خروج سے جس تحصیلِ خیر
ودفع الشر لم یحصل منہ	اور دفعِ شر کا ارادہ کیا تھا وہ تو
شیئ بل زاد الشر بخروجہ	کچھ حاصل نہ ہوا. اس کے بجائے اس
وقتلہ ونقص الخیر بذالك	خروج اور پھر قتل سے شر بڑھا اور
وصار سببًا لشرٍ عظیم وکان	خیر کم ہوا۔ اور یہ قصّہ ایک شرِ عظیم
قتل الحسین مما اوجب الفتن	کا سبب بن گیا یعنی قتل حسین اُسی طرح
کما کان قتل عثمان مما اوجب	فتنوں کا موجب بن گیا جیسے قتلِ
الفتن۔	عثمان سے فتنے اُٹھے تھے۔

مزید فرماتے ہیں:۔

"یہی وہ وجہ تھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حسنؓ کے لئے بطور تعریف فرمایا تھا کہ" میرا یہ بیٹا سردار ہے زمانہ آئے گا کہ اسکے ذریعہ اللہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا" لیکن کسی کی بھی تعریف آپؐ نے اس کیلئے نہیں فرمائی کہ وہ حالت فتنہ میں تلوار اُٹھائے گا یا کسی امام جائر پر خروج اور اس کی سرتابی میں ہی تنے سے انکار کردے گا. ہاں خوارج کے سلسلے میں ضرور آپ نے صاف ارشاد فرمایا تھا کہ ایسی جماعت مسلمانوں میں رونما ہو تو اُس سے ضرور قتال کیا جائے. چنانچہ جب علی رضی اللہ عنہ نے قتال فرمایا تو وہی صحابہ جو جمل، و صفین کے قتال میں آپ کے ہمنوا نہیں تھے اس قتال میں سب کے سب متفق ہوئے، اور

اسی طرح بعد کے اہل علم نے بھی اِن دونوں قتالوں میں فرق کیا۔[1]

ظلم کی ذمّہ داری کس پر؟

امام ابن تیمیہؒ کی یہ بحث کہ حضرت حسین کا یہ اقدام جس کے نتیجے میں آپ کی مظلومانہ شہادت پیش آئی، شرعی نقطۂ نظر سے کیا حیثیت رکھتا تھا؟ اور کیوں رکھتا تھا؟ یہاں ایک ضمناً ذکر میں آجانے والی بحث تھی، ورنہ ہمارے موضوع کو ایسی شرعی بحث سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ مظلومانہ شہادت کی بات آنے اور اُسے مان لئے جانے کے بعد جو مسئلہ طبعی طور پر ہمارے سامنے آنا چاہیئے، وہ یہ ہے کہ اس ظلم کی ذمّہ داری کس پر آتی ہے؟ یزید پر یا ابن زیاد پر؟

تاریخی شہادتوں کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے ہے وہ کسی بھی طرح اسکی اجازت نہیں دیتا کہ اس خونِ ناحق کی ذمّہ داری یزید پر ڈالی جائے۔ یزید نے بے شک ابن زیاد کے سپرد یہ بھی کیا تھا کہ وہ حضرت حسینؓ سے نپٹے، اور کوفے میں اُن کو آزادانہ داخل نہ ہونے دے اسکے بعد اگر یہ بات پیش نہ آگئی ہوتی کہ حضرت حسین نے اس مہم سے قطعی دستبرداری ظاہر کرکے جس کیلئے وہ مکّے سے نکلے تھے، یزید کے پاس جانے اور اپنا فیصلہ اسکے ہاتھ میں رکھ دینے کی پیش کش کردی، تب بے شک ابن زیاد کے حکم سے کی جانے والی جنگی کارروائی کی اصل ذمہ داری یزید ہی پر آتی۔ مگر اس کامل طور پر تبدیل شدہ صورت حال میں ابن زیاد نے یزید سے رجوع کئے بغیر اور کارروائی کے افسر اعلیٰ عمر بن سعد کے مشورے کے بھی برخلاف جو قتل وقتال کی کارروائی کرائی اس کی ذمہ داری یزید پر ڈالنا تو ایک زیادتی کی بات ہوگی، ہاں اگر وہ اس کارروائی سے اپنی رضامندی اور خوشنودی کا اظہار کرتا تو پھر ضرور حق تھا کہ اسی کو اصل ذمہ دار قرار دیا جائے۔ مگر اس بارے میں ہم گذشتہ باب میں مختلف روایتوں کا جائزہ لے کر دیکھ چکے ہیں کہ ذمہ داری کے ساتھ ایسی بات یزید کی طرف منسوب کرنے کی

---

[1] منہاج السنۃ ج ۲ صفحہ ۳۱۲ تا ۳۱۴ سے تلخیص و تقریب۔

کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ متعدد قرائن و شواہد کی روشنی میں پلڑا اُن روایتوں کا بھاری نظر آتا ہے جو اس واقعہ پر یزید کی نارضامندی اور ناخوشی ظاہر کرتی ہیں، اور اسی بنا پر اس باب (ص ۱۲) کے پچھلے صفحات میں ابھی ہم لکھ کر آئے ہیں کہ:-

"یزید کے پاس آپ کا اس درجہ لچک کے ساتھ جانا کہ اپنا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دیدیں، اس کا نتیجہ، وقت کے تمام دستیاب شواہد و قرائن کی روشنی میں سوائے اسکے کچھ نہیں ہوتا تھا کہ یزید آپ کا اکرام کرتا .... اور حضرت معاویہ کی وصیت کے مطابق اُنہی کے نقشِ قدم پر "صُلحِ حسن" جیسا کوئی باب یزید اور حضرت حسینؓ کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا"

پس ہمارے خیال کے مطابق اس کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اگر حضرت حسینؓ کی پیش کش کے بارے میں یزید سے رجوع کیا جاتا تو وہ ابن زیاد کو اس رویّے اور اس کارروائی کی اجازت دیتا جو کربلا میں اُسکے (ابن زیاد کے) حکم سے ہوئی۔

ابن زیاد کو سزا کیوں نہیں دی؟

یہ سوال جب کسی عام آدمی کی طرف سے سامنے آئے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہوتی۔ مگر جب پڑھے لکھے لوگ بھی یہ سوال اُٹھاتے ہیں تو پھر حیرت ہوئے بغیر نہیں رہتی، اس لئے کہ نارضامندی اور سزا دہی کا کوئی ایسا لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک حاکم نے اپنے ماتحت کی کسی بات کو ناپسند کیا ہو تو وہ اُسے سزا بھی ضرور دیدے، بہت سی دفعہ ناخوشی کا اظہار بھی، اُس آدمی پر کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور اِس کی کیسی قابل لحاظ مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ حضرت علیؓ کی فوج میں، بلکہ اُن کے نہایت خاص معتمدین میں وہ لوگ شامل تھے جو قاتلانِ عثمانؓ کے سرگروہ شمار کئے جاتے تھے، اور خود حضرت علیؓ کو اس الزام سے انکار نہ تھا۔ مگر اس مطالبے کے جواب میں کہ ان کو سزا دی جائے یا ورثۂ عثمانؓ

کے سپرد کیا جائے۔ حضرت علیؓ کو ہمیشہ یہی کہنا پڑا کہ حالات اجازت نہیں دیتے یعنی سزا کا مطالبہ کرنے والے بھی موجود تھے، اصولاً حضرت علیؓ کو مطالبے سے اتفاق بھی تھا پھر بھی مصالح وقت کا مسئلہ ایسا تھا کہ آپ اس پر عمل درآمد نہیں کر سکتے تھے۔ تو اب اگر ہم یزید کے لئے کوئی جداگانہ اصول نہیں بناتے ہیں تب بڑی آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں کہ:۔

جس ابن زیاد نے یزید کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے عراق کو نہ صرف روک لیا تھا بلکہ جو طوفان وہاں یزید کے خلاف تیار ہو رہا تھا، اُس کا رُخ اُس نے تمام تر حضرت حسینؓ کے خلاف موڑ کے دکھا دیا، یزید کے لئے کیسے ممکن تھا کہ اس کا سر قلم کرنے کی بات سوچے؟

اور وہ بھی ایسی حالت میں! کہ کوئی مطالبہ کسی طرف سے ایسا نہیں ہے؟

اور

مزید ایسی حالت میں کہ اسکے ذہن پر اس قسم کا کوئی تقاضہ بھی بظاہر نہیں ہو سکتا تھا؟

اُسے واقعہ سے رنج ہوا ہو: افسوس ہوا ہو ایک الگ بات ہے لیکن یزید اور حضرت حسینؓ کے تعلقات کی جو تاریخ تھی (جو یزید کے والد کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ اور جس کو ہم پچھلے ابواب میں دیکھ آئے ہیں) اسکے ہوتے ہوئے ایک خاندانی آدمی ہونے کے ناتے یہ توقع تو یزید سے کی جا سکتی تھی، اور کی جانی چاہیئے تھی کہ اُسے واقعہ پر رنج و ملال ہو مگر اس سے آگے بڑھ کر یہ توقع تعلقات کے اُس پس منظر میں کرنا کہ وہ ابن زیاد کی اس کاروائی کو ایک قابلِ سزا جرم سمجھے یہ تو ایک بہت ہی غیر فطری قسم کی توقع ہے حضرتِ حسینؓ کی اُس تمام عظمت کے باوجود جس کی بنا پر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ یزید اگر کربلا کے واقعہ سے خوش نہیں ہوا تھا تو ابن زیاد کو اس کی حرکت سے کوئی سزا یا ملامت ہونی چاہیئے تھی، ہم اس فطری حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے کہ جب سیاسی کشمکش کا پیچ آ جاتا ہے تو پھر فریقین کے ذہن سے ایک دوسرے کی قابلِ لحاظ عظمتوں کا نقش مٹتا چلا جاتا ہے۔

حضرت علی اور حضرت معاویہ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ کشمکش شروع ہوئی تو حضرت معاویہ کو پورا احساس تھا کہ اُن کی اور حضرت علی کی کوئی برابری نہیں ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے خطوط میں انھیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تو انھوں نے بے تأمل اعتراف کیا کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔

امّا شرفك فی الاسلام و قرابتك من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلست ادفعہ...	اسلام میں آپ کی بزرگی اور جنابِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کی قرابت کا مجھے ذرا انکار نہیں ہے......

مگر جب اس کشمکش پر لمبا عرصہ گزر گیا اور تلخی بڑھتی چلی گئی تو پھر حضرت معاویہؓ کے رویّے میں اعتراف اور احساس کی جھلک ہمیں نظر آنی بند ہونے لگی۔ اور یہ بالکل فطری بات ہے۔ ہم اپنی خواہش کے ماتحت کسی جگہ پر ایک اصولِ فطرت کو ماننے سے انکار کریں تو یہ ہماری مرضی ہے۔ اصول اپنی جگہ اصول رہے گا ــــ بہرحال ابن زیاد کو کوئی سزا نہ دینا یا ملامت نہ کرنا، اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ یزید کو کوئی افسوس اور رنج بھی حضرت حسینؓ کی شہادت پر نہیں ہوا۔ یا وہ خوش ہوا ہو اور اس کی اپنی مرضی بھی فی الواقع وہی رہی ہو جو ابن زیاد کے ہاتھوں ہو گیا۔

ابن زیاد کیوں بضد ہوا؟

باب کے ابتدائی صفحات میں جو ہم نے لکھا کہ (بظاہر) ابن زیاد کو نہایت خوشی سے اس بات پر راضی ہونا چاہیئے تھا کہ حضرت حسینؓ اگر یزید کے پاس جانا چاہتے ہیں تو ضرور چلے جائیں۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہوا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ سے بجز تقدیر الٰہی کے اور کیا کہا جائے جس میں گویا حضرت حسینؓ کا مرتبۂ شہادت پانا مقدر

ہو چکا تھا) ہمارے اس لکھنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ابن زیاد کے ذہن میں بھی اپنے اس رویّے کی کوئی وجہ نہ رہی ہو گی اور بس یونہی تقدیری جبر سے وہ یہ کام کر بیٹھا ہو گا۔ بے شک اُس کے ذہن میں کوئی بات اور اپنے اس رویّے کا جواز ہونا چاہئے۔ اور ہمیں اُس کی تلاش ہے۔ اس تلاش میں کامیابی کی منزل ہمیں اب تک ہاتھ نہیں آسکی ہے۔ لیکن اس تلاش اور غور و فکر کے دوران بعض باتوں کی طرف نظر جاتی ہے، جن کا یقیناً بہت کچھ دخل ابن زیاد کے اِس رویّے میں ہونا چاہئے۔

۱۔ اس نے اپنے باپ سے وراثت میں ایک سخت گیر منتظم (ADMINISTRATOR) کا مزاج پایا تھا۔ نظم و نسق اور امن و امان کا قیام اور اُس کا تحفّظ اپنے باپ کی طرح ابن زیاد کی نظر میں بھی ایک حاکم کا سب سے بڑا فریضہ اور سب سے بڑی نیکی تھی۔ اس کے باپ زیاد کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کا حاکم مقرر کیا تو بصرے کے امن و امان کا حال اُس وقت بے حد خراب تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر ایک زبردست تقریر میں اپنی پالیسی کا بیان کیا۔ اس بیان کے ماتحت رات کو عشا کے بعد سے صبح فجر تک باہر نکلنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اور اس کے خلاف ورزی کی سزا قتل، ایک اعرابی (یعنی بصرہ شہر سے باہر کا آدمی) جو اس قصے سے بے خبر تھا کسی کام سے بصرے آیا تھا۔ رات میں چلتا پھرتا پایا گیا۔ زیاد کے پاس لایا گیا، اس نے اپنی صفائی دی۔ ابن زیاد نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ تیرا بیان سچّا ہے تو بے خبر تھا۔ مگر نظم و نسق کا تقاضہ یہ ہے کہ میں تجھے بھی نہ چھوڑوں۔ چنانچہ قتل کر دیا گیا[1]۔ اس مزاج اور طبیعت کا ابن زیاد وارث تھا۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۲۶ اس واقعہ کو بیان کر کے طبری لکھتے ہیں۔

"زیاد پہلا حاکم تھا جس نے حکومت کی آواز کو وزن دیا۔ معاویہ کے اقتدار کو مضبوطی بخشی، لوگوں کو اطاعت سکھائی۔ بے دھڑک سزائیں دیں۔ اور تلوار نیام سے باہر نکالی۔ گمان پر پکڑا اور شبہے میں سزا دی۔ چنانچہ اس کی حکومت میں (باقی اگلے صفحے پر)

۲۔ کوفے اور بصرے کے لوگ ہمیشہ اسقدر ناہنجار رہے تھے کہ ہر حکومت اور ہر حکمراں اُن سے عاجز رہا. انتظام اور امن وامان کو اہمیت بلکہ ہر چیز پر فوقیت دینے والا آدمی ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں اور بھی زیادہ سخت گیر بلکہ سخت گیری کا ایک "عادی مجرم" بن جائے گا. کوئی سخت گیری اس کے لئے سخت گیری نہ رہ پائے گی. مسلم بن عقیل اور ان کے میزبان ہانی بن عُروہ کے ساتھ جو سلوک اس نے کیا وہ یقیناً اسی قبیل کی چیز تھی۔ امن وامان اور قومی یکجہتی سے بڑھ کر کوئی چیز اس کے یہاں مقدّس نہیں تھی. اس کو خطرے میں ڈالنے والے افعال اور اشخاص سے بڑھ کر کوئی فعل اور کوئی شخص اس کی نظر میں مبغوض نہ تھا.

۳۔ حضرت حسینؓ اور یزید کے تعلقات کی ناخوشگوار تاریخ کے باوجود یزید کی طرف سے جس پاس ولحاظ کی توقع ہم مختلف وجوہ سے کرتے آرہے ہیں۔ (مثلاً یہ کہ وہ ایک صحابی کا اور بڑے خاندانی صحابی کا بیٹا تھا. نیز حضرت حسینؓ سے اُس کی خاندانی قرابت بھی تھی۔ اور پھر اس کے والد کی بڑی تاکیدی وصیّت بھی حضرت حسینؓ کے ساتھ آخری حد تک حسنِ سلوک اور حق شناسی کی تھی) ان میں سے کوئی چیز ابن زیاد کے ساتھ نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ ایک ساقط النسب آدمی کا بیٹا تھا. حضرت معاویہؓ نے اس سلسلے میں اُس پر اور اُس کے باپ پر

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ)

لوگ اس درجہ اس سے خائف ہوئے کہ ایک دوسرے کی شرارتوں سے محفوظ ہو گئے. کسی کی کوئی چیز گر جاتی تو مجال نہیں تھی کہ کوئی دوسرا اس کو ہاتھ لگالے. حتیٰ کہ اصل مالک آتا اور اپنی چیز اُٹھاتا. عورتیں اپنے گھروں میں بے کھٹک دروازہ کھول کر سو سکتی تھیں. الغرض وہ بیاست اس نے کی کہ اس کی مثال نہیں دیکھی گئی ......"

جو احسان کیا تھا۔ اُس کا یہ اثر عین قرین قیاس ہے کہ آدمی کو "بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کا وفادار" بنا دے۔ اور اس لئے گمان غالب ہے کہ حضرت معاویہ اور یزید کے ماتحت ان باپ بیٹوں کی انتظامی سختی میں ان کے اپنے سخت گیر انتظامی مزاج کے علاوہ کچھ اس احسانمندی کا بھی دخل ہو، اور خاص طور سے وہ اشخاص ان کے لئے کسی بھی پاس ولحاظ سے مستحق نہ رہ جاتے ہوں جو اس خاندان کے اقتدار کو چیلنج کرتے ہوں۔

ان باتوں سے یہ عُقدہ تو حل نہیں ہوتا کہ جب حضرت حسینؓ کی سہ گانہ پیش کش گویا پکار کر کہہ رہی تھی کہ اب اُن سے کوئی خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے تو پھر کون سی انتظامی مصلحت کا یا بادشاہ کی "بادشاہ سے بھی زیادہ" کون سی وفاداری کا تقاضہ تھا کہ اس پیش کش کو قبول کرنے کی نرمی دکھانے کے بجائے وہی سختی دکھائی جائے جو عام عادت بن گئی تھی۔ مگر ان باتوں کی طرف توجہ ہمیں حل کے قریب ضرور پہنچا دیتی ہے۔

آہ یہ بے توفیقی!

بہر حال یہ بڑا ہی المناک حادثہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لئے وہ جرأت آسان فرما دی جو بہت ہی شاذ و نادر اہل جرأت کو نصیب ہوتی ہے کہ حالات کو یکسر بدلا ہوا دیکھ کر اُن کی مطابقت میں وہ فیصلہ فرمائیں جس میں ملّت کی صلاح و فلاح ہے نہ یہ کہ ان بدلے ہوئے حالات میں اپنی آن کا مسئلہ مقدم رکھیں، تب ابن زیاد کو یہ توفیق نہ ہو سکی کہ وہ ملّت کی صلاح و فلاح کے لئے حضرت حسینؓ کی اس عظیم جذباتی قربانی کی قدر جان لیتا اور اپنی بے جا ضد سے اس واقعہ کا ذمہ دار نہ بنتا جس نے عالمِ اسلام

پر ایک بار پھر خونیں فتنوں ہی کے دروازے نہیں کھول دیئے بلکہ اعتقادی فتنوں کی رگوں میں ایک نیا خون دوڑا دیا۔

اللھم احفظنا من شرور انفسنا ومن سیّئات اعمالنا۔

وَصَلِّ اللّٰھم وسلّم علی عبدك ونبیّك سیّدنا محمّدٍ وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ اجمعین۔

* * *
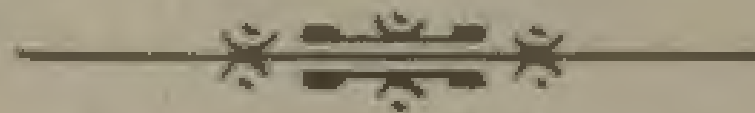
واقعۂ کربلا
اور اُس کا پس منظر
واقعۂ کربلا اور اُس کے پس منظر کا بیان ایک طویل عرصے سے دو متضاد نقطہائے نظر
کی انتہا پسندانہ کشاکش کا شکار ہے۔ یہ کتاب دونوں انتہا پسندیوں کے درمیان ایک
نقطۂ اعتدال کو سامنے لاتی ہے۔
سبطِ رسول سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی نسبتِ عالیہ کا احترام، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ
کے شرفِ صحابیت کا احترام اور تاریخ کی اپنی منطق اور اُس کی وزنی شہادتوں کا احترام، مصنف کے
نزدیک کربلا کے المناک واقعے اور اس کے پس منظر پر بحث میں احترام کا یہ شطرفہ
تقاضا ہر قدم پر ملحوظ رہنا چاہیے اور اس نے اپنے امکان بھر کوئی دقیقہ اس میں اٹھا نہیں رکھا ہے۔
تاریخ کے متضاد اور نہایت پُر پیچ اور قطعی موضوع اور من گھڑت بیانات کے طومار میں سے واقعی
حقیقت دریافت کرنے کی کوشش میں مصنف نے جو مشقت اٹھائی اور جو توازن برتا ہے ہمیں
یقین ہے کہ اس کو مطالعۂ تاریخ میں ایک وقیع تجربہ قرار دیا جائے گا۔
سائز: ۲۳×۳۶/۱۶
صفحات: ۲۶۳
شاندار ترتیب
اعلیٰ عکسی طباعت
حسین گرد پوش
قیمت ۲۰ روپے
ناشر
الفرقان بکڈپو ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد لکھنؤ